قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)

(4)

ضیا تسنیم بلگرامی

قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)

(4)

ضیا تسنیم بلگرامی

Complied by

Abdul Basit

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

امیر خسرو

تسلیم و رضا کا پیکر

شیخ احمد النامقی

شیخ حسام الدین

شیخ ناگوری

علی بن محمد

فخر دین و دنیا

خندقوں والے

دلی کا قطب

روشن ضمیر

شیخ الہند

خواجہ باقی باللہ

عارف حق

بدر الدین اسحاق

مولانا رومی

داتا کا دربار



امیر خسروؒ

ضیاء تسنیم بلگرامی

کچھ خوبیاں اللہ تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر ودیعت کرتا ہے اور کچھ انسانوں کے حصے میں ایسے اعلیٰ مرتبت مقام آتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا... خسرو کا تعلق بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کے قدم اٹھانے سے پہلے ہی رستے منتظر ہوتے ہیں۔ آپ بیک وقت کئی خوبیوں کے حامل تھے۔

لافانی شاعری کے خالق امیر خسرو کی زندگی کا قصہ

ان دنوں چنگیز خاں کا سیلاب بلاخیز ملکوں اور قوموں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ منگول افواج کوہستان الطائی اور تھیان شان کو روندتی ہوئی ماوراء النہر میں داخل ہو گئیں۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل گئیں اور شہر کھنڈرات بن گئے۔ بقیۃ السیف نے راہِ فرار اختیار کی، جس کا جدھر منہ اٹھا، چل دیا۔ ماوراء النہر کے ایک ترک خاندان نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس ترک خاندان کا جدِ اعلیٰ لاچین نامی ترک تھا۔ یہ خاندان ماوراء النہر کے شہر کش میں آباد تھا۔ یہ لوگ کش سے بلخ اور

پھر ہندوستان میں داخل ہو گئے۔ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایٹہ نامی ضلع کے قصبے مومن پورہ میں ان لوگوں نے قیام کیا۔ پہلے یہ قصبہ ضلع بدایوں میں شامل تھا، جب یہ مومن پورہ سے پٹیالی بنا تو جغرافیائی تقسیم اور ردوبدل میں اس کو ضلع ایٹہ میں شامل کردیا گیا۔

یہ خاندان جو پٹیالی میں آباد ہوا تھا، قبیلہ ہزارہ لاچین کے ایک امیر سیف الدین محمود کی سرپرستی میں ہندوستان آیا تھا۔ ان دنوں برصغیر پر سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی۔ سلطان نے اس آوارہ گرد امیر کو اپنی فوج میں شامل کرلیا۔ امیر کے ساتھ دوسرے ترکوں نے بھی سلطان کی فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ بعد میں سلطان، امیر سیف الدین سے اتنا خوش ہوا کہ پٹیالی میں جاگیر عطا کردی۔

سلطانی ملازمت کے دوران امیر سیف الدین کے تعلقات جن لوگوں سے استوار ہوئے ان میں عماد الملک کا نام سرفہرست ہے۔ عماد الملک ایک متمول ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا اور مسلمان ہو گئے۔ غیاث الدین بلبن نے انہیں اپنا وزیر بنالیا تھا اور سلطان التمش کے زمانے میں یہ ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ عماد الملک نے امیر سیف الدین میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ کسی اور میں نہیں نظر آتا تھا۔ انہوں نے اس نوجوان کو دیکھا، پرکھا اور پسند کرلیا اور خاموشی سے اپنی بیٹی کا نکاح امیر سیف الدین سے کردیا۔

شادی کے بعد امیر سیف الدین کے گھر میں یکے بعد دیگرے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلے کا نام عزالدین علی شاہ، منجھلے کا نام ابوالحسن اور چھوٹے کا نام حسام الدین قتلغ رکھا گیا۔ بڑے اور چھوٹے بیٹے مستقبل میں بہادر سپاہی ثابت ہوئے لیکن منجھلا بیٹا ابوالحسن دونوں سے مختلف نکلا۔

ابوالحسن کا سن پیدائش 651ہجری (1252ء) ہے۔ اس بچے کی پیدائش پر جانے کیا بات تھی کہ امیر سیف الدین کو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ انہوں نے بچے کو ایک خرقے میں لپیٹ کر باہر کا رخ کیا۔ بیوی نے ان کا راستہ روکا، پوچھا۔ ”آپ میرے بچے کو کہاں لیے جارہے ہیں؟“

امیر سیف الدین نے جواب دیا۔ ”پٹیالی کے مجذوب کے پاس۔“

بیوی نے پوچھا۔ ”کیوں؟ یہ مجذوب کیا کریں گے میرے بچے کا؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”نیک بخت! تو بات سمجھنے کی کوشش کیا کر۔ میں نے اس بچے کی پیشانی میں معلوم نہیں کیا دیکھا ہے کہ اب میں اس کی تصدیق ان مجذوب سے کرانے کے لیے جارہا ہوں۔“

بیوی پر کمزوری نے غلبہ پایا اور وہ خاموش ہو کر پڑ رہیں۔

امیر سیف الدین بچے کو خرقے میں چھپا کر مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے انہیں دور سے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ ”ابوالحسن! زندہ باد۔ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے چلے گا۔“

امیر سیف الدین نے اپنا بچہ مجذوب کی گود میں ڈال دیا اور فرمایا۔ ”حضرت! اس کے حق میں دعا فرمائیں۔ میں اسی لیے اس نالائق کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔“

مجذوب نے ایک بار پھر اپنی پہلی بات دہرائی۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے رہے گا۔ اب اس کے بعد بھی اگر تو کچھ جاننا چاہتا ہے تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔“

باپ کو پھر بھی قرار نہ آیا۔ خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ”غیب کا علم صرف خدا کو ہے، پھر بھی میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کے حق میں دعائے خیر فرمادیں۔“

مجذوب نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے اور کہا۔ ”یا اللہ العالمین! اس کا نام قیامت تک زندہ رکھ (آمین)۔“

یہ سیدھی سادی دعا امیر کی سمجھ میں نہیں آئی مگر اس کے بعد امیر وہاں نہیں ٹھہرے اور مجذوب سے اجازت لے کر اپنے گھر چلے گئے۔

ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی نے طنزاً پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کچھ اپنے بچے کے مستقبل کا پتا چلا یا نہیں؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”پتا چلا کیوں نہیں، مجذوب نے کہا ہے یہ بچہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے چلے گا۔“

بیوی کو اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی، نہایت افسردگی سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرا بچہ مستقبل میں شاعری کرے گا۔“ پھر سرد آہ بھر کر کہا۔ ”گویا ابوالحسن سپاہی نہیں بنے گا۔“

امیر نے تسلی دی۔ ''خاتون! اگر میرا بیٹا مستقبل کا بہت بڑا شاعر ہے تو ہمیں اس خبر سے خوش ہونا چاہیے کیونکہ خاقانی سے بڑا شاعر زندۂ جاوید ہو جائے گا اور یہ بات کسی بھی خاندان کی برتری اور افتخار کا باعث بن سکتی ہے۔''

بیوی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''لیکن میں تو صرف ایک بات جانتی ہوں جو پورا پورا سپاہی نکلا، وہ مستقبل میں کبھی بھی پریشان نہیں ہوگا۔ سپاہی اپنا گھر خوب بنا لیتا ہے، مگر شاعر ایہ شاعر......''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور امیر نے بچے کو ماں کی گود میں ڈال کر باہر کا رخ کیا۔ یہ بات امیر کے دل و دماغ پر بھی اثر کر گئی تھی کہ ان کا بیٹا خاقانی سے بھی دو قدم آگے چلے گا۔

ایسا لگتا ہے کہ ابوالحسن کی تعلیم و تربیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ امیر سیف الدین خواجہ نظام الدین اولیا کے مریدوں میں داخل تھے۔ انہیں جب بھی موقع ملتا خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں ضرور جاتے۔

جب امیر کا بڑا بیٹا عزالدین شاہ سیانا ہو گیا تو امیر سیف الدین نے اس سے کہا۔ ''بیٹے! جیسا کہ تو جانتا ہے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا مرید ہوں۔ اب تو بھی بڑا ہو چلا ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ میں تجھے بھی اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں لے جاؤں اور تیرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں۔''

بڑے بیٹے نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا، کہا۔ ''باوا جان! جیسی آپ کی مرضی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں، جب فرمائیں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔''

باپ نے کہا۔ ''جب تب کیا ہوتی ہے بیٹے۔ میں تو تجھ کو اسی وقت لے جانا چاہتا ہوں۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''میں حاضر ہوں، بسم اللہ۔''

باپ نے بیٹے کو خوب نہلایا دھلایا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں لے چلے۔ ان کی یہ ساری تیاریاں منجھلا بیٹا ابوالحسن بھی دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کو تیار ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''باوا جان! کہاں؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''وہاں، جہاں دو سال بعد تو بھی جائے گا۔ میں تجھے بھی ایک نہ ایک دن ان کی بارگاہ میں لے جاؤں گا۔''

ابوالحسن نے پوچھا۔ ''مگر ابھی کیوں نہیں باوا جان؟''

باپ نے نہایت غور سے ابوالحسن کی طرف دیکھا، جواب دیا۔ ''ابھی اس لیے نہیں کہ وہ باتیں ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

ابوالحسن نے اصرار کیا۔ ''باوا جان! میں بھی آپ دونوں کے ساتھ چلوں گا۔''

باپ نے اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''بیٹے عزالدین! تو کیا کہتا ہے؟''

عزالدین نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہوں گا باوا جان۔ میرا خیال ہے ابھی اس کا اس دربار میں لے جانا بے کار رہے گا۔ ابھی یہ بہت کمسن ہے۔''

ابوالحسن نے رونا شروع کر دیا۔ ''باوا جان! میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔''

جب دونوں بالکل بے بس ہو گئے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابوالحسن کو ضرور لے جایا جائے گا۔ آخر باپ نے اپنا فیصلہ بہ آوازِ بلند سنا دیا۔ ''اگر تجھ کو اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہے تو فوراً تیار ہو جا۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

ابوالحسن کو ان کی ماں نے آناً فاناً تیار کر دیا اور پھر یہ تینوں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بارگاہ میں روانہ ہو گئے۔

راستے میں ایک جگہ باپ نے ابوالحسن کو بتایا۔ ''بیٹے ابوالحسن! ہم دونوں مشہورِ زمانہ بزرگ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں چل رہے ہیں۔ میں ان کے دستِ حق پرست پر پہلے ہی بیعت ہو چکا ہوں اور اب میں عزالدین کو بھی ان کے پاس اسی غرض سے لیے جا رہا ہوں کہ اس کو بھی بیعت کرا دیا جائے۔''

ابوالحسن نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ ''لیکن مجھ کو بیعت نہیں کرائیے گا؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''تجھ کو بھی بیعت کراؤں گا مگر ابھی نہیں۔ دو تین سال بعد۔ ابھی تو سات سال کا ہے، بس دس تک پہنچتے پہنچتے تجھے بھی بیعت کرا دوں گا۔''

ابوالحسن نے برا سا منہ بنایا۔ ''اور باوا جان! یہ نظام الدین اولیا آخر ہیں کیا چیز؟ انہی کے ہاتھ پر بیعت کرنا کیا معنی؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے ابوالحسن! ابھی تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گا، ابھی تیری عمر ہی کیا ہے؟''

یہ تینوں حضرات جب خواجہ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو ننھے ابوالحسن نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ خانقاہ کے در پر رک کر امیر سیف الدین نے اپنے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''بچو! ذرا مؤدب ہوجاؤ، یہ دربار بادشاہ کے دربار سے زیادہ عظیم ہے۔''

عزالدین تو خاموش رہے مگر ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''باوا جان! مجھ کو تو اندر جانا ہی نہیں جس کو اندر جانا ہو وہ مؤدب ہو جائے۔ میں اندر نہیں جاؤں گا۔''

باپ کو بیٹے کی اس بات سے دکھ پہنچا، پوچھا۔ ''اندر نہ جانے کا سبب؟''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''میں ان کا مرید نہیں ہونا چاہتا کیونکہ جب تک یہ بزرگ میری سمجھ میں نہ آجائیں، میں ان کا مرید نہیں ہوسکتا۔''

باپ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''ابوالحسن! بس حدِ ادب، خاموش ہوجاؤ۔ پیرومرشد کی شان میں ایسی بدگمانی درست نہیں۔ وہ روشن ضمیر ہیں، انہیں تیرے عقائد اور خیالات کی بابت سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔''

ابوالحسن نے عرض کیا۔ ''آپ اندر تشریف لے جائیں اگر آپ کے پیرومرشد روشن ضمیر ہیں تو انہیں میری بابت سب کچھ خود ہی معلوم ہوجائے گا۔ میں باہر ہی رکا رہوں گا۔''

عزالدین اور امیر سیف الدین، ابوالحسن کو باہر ہی چھوڑ کر اندر چلے گئے۔

ابوالحسن کی ابھی عمر ہی کیا تھی، سات سال لیکن شاعری کا مذاق پیدائشی تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر خواجہ نظام الدین کامل ہیں تو انہیں میری بابت سب کچھ خود بخود معلوم ہوجانا چاہیے۔ وہ چند مصرعے موزوں کرنے لگے۔ آخر ذرا سی دیر میں دو شعر موزوں کر ڈالے۔ سوچا، ان چار مصرعوں میں میری خواہش موجود ہے۔ اگر خواجہ نظام الدین روشن ضمیر ہیں تو میرے ان چاروں مصرعوں کا جواب چار مصرعوں میں دے کر مجھے لاجواب کردیں گے ورنہ میں ان سے دور ہی رہوں گا۔

ابوالحسن کے چار مصرعے تھے۔

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت — کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد — بیاید اندروں یا باز گردد

(تو ایسا بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کے کنگورے پر کبوتر آن بیٹھے تو تیری برکت سے وہ کبوتر باز بن جائے۔ پس ایک غریب حاجت مند تیرے دروازے پر آیا ہے۔ وہ اندر آجائے یا واپس چلا جائے)

ابوالحسن نے یہ مصرعے موزوں کیے اور جواب کے انتظار میں بیٹھ رہے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص نمودار ہوا، پوچھا۔ ''یہاں کوئی ترک زادہ موجود ہے؟''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''میں موجود ہوں، ارشاد؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں خواجہ نظام الدین کا ادنیٰ خادم ہوں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں بہ آوازِ بلند تمہیں دو شعر سنادوں اور واپس چلا جاؤں۔''

ابوالحسن نے کہا۔ ''ارشاد، سنائیے۔''

خواجہ نظام الدین کے خادم نے دو شعر سنائے۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت — کہ با ما یک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں — ازاں راہے کہ آمد باز گردد

(حقیقت کا مردِ میدان اندر چلا آئے تاکہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہمراز بن جائے اور اگر وہ آنے والا ناسمجھ اور نادان ہے تو جس راستے سے یہاں آیا ہے، اسی راستے سے واپس چلا جائے)

ابوالحسن نے یہ دونوں شعر سنے تو ان کی حالت غیر ہوگئی۔ دیوانوں کی طرح اٹھے اور خادم کے ساتھ اندر چلے گئے۔ وہاں خواجہ نظام الدین کے روبرو امیر سیف الدین، بھائی عزالدین اور حضرت خواجہ کے ایک مرید خاص سید محمد کرمانی بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوالحسن نے خواجہ نظام پر نظر ڈالی تو ان کی رہی سہی حالت بھی غیر ہوگئی۔ خواجہ نظام الدین انہیں مسکرا مسکرا کر

دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن دوڑ کر ان کے قدموں میں گر گئے۔
خواجہ نظام الدین نے فرمایا۔ ''بیا بیا دے مردِ حقیقت این جا بیا و یک نفس با ما ہمراز یشو د آ جا آ جا۔''
(''اے مردِ حقیقت آ اور ایک دم کے لیے ہمارا ہمراز بن جا۔'')
ابوالحسن نے رقت زدہ آواز میں درخواست کی۔ ''حضرت! مجھے بیعت فرما لیجیے۔ میں آپ کی غلامی کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالنا چاہتا ہوں۔''
آپ نے ابوالحسن کو بیعت فرما لیا۔

☆☆☆

اس واقعے کو پورا ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ امیر سیف الدین کا انتقال ہو گیا۔ ابوالحسن پیدائشی شاعر تھے، انہوں نے خسرو تخلص اختیار کیا اور اپنے باپ کا ایک مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر ہے۔

سیف از سرم گزشت و دلِ من دو نیم شد
دریایِ من رواں شد و درِ یتیم ماند

باپ کی وفات کے بعد خسرو اپنے نانا عماد الملک کی سرپرستی میں چلے گئے۔ عماد الملک امرائے سلطنت میں سے تھے اس لیے ان کی مجلسوں میں شاعروں، عالموں اور دانشوروں کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ خسرو ان کی باتیں غور سے سنتے اور دماغ میں بٹھا لیتے۔ یوں بھی وہ تلمیذ الرحمٰن (خدا کے شاگرد) تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے کئی زبانیں سیکھیں۔ عربی پر خاصا عبور حاصل کیا اور مولانا قاضی اسد الدین سے فنِ خطاطی سیکھا۔ استاد اپنے زمانے کے بے نظیر خطاط تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اس میں خسرو بھی یگانۂ روزگار بن جائیں مگر خسرو کو خطاطی سے زیادہ شاعری سے شغف تھا۔ اس لیے استاد ان سے ہمیشہ نالاں رہے۔

کوتوال کے نائب خواجہ اصیل، خسرو کے استاد مولانا قاضی اسد الدین کو اکثر خطوط لکھوانے کے لیے بلایا کرتے تھے۔ ایک دن جو بلایا تو ان کے ساتھ خسرو بھی چلے گئے۔ اس وقت خواجہ اصیل کے پاس ایک نامی گرامی امیر خواجہ عز الدین بھی بیٹھے تھے۔ بات شعر و شاعری کی چل نکلی تو قاضی اسد الدین نے خواجہ عز الدین سے کہا۔ ''حضرت! میرا یہ شاگرد بھی کچھ غول غاں کر لیتا ہے۔ پتا نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں۔ آپ بھی اس کا کلام سن کر رائے دیجیے کہ یہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے یا ترقی کر رہا ہے۔''

خواجہ عز الدین کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ اسے خسرو کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ''صاحبزادے! ذرا سنا نا تو، ابھی پتا چل جاتا ہے کیونکہ صحیح شعر پڑھنا بھی موزونِ طبع کی ایک علامت ہے۔''

خسرو نے بیاض میں سے ایک شعر چن لیا اور اسے نہایت پُرسوز آواز میں سنایا۔ خواجہ عز الدین، خواجہ اصیل اور قاضی اسد الدین کی حالت غیر ہو گئی، آنکھیں بھیگ گئیں اور چہرہ رنج و غم کی تصویر بن گیا۔
قاضی اسد الدین نے کہا۔ ''آپ اس کا امتحان بھی لے لیجیے کہ یہ خود کیسی شاعری کرتا ہے۔''
خواجہ عز الدین نے پوچھا۔ ''کیوں صاحبزادے! کیا تم شعر گوئی کا امتحان دینے کو تیار ہو؟''
خسرو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''
خواجہ عز الدین نے کہا۔ ''میں تمہیں چار لفظ دیتا ہوں، انہیں اپنے شعر میں استعمال کرو۔''
خسرو نے عرض کیا۔ ''ارشاد۔''
خواجہ عز الدین نے کہا۔ ''مو، بیضہ، تیر اور خربوزہ۔''
خسرو نے برجستہ شعر کہا۔

ہر موئی کہ در دو زلفِ آں صنم است — صد بیضۂ عنبریں بر آں موی صنم است
چوں تیر مداں راست دلش راز یرا کہ — چوں خربزہ دندانش میانِ شکم است

خواجہ عز الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''میاں صاحبزادے! تمہارا نام کیا ہے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''خسرو۔''
پوچھا۔ ''کس کے بیٹے ہو؟''

خسرو نے باپ کی جگہ قبیلے کا نام لیا۔ "لاچین کا۔"
خواجہ عزالدین نے ازراہِ مذاق کہا۔ "تو گویا لاچین (یعنی چین نہیں ہے)۔ کچھ توقف سے کہا۔ "ترک خطااست"۔ (ان کو ترک کہنا خطا ہے)
خسرو نے اس لفظ کو پلٹ دیا۔ "بے خطا ترک است"۔ (قطعاً وہ ترک ہے)
خواجہ عزالدین نے کہا۔ "خسرو! تمہارا تعلق دربارِ سلطانی سے قائم ہو چکا ہے اس لیے تم خسرو، ترک کر کے سلطانی تخلص اختیار کرو۔"
خسرو نے خواجہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
ابھی خسرو بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ نانا عمادالملک کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب خسرو کی زندگی میں ابتلاو افتاد کا دور آ گیا۔ ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ابھی تک وہ فکرِ معاش سے لاتعلق تھے مگر اب انہیں یہ فکر بھی کرنا پڑی۔ یہ غیاث الدین بلبن کا زمانہ تھا۔
خسرو نے شہزادوں کی شان میں قصیدے لکھے اور بلبن کے بھتیجے کشلو خان جو ملک چھجو کے نام سے مشہور تھا، نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا۔ کشلو خان اپنی علم پروری اور داد و دہش میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ خسرو دو سال تک بڑے سکون سے رہے۔ اس دوران بلبن کے بیٹے بغرا خان نے کشلو خان کے ہاں خسرو سے ملاقات کی اور ان کے اشعار سن کر انہیں داد و تحسین کے ساتھ نقرئی سکوں سے بھی نوازدیا۔ ملک چھجو (کشلو خان) کو یہ بات ناگوار گزری اور انہیں اپنے پاس سے الگ کر دیا۔ کشلو خان نے انہیں ستانا شروع کر دیا۔ جب خسرو کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ کشلو خان سے نقصان اٹھا جائیں گے تو انہوں نے سامانہ کا رخ کیا۔ سامانہ میں بغرا خان کی حکومت تھی۔ اس نے خسرو کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔
اس دوران بنگال میں بغاوت ہو گئی اور بلبن کو بغرا خان کے ساتھ بنگال جانا پڑ گیا۔ خسرو نے بھی اس سفر میں ان کا ساتھ دیا اور بنگال چلے گئے۔ بادشاہ نے بغاوت کچل دی اور بغرا خان کو وہاں کا حاکم بنا دیا۔ بغرا خان نے خسرو کو بھی روکنا چاہا مگر یہ نہیں رکے، سلطان کے ساتھ دہلی واپس چلے گئے۔
دہلی میں جشنِ فتح منایا گیا تو اس میں شرکت کے لیے سلطان کا پسندیدہ اور محبوب ترین بیٹا سلطان محمد بھی ملتان سے باپ کے پاس پہنچا۔ خسرو کا یہ حال تھا کہ دن بھر کے سلطانی کاموں سے فراغت پانے کے بعد خواجہ نظام الدین کی صحبت میں چلے جاتے، یہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کا مربی بنگال میں رہ گیا تھا۔ خواجہ نظام الدین نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔ "خدا تجھ کو بغرا خان سے بڑا مربی عطا کرے گا۔"
دہلی میں ان کی ملاقات اچانک شہزادہ سلطان محمد سے ہوئی۔ شہزادے کو خسرو پسند آ گئے اور اس نے انہیں ملازم رکھ لیا۔
ایک دن یہ بازار سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک نوجوان حسین ترین نانبائی کو روٹیاں بیچتے دیکھا۔ خسرو پر اس نوجوان نانبائی نے گہرا اثر ڈالا۔ یہ اس طرف کھنچے چلے گئے۔ کچھ دیر کھڑے نانبائی کو دیکھتے رہے۔
نوجوان نانبائی نے پوچھا۔ "کھڑے صورت کیا دیکھتے ہو؟"
خسرو نے پوچھا۔ "تم روٹیاں کس حساب سے بیچتے ہو؟"
نوجوان نانبائی نے جواب دیا۔ "حساب پوچھتے ہو تو بتاتا ہوں۔ میں ایک پلڑے میں روٹی رکھ کر دوسرے پلڑے میں خریدار سے سونا رکھواتا ہوں۔ پھر جب سونے کا پلڑا جھک جاتا ہے تو روٹی خریدار کے حوالے کر دیتا ہوں۔"
خسرو نے پوچھا۔ "لیکن اگر خریدار مفلس ہو تو؟"
نانبائی نے جواب دیا۔ "تب میں سونے کے بجائے نیاز قبول کر لیتا ہوں۔"
خسرو لاجواب ہو گئے۔ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑے رہے۔ اس کے بعد اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام کے پاس چلے گئے۔
خواجہ نظام نے ان کا ابتر حال جو دیکھا تو پوچھا۔ "کیا بات ہے خسرو؟ تم اداس کیوں ہو؟"
خسرو نے عرض کیا۔ "کیا بیان کروں پیر و مرشد! جو واقعہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"
پیر و مرشد نے اصرار کیا۔ "شرماؤ نہیں، بات بتاؤ کیا ہے؟"
خسرو نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آخر میں بولے۔ "پیر و مرشد! اس نوجوان میں کوئی ایسی قدرِ مشترک ضرور ہے جس نے مجھے بے قابو کر دیا ہے۔ میں خود کو اس کی طرف کھنچتا محسوس کر رہا ہوں۔"

خواجہ نظام الدین نے مسکرا کر فرمایا۔ "بے شک تم دونوں میں قدرِ مشترک موجود ہے اور یہ نانبائی بچہ تجھ سے کیونکر بھاگ سکتا ہے، میں اس کو یہیں بلوائے دیتا ہوں۔"

ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اسی وقت نانبائی خواجہ کے دربار میں پہنچ گیا۔

وہاں خسرو بھی موجود تھے۔ خواجہ نظام الدین نے نانبائی کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ "نوجوان! ہوش و حواس مٹا کر بے نیازی اور بے پروائی اختیار کرنا کہاں کی شرافت ہے؟"

نوجوان نانبائی نے آپ کو بہت غور سے دیکھا۔ "حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں نے تو کسی کو بھی نہیں ستایا۔"

خواجہ نے خسرو کی طرف دیکھ کر دریافت فرمایا۔ "اس نوجوان کو جانتے ہو؟"

نانبائی نے خسرو کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں جانتا ہوں۔ ان سے آج ہی ملاقات ہوئی تھی دکان پر۔ کچھ مکالموں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔"

خواجہ نے پوچھا۔ "تم دونوں میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ کچھ بتا سکتے ہو؟"

نانبائی نے جواب دیا۔ "جناب! کیا بات ہے؟ ہم دونوں میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ غالباً شاعری، وہ وجدان جو ہم دونوں کو عطا ہوا ہے، وہ شعری مذاق جو ہمیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا ہے، وہ گداز دل جو سینوں میں دھڑک رہے ہیں اور وہ شے لطیف جو ہم دونوں میں موجود ہے۔"

خسرو رونے لگے، نانبائی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

خواجہ نظام الدین نے خسرو سے کہا۔ "اب تم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو جاؤ۔" پھر خسرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ ابوالحسن خسرو ہے اور تم؟"

نوجوان نانبائی نے جواب دیا۔ "میرا نام نجم الدین اور لقب حسن ہے..... حسن سنجری۔ میرے باپ کا نام علی ہے اور میں سادات گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

خسرو اٹھ کر بغل گیر ہو گئے بولے۔ "شاید انہی اوصافِ حمیدہ کی خوشبو نے مجھے مضطرب اور بے چین کر رکھا تھا۔ آج سے تو میرا دوست ہے، مرنے جینے کا ساتھی۔ میں تیری رفاقت پر ناز کروں گا۔"

حسن سنجری نے جواب دیا۔ "تب پھر آپ بھی مجھے اپنا بہترین دوست پائیں گے۔"

خسرو نے کہا۔ "اپنا پیشہ نانبائی ترک کر دو۔"

حسن سنجری نے پوچھا۔ "پھر میں کروں گا کیا؟"

خسرو نے جواب دیا۔ "میں سلطان محمد کے درِدولت سے وابستہ ہو گیا ہوں، تمہیں بھی وابستہ کرا دوں گا۔"

حسن سنجری نے کہا۔ "جب ایسا ہو جائے گا تو میں اپنا موجودہ کام چھوڑ دوں گا۔"

خسرو نے دوسرے ہی دن شہزادہ سلطان محمد سے حسن سنجری کا تعارف کرا دیا اور یہ بھی شہزادے کے درِدولت سے وابستہ کر دیے گئے۔

شہزادہ سلطان محمد دہلی سے ملتان واپس گیا اور اپنے ساتھ خسرو اور حسن سنجری کو بھی لیتا گیا۔ شہزادہ علم پرور تھا۔ اس لیے اس کا دربار علماء و فضلاء اور مشائخ سے آباد رہتا تھا، وہ ان سب کی سرپرستی اور اعانت کرتا رہتا تھا...... لیکن جب خسرو اور حسن سنجری نے دربار میں قدم جمائے تو دوسروں کا کوئی خاص مقام نہیں رہا۔ اس طرح ان کے حاسدوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے کہ خسرو اور حسن سنجری کی کوئی غلطی پکڑیں اور شہزادے کو اس سے آگاہ کریں۔ آخر بعد جستجو انہیں ایک بات مل گئی۔ حسن سنجری اور خسرو میں بڑا یارانہ تھا۔ چونکہ دونوں ہم مذاق تھے اور شاعری میں وہ بعض اوقات خسرو پر بھی سبقت لے جاتے تھے۔

حاسدوں نے ایک دن شہزادہ سلطان محمد کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان میں سے ایک نے شہزادے سے کہا۔ "شہزادہ معظم! آپ کو کچھ پتا ہے کہ حسن سنجری اور خسرو میں کس قسم کا تعلق ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "دونوں ہم مذاق ہیں، دونوں ہی بلند پایہ شاعر ہیں اور اس لیے دونوں ایک دوسرے کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

ایک حاسد نے عرض کیا۔ "حضورِ والا! یہ بات نہیں ہے۔ کیا آپ نے وہ مثل نہیں سنی، المعاصرۃ اصل المنافرۃ (ہم عصر ہونا ہی

باہمی منافرت کی اصل ہے) اگر دونوں ہی شاعر ہیں تو ان دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد اور منافرت ہونی چاہیے۔"
شہزادے نے پوچھا۔ "آخر تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟"
جواب دیا گیا۔ "ہم لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، آپ پر ظاہر ہے۔ آپ دیندار اور متقی انسان ہیں۔ کیا خسرو اور حسن سنجری کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ آپ کے دربار سے وابستگی کے باوجود اپنی گھناؤنی زندگی سے باز نہ آئیں؟"
شہزادے کو بڑا دکھ ہوا بولا۔ "کیا یہ بات درست ہے؟ کیا تم لوگ یہ سب کچھ یقین اور وثوق سے کہہ رہے ہو؟"
لوگوں نے عرض کیا۔ "ہم اتنا بڑا الزام لگا کر خدا کے مواخذے میں جانا کس طرح پسند کریں گے؟ ہمیں بھی اپنی عافیت عزیز ہے۔ حاشا وکلا۔ دونوں پر پابندیاں لگائی جائیں ورنہ ہم سب پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔"
شہزادے کو غصہ آ گیا۔ اس نے اسی وقت حسن سنجری اور خسرو کے نام الگ الگ ایک فرمان روانہ کر دیا۔ اس فرمان میں لکھوایا گیا تھا۔ "مابدولت کو تم دونوں (حسن سنجری اور خسرو) کے باہمی گھناؤنے تعلق کا علم ہوا۔ میں حیران ہوں کہ تم دونوں کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ میں تم دونوں کا انتظار کروں گا لیکن تم دونوں کو میں یہ حکم دے رہا ہوں کہ آئندہ ایک دوسرے سے ملے تو میں اس کی بدترین اذیت ناک سزا دوں گا۔"
اس فرمان کی تین نقلیں تیار کرا کے ایک تو دفتر میں جمع کر لی گئی اور بقیہ دونوں خسرو اور حسن سنجری کو پہنچا دی گئیں۔ ان دونوں نے سلطانی حکم پڑھا اور سناٹے میں آ گئے۔
حسن سنجری اسی وقت جدا ہو کر جانے لگے مگر خسرو نے انہیں روک لیا، کہا۔ "حسن! کیا تم نے شہزادے کا حکم نہیں سنا؟"
حسن سنجری نے جواب دیا۔ "شہزادے کا حکم سن کر ہی تو جدا ہو رہا ہوں۔"
خسرو نے کہا۔ "کیا ہم دونوں کا اسی وقت شہزادے کے پاس اپنی صفائی میں کچھ عرض کرنا مناسب نہیں ہے؟"
حسن سنجری نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے یہ فضول ہے۔ شہزادے کو حاسدوں اور مفسدوں نے ہماری طرف سے بہت بدظن کر دیا ہے۔ شاید ہماری صفائی کا شہزادے پر کوئی اثر نہ ہو۔"
خسرو نے عذر پیش کیا۔ "اگر ہم دونوں شہزادے کا حکم مان لیں گے تو گویا اس بات کا اعتراف کر لیں گے کہ ہماری بابت شہزادے کو جو کچھ بتایا گیا ہے، درست ہے۔"
حسن سنجری نے پوچھا۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
خسرو نے جواب دیا۔ "ہمیں ملنا جلنا برقرار رکھنا چاہیے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
حسن سنجری نے اس سے اتفاق کیا لیکن ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لیا۔
شہزادے نے ان دونوں کے پیچھے مخبر لگا دیے تھے۔ آخر ایک دن شاہی مخبر نے حسن کو خسرو کے پاس جاتے دیکھ لیا اور اس کی خبر شہزادے تک پہنچا دی۔ شہزادے نے غصے میں حسن سنجری کو طلب کر لیا اور حسن سے پوچھا۔ "حسن! جب میں نے تم دونوں کی ملاقات پر پابندی لگا دی ہے تو تم خسرو کے پاس کیوں گئے تھے؟"
حسن نے جواب دیا۔ "شہزادے! ہمارے حاسدوں اور مفسدوں نے آپ کو ہمارے خلاف کر دیا۔ آپ کا فرمان سراسر زیادتی تھا اور جب ایک گھناؤنی بات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تو ہم دونوں اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی کیوں عائد کریں؟"
شہزادے کو غصہ آ گیا، بولا۔ "لیکن وہ میرا فرمان تھا۔"
حسن نے جواب دیا۔ "ایک بندے کا فرمان۔ وہ خدا کا فرمان تو نہیں تھا۔ بندے کے فرمان کی تعمیل خدائی فرمان کی طرح تو نہیں ہو سکتی۔"
شہزادے نے طیش میں کہا۔ "حسن! تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔"
حسن نے جواب دیا۔ "حد سے تجاوز وہ کرتا ہے جو خدا کی حدود کو توڑتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا۔"
شہزادے کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اس نے غصے میں کوڑے برسائے، جنہیں حسن نے اپنے ہاتھ پر روک لیا۔
شہزادے نے غصے میں تنبیہ کی۔ "حسن! خبردار جو اب خسرو سے ملاقات کی۔"
حسن کوئی جواب دیے بغیر شہزادے کے پاس سے خسرو کے ہاں چلے گئے۔ شاہی مخبران کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے شہزادے کو مطلع کیا کہ حسن پر کوڑوں نے کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ اس وقت بھی خسرو کے پاس موجود ہیں۔

اس بار شہزادے نے حسن کے بجائے خسرو کو طلب کرلیا۔
خسرو کو دیکھتے ہی شہزادے نے غصے میں پوچھا۔ ”خسرو! یہ معاملہ کیا ہے؟ تم دونوں میرے فرمان کی نافرمانی پر کیوں تلے ہوئے ہو؟“
خسرو نے آستین کو اوپر چڑھاتے ہوئے اپنی کلائی اور ہتھیلی کی پشت شہزادے کے سامنے کردی اور آہستہ سے ایک مصرعہ پڑھا۔

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

شہزادے نے دیکھا کہ جس جگہ حسن کے کوڑے لگے تھے، خسرو کے ہاتھ میں اسی جگہ کوڑے کے نشان موجود تھے۔
خسرو نے کہا۔ ”شہزادہ معظم! حسن میرا ہم مشرب، ہم مذاق، عزیز ترین دوست، بلند پایہ شاعر اور ہم مسلک بھائی ہے۔“
شہزادہ بے حد شرمندہ تھا، وہ خسرو سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”خسرو! میں نے جو کیا اس پر میں شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔“
خسرو رونے لگے، بولے۔ ”شہزادے! میں اپنے حاسدوں اور مفسدوں پر آنسو بہا رہا ہوں۔ خدا انہیں معاف کرے۔“
اس واقعے کے کچھ عرصے بعد شہزادے کو خبر ملی کہ چنگیز خانی سپاہ دیپالپور سے لاہور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شہزادہ سلطان محمد اپنی فوج کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔ فوج میں خسرو اور حسن سنجری بھی شامل تھے۔ شہزادہ چند گھنٹوں میں دریائے راوی کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ اب دریائے راوی کے ایک طرف مغل فوج تھی اور دوسری طرف شہزادہ سلطان محمد اور اس کی فوج۔ مغلوں کے حوصلے بلند تھے۔ ان کے سردار نے حکم دیا کہ مغل دریا عبور کر کے شہزادہ سلطان محمد کی فوج پر حملہ آور ہو جائیں۔
مغلوں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا پار اتر گئے۔
دونوں فوجیں آپس میں الجھ گئیں، شہزادہ سلطان محمد بے جگری سے لڑتا مقابلہ کرتا، ادھر سے ادھر اور اُدھر سے اِدھر آجا رہا تھا۔ چند گھنٹے بعد مغلوں نے اپنی روایتی جنگی چال چلی اور شکست کھا کر بھاگنے لگے اور شہزادے کی فوج کی اکثریت ان کے تعاقب میں دوڑی۔ یہاں تک کہ شہزادے کے پاس کل پانچ سو سپاہی رہ گئے۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ شہزادہ اپنے ساتھیوں کو لے کر نماز ادا کرنے لگا۔ مغلوں کا ایک دو ہزاری دستہ کمین گاہ میں چھپا اس موقع کی فکر میں تھا۔ وہ باہر نکلا اور نمازیوں پر حملہ کردیا۔ شہزادے اور اس کے ساتھیوں نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور فارغ ہوتے ہی جنگ وجدل میں مشغول ہو گئے۔ دوسری طرف شکست خوردہ مغل بھی اچانک پلٹ کر تعاقب کرنے والوں پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ شہزادے کی فوج بوکھلا گئی۔ کسی مغل کا تیر شہزادے کے دل میں پیوست ہوگیا جس سے وہ گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہوا۔ شہزادے کی شہادت نے اس کی سپاہ کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ مغلوں نے ان کا پیچھا کیا اور رگید رگید کر قتل کرنا شروع کردیا۔ کچھ لوگ دریا میں کود گئے اور بہتوں نے خود کو مغلوں کے سپرد کردیا۔ مغلوں کے سپرد ہو جانے والوں میں خسرو اور حسن سنجری بھی شامل تھے۔
جس مغل نے انہیں قید کیا تھا، وہ خسرو اور حسن سنجری کے مرتبے کو کیا جانتا۔ اس نے انہیں رسیوں سے باندھ کر اپنے گھوڑے کے ساتھ بھگانا شروع کردیا۔ مغل اپنے گھوڑے پر سوار افغانستان کی طرف جا رہا تھا اور خسرو اور حسن سنجری لہولہان آبلہ پا یہ مسافت طے کر رہے تھے۔ وہ انہیں اسی طرح بلخ تک لے گیا۔
اس مغل نے اتنے صابر و شاکر انسان نہیں دیکھے تھے۔ اسے ان دونوں پر ترس آگیا۔ بلخ پہنچ کر پوچھا۔ ”میں حیران ہوں کہ تم دونوں نے اتنے طویل سفر میں ایک جگہ بھی مزاحمت نہیں کی۔ آخر اس کی وجہ؟“
خسرو نے جواب دیا۔ ”کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری شکست اور تمہاری فتح میں خدا کی مشیت شامل ہے اور ہم تقدیر الٰہی سے جنگ کرنے کے قائل نہیں۔“
مغل ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔ پوچھا۔ ”تم کام کیا کرتے ہو؟“
خسرو نے جواب دیا۔ ”بہت کچھ لیکن شعر و شاعری سے زیادہ شغف ہے۔“
مغل نے پوچھا۔ ”شعر و شاعری؟ یہ کون سا کام ہوتا ہے؟“

خسرو نے اس مغل کو شعر و شاعری کا مفہوم سمجھایا تو وہ بہت ہنسا، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا، بولا۔ ”تو شاید تم بھی بخارا کے ان لوگوں جیسے ہو جو کتابیں لکھتے تھے اور کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ غیر فوجی، نکمے، بیکار، فضول...... انہیں تلوار چلانا نہیں آتی تھی اور میرا خیال ہے کہ تم دونوں بھی تلوار نہیں چلا سکتے۔“

خسرو نے جواب دیا۔ ”تلوار تو ہم لوگ بھی چلاتے ہیں مگر فولادی تلوار نہیں، قلم کی تلوار۔“

مغل نے ہنس کر کہا۔ ”یہ قلم کی تلوار کیا چیز ہوتی ہے اور اس سے انسانوں کو کس طرح ہلاک یا قتل کیا جاتا ہے؟“

خسرو نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں قلم کی تلوار کا طریقہ کار تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔“

مغل کو بڑی ہنسی آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم دونوں ہمارے کسی کام کے نہیں۔ نہ تو تم تلواریں بنا سکتے ہو اور نہ ہی تلواریں چلا سکتے ہو۔ تم کھیتی باڑی کا ہنر بھی نہیں جانتے۔ تم مکان بھی نہیں بنا سکتے۔ یعنی تم میرے کسی کام کے بھی نہیں۔“

خسرو کی جان نکل گئی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ جب کوئی شخص مغلوں کے کام کا نہیں ہوتا تو اس کا حشر کیا کیا جاتا ہے۔ شاید قتل کر دیا جاتا ہے۔

لیکن مغل نے ان دونوں کو قتل نہیں کیا، انہیں حکم دیا۔ ”تم دونوں بھاگ جاؤ، جلد از جلد...... جتنی جلدی ممکن ہو بھاگ جاؤ، کیونکہ دوسرے مغل بے کار آدمیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔“

یہ بدشکل، چوڑے منہ، گندا دہن اور کچی ڈاڑھی مونچھ والا مغل دیکھنے میں ہیبت ناک اور خونخوار نظر آتا تھا مگر جب اس نے انہیں رہا کر دیا تو یہ بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ سیدھے دہلی پہنچے اور ماں کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگے پھر حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت محبوب الٰہی خسرو کے کلام پر سر دھنا کرتے تھے۔ انہوں نے خسرو سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ خسرو نے آپ کی شان میں مدح سرائی کی۔ حضرت محبوب الٰہی اس سے بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ ”خسرو! کیا صلہ چاہتے ہو؟“

خسرو نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد کلام میں شیرینی۔“

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ”چارپائی کے نیچے طشت میں شکر رکھی ہے۔ اس کو نکالنا تو سہی۔“

خسرو نے شکر کا طشت کھینچ کر باہر نکالا۔

آپ نے حکم دیا۔ ”کچھ شکر اپنے سر پر چھڑک لو اور کچھ کھا لو۔“

خسرو نے حکم کی تعمیل کی اور اسی دن انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے کلام میں کہیں زیادہ شیرینی پیدا ہو چکی ہے۔ آخری عمر میں خسرو بہت پچھتایا کرتے تھے کہ اس سے بہتر صلہ بھی مانگا جا سکتا تھا مگر بدقسمتی کہ نہیں مانگ سکا۔

کچھ عرصہ دہلی میں رہ کر خسرو مومن پور (پٹیالی) چلے گئے۔ یہاں ان کا مکان گنگا کے کنارے پر تھا۔ وطن میں انہیں بڑا سکون محسوس ہوا۔

اس وقت تک وہ خاصی شاعری کر چکے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنے دیوان کی ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ یہ ان کا دوسرا دیوان تھا اور انہوں نے اس کا نام رکھا تھا ”وسط الحیوۃ۔“ ان کے اس دیوان میں اٹھاون قصائد چھہتر ترجیعات، بیالیس قطعات دو مثنویاں، ایک سو ستاون رباعیات اور تین سو غزلیں ہیں۔ دیوان کے کل اشعار کی تعداد آٹھ ہزار چار سو کتالیس ہے۔ اس وقت ان کی عمر چونتیس سال کی تھی۔

خسرو کو شہزادہ سلطان محمد کی شہادت کا اتنا دکھ تھا کہ انہوں نے اس سانحے کے زیر اثر ایک مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ جب بلبن کے دربار میں سنایا گیا تو وہاں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پھر بخار آ گیا اور اسی بخار میں سلطان کا انتقال ہو گیا۔

بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد سلطان بن گیا۔ کیقباد نے خسرو کو ملک الشعرا بنا دیا مگر قسمت یہاں بھی ان کے ساتھ تھی۔ کیقباد تین سال حکومت کر کے ایک ترک کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی بادشاہ بن گیا اور اس نے خسرو کو ”امیر“ کا لقب دے کر مصحف داری کا عہدہ بخش دیا۔ ابھی تک خسرو صرف خسرو تھے لیکن جلال الدین خلجی نے انہیں امیر کا خطاب دے کر امیر خسرو بنا دیا۔

پانچ چھ سال بعد جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے اور داماد علاؤالدین خلجی نے الٰہ آباد میں کڑے نامی جگہ پر دھوکے سے قتل

کردیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ خسرو کو جلال الدین خلجی سے بڑی محبت تھی۔ اس کی کمانے کے لئے ان کے متعلق ان کے دل کو دکھ ہوا۔

اس واقعے نے خسرو کو اتنا دل برداشتہ کردیا تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت حضرت محبوب الٰہی کی محبت میں گزارنے لگے تھے۔ علاؤالدین نے انہیں اپنے منصب پر بحال رکھا تھا۔ ایک ہزار تنکہ سالانہ بطور وظیفہ ملتا تھا۔

خسرو بے حد گداز قلب رکھتے تھے۔ اس گداز یت نے ان کی شاعری میں درد و سوز بھر دیا تھا۔ انہیں شاعری کے ساتھ ہی موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا اور یہ بات مشہور تھی کہ موسیقی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ موسیقی میں سب سے بڑا درجہ نایک کا ہوتا ہے۔ خسرو نے نایک کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ خسرو کے بعد آج تک یہ مرتبہ کوئی اور نہیں حاصل کرسکا۔

کہتے ہیں، خسرو کے عہد میں دکن کا گوپال نامی موسیقار نایک کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ پورے برصغیر میں اس کا بڑا شہرہ تھا۔ دہلی میں علاؤالدین خلجی نے اس کے غیر معمولی شہرے کے پیش نظر اسے دکن سے بلوالیا۔

ادھر بادشاہ خسرو کی بابت یہ سن چکا تھا کہ علم و موسیقی میں بھی خسرو کا کوئی ثانی نہیں۔ بادشاہ نے خسرو سے کہا۔ ''خسرو! میں نے علم موسیقی کے ماہر گوپال کو دکن سے بلالیا ہے، سنتا ہوں گوپال اپنے فن میں یکتا ہے۔ کیا تم اس کا مقابلہ کر سکتے ہو؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں جہاں پناہ۔ میں گوپال کا مقابلہ کروں گا مگر مقابلے سے پہلے حضور کو میری ایک شرط پوری کرنا ہوگی۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کون سی شرط؟ بیان کرو۔''

خسرو نے عرض کیا۔ ''حضور والا! میں نے سنا ہے کہ گوپال نایک کے بارہ سو شاگرد ہیں جو اپنے استاد کے سنگھاسن (تخت) کو اپنے کاندھوں پر لیے پھرتے ہیں۔ میری حضور سے یہ درخواست ہے کہ گوپال نایک جب آپ کے روبرو اپنے فن کا مظاہرہ کرے تو مجھے خاموشی اور ہوشیاری سے اس کے تخت کے نیچے چھپا دیا جائے۔ بس میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں گوپال کو وہ جواب دوں گا کہ وہ خود اور زمانہ اس مقابلے کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔''

بادشاہ نے خسرو کی تجویز مان لی اور جب گوپال نایک کو علائی دربار میں لایا گیا تو خسرو کو اس کے سنگھاسن کے نیچے چھپا دیا گیا۔ گوپال نے راگ چھیڑا اور خسرو اسے ذہن نشین کرتے چلے گئے۔

اس طرح یکے بعد دیگرے چھ مجلسیں منعقد ہوئیں اور خسرو کو گوپال کا ہر راگ ازبر ہوتا چلا گیا۔

ساتویں بار بادشاہ نے خسرو کو حکم دیا کہ اب وہ بھی گوپال نایک کے مقابلے پر آجائیں۔ چنانچہ خسرو بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ علائی دربار میں داخل ہوئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو گوپال نے خسرو سے کہا۔ ''شریمان جی! میں نے آپ کا بڑا شہرہ سنا ہے، آج تو میں آپ سے کچھ سنوں گا۔''

خسرو نے جواب دیا۔ ''سنانے میں مجھے کوئی تامل نہیں لیکن میں چونکہ ترک ہوں اس لیے ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں۔ پہلے آپ کچھ سنائیں پھر میں بھی کچھ عرض کردوں گا۔''

گوپال نے گانا شروع کیا۔ جب وہ گا چکا تو خسرو نے کہا۔ ''مہاراج! یہ تو میں بہت پہلے باندھ چکا ہوں۔''

گوپال نے حیرت سے کہا۔ ''اچھا ذرا سنانا تو۔''

خسرو نے گا کر بھی سنا دیا۔ گوپال حیرت زدہ رہ گیا اور دوسرا راگ چھیڑا۔ خسرو نے پھر وہی بات دہرائی کہ میں اس کو بھی بہت پہلے باندھ چکا ہوں۔

گوپال پریشان ہو گیا، بولا۔ ''سنانا تو سہی۔''

خسرو نے پھر سنا دیا۔ گوپال نے تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا راگ چھیڑا اور ان سب کا یکساں حشر ہوا۔ آخر میں خسرو نے کہا۔ ''مہاراج! یہ سب اپنے ایجاد کردہ راگ تھے اور انہیں میں عام بازاری راگ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اب میں اپنی خاص ایجادات سناتا ہوں، سنیے۔''

اب جو خسرو نے گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت رہ گیا۔ آخر میں بولا۔ ''شریمان جی! وحقیہ ہو، میں آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آپ میں فن کی مہارت کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اس کچھ اور کا میں کیا، دنیا کا کوئی شخص بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

بادشاہ، خسرو کے کمال فن اور فتح مندی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے تحسین آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''خسرو! یہ کیا ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ محبوب الٰہی کی نظر کا فیض تمہیں عطا ہوا ہے۔''

خسرو نے عرض کیا۔" حضور والا! میں جو کچھ بھی ہوں خواجہ نظام الدین کے طفیل ہوں۔"
گوپال نے درخواست کی۔" خسرو! میں موسیقی میں نایک کا درجہ رکھتا ہوں لیکن آپ کا مقام مجھ سے کہیں بلند ہے۔ کیا میں آپ سے کچھ سیکھ سکتا ہوں؟"
خسرو نے جواب دیا۔" میں تیار ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
اس کے بعد گوپال نے خسرو سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور کہیں زیادہ باکمال بن گیا۔

☆☆☆

انہی دنوں پانی پت میں شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر نے ایک خاص شہرہ حاصل کر رکھا تھا۔ قلندری دربار میں لوگ جانا تو چاہتے تھے مگر ہمت کسی کی بھی نہ پڑتی تھی۔ سلطان علاؤالدین خلجی بھی بوعلی شاہ قلندر کو کچھ نذر پیش کرنا چاہتا تھا مگر وہ شخص نہیں مل رہا تھا جو بادشاہ کی نذر بوعلی شاہ قلندر تک پہنچا دے اور اس نذر کو قبول بھی کر لیا جائے۔
کسی امیر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جب حضور والا کو امیر خسرو جیسا آدمی میسر ہے تو پھر تلاش کی کیا ضرورت ہے۔
بادشاہ نے جواب دیا۔" بات تو درست ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ امیر خسرو ہمارے کہنے سے بوعلی شاہ کے پاس نہیں جائیں گے۔ وہ اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھائیں گے۔"
امیر نے مشورہ دیا۔" پھر محبوب الٰہی سے اجازت حاصل کر لی جائے۔"
بادشاہ نے ایک امیر حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اس نے بادشاہ کا مافی الضمیر ان سے بیان کر دیا۔ آپ نے کچھ تامل کے بعد خسرو کو بلایا اور کہا۔" خسرو! تم بادشاہ کا نذرانہ لے کر بوعلی شاہ کے پاس چلے جاؤ۔"
خسرو کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ تیار ہو گئے۔ آپ نے خسرو کو سمجھایا۔" خسرو! تم قلندر بوعلی شاہ کے پاس اس طرح جاؤ گے کہ ان کی کسی بات پر اعتراض نہ کرنا۔ وہ جو کچھ فرمائیں سر تسلیم خم کر دینا۔ وہ اللہ کے عاشق ہیں۔"
خسرو بادشاہ کا نذرانہ لے کر پانی پت روانہ ہو گئے۔ تیسرے دن پانی پت میں داخل ہوئے۔ بوعلی شاہ قلندر کے آستانے پر پہنچ کر اطلاع کرائی۔ بوعلی شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت محبوب الٰہی کی اجازت سے خسرو ان کے پاس آئے ہیں تو فوراً ہی اندر بلا لیا۔ خسرو نے ان کے روبرو جاتے ہی سلام کیا۔
بوعلی شاہ نے فرمایا۔" آ گا ترک۔ میرے قریب آ جا۔"
خسرو نے دوبارہ سلام کیا اور عرض کیا۔" حضرت! یہ آپ کی عنایت ہے جو مجھے مخاطب فرمایا ورنہ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔"
بوعلی شاہ نے فرمایا۔" اپنے کلام میں سے کچھ سناؤ۔"
خسرو نے نہایت خوش الحانی سے سنانا شروع کیا تو بوعلی شاہ قلندر بہت خوش ہوئے فرمایا۔" خسرو خوب کہتا ہے' خوش رہے گا' خوش جائے گا۔"
خسرو پر رقت طاری ہو گئی، وہ رونے لگے۔
بوعلی شاہ نے پوچھا۔" کچھ سمجھا بھی؟"
خسرو نے جواب دیا۔" حضرت! مجھے رونا اس قدر آیا کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔"
بوعلی شاہ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا۔" خسرو! میں نے بادشاہ کی نذر قبول کر لی۔ اگر درمیان میں مولانا نظام الدین کا قدم نہ ہوتا تو میں اس کو ہرگز قبول نہ کرتا۔"
اس کے بعد آپ نے خدام کو حکم دیا۔" خسرو کو خانقاہ میں اعزاز و اکرام سے رکھو۔"
خسرو نے خانقاہ میں تین دن قیام کیا پھر اجازت لے کر واپسی کا ارادہ کیا۔ بوعلی شاہ نے انہیں دو خط دیے۔ ایک حضرت محبوب الٰہی کے نام اور دوسرا سلطان علاؤالدین خلجی کے نام۔

☆☆☆

علاؤالدین خلجی کو اس کے غلام ملک کافور نے سازش سے ہلاک کر دیا اور اس کی جگہ کمسن شہزادے شہاب الدین کو تخت نشین کر دیا لیکن ایک ماہ کے اندر اندر ملک کافور بھی قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ علاؤالدین کا تیسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ قطب الدین کو خسرو بے حد پسند آئے۔ خسرو نے بھی بادشاہ کو خوش کرنے کی خاطر مثنوی نہ سپہر لکھی۔ بادشاہ نے انہیں ہاتھی برابر وزن کر کے چاندی بطور انعام دی۔

پھر قطب الدین بھی قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ غیاث الدین تغلق برسر اقتدار آئے۔ غیاث الدین تغلق نے بھی انہیں ان کی جگہ پر برقرار رکھا لیکن اس آئے دن کے خون خرابے اور انتشار نے خسرو کو دل برداشتہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا زیادہ وقت اپنے پیرو مرشد کی صحبت میں گزارنا شروع کر دیا۔ حضرت محبوب الٰہی خسرو کو اس قدر پسند فرماتے تھے کہ دوسرے مرید خسرو کو وسیلہ بنا کر حضرت محبوب الٰہی تک پہنچتے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''میں اپنے وجود سے رنجیدہ ہوتا ہوں مگر اے ترک (خسرو) میں تجھ سے کبھی رنجیدہ نہیں ہوتا۔'' کبھی یہ فرماتے۔ ''میں اور سب سے اکتا جاتا ہوں لیکن خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا۔''

ایک دن آپ نے فرمایا۔ ''جب قیامت کے دن مجھ سے سوال ہوگا کہ نظام الدین تو دنیا سے کیا لایا ہے؟ تو میں جواب میں خسرو کو پیش کر دوں گا۔''

اس طرح ایک اور موقع پر فرمایا۔ ''روزِ محشر امیدوارم کہ مرا بہ سوزِ سینہ ایں ترک بچہ بخشند (اس ترک بچے کے دل میں جو آگ سلگتی ہے۔ اس کی گرمی کے سبب میں بخشا جاؤں گا)۔''

اس طرح ایک اور موقع پر خسرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''الٰہی! بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش (خدایا! اس ترک کے سوزِ دل کے طفیل مجھے بخش دے)۔'' اس کے بعد مزید فرمایا۔ ''اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی قبر میں خسرو کو دفن کرنے کی وصیت کر جاتا۔''

ایک مفلس وقلاش حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں پہنچا اور دستِ سوال دراز کیا۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور سوالی کو خالی واپس بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ ''بھائی! اس وقت تو میرے پاس میری نعلین کے سوا کچھ بھی نہیں، وہ لے سکتے ہو۔''

سائل نے اس کو غنیمت جانا۔ بولا۔ ''وہی عنایت ہو جائے۔''

آپ نے اپنی نعلین سائل کے حوالے کر دیں۔

یہ شخص دہلی سے اودھ کی طرف چلا گیا اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ اس سرائے میں خسرو پہلے سے مقیم تھے۔ خسرو کو سرائے میں اپنے پیرو مرشد کی خوشبو محسوس ہوئی، یہ خوشبو کو سونگھتے ہوئے سائل تک پہنچ گئے اور اس سے پوچھا۔ ''میں اپنے پاس پیر مرشد کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔''

سائل نے پوچھا۔ ''تیرا پیرو مرشد کون ہے؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''حضرت نظام الدین محبوب الٰہی۔''

سائل نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ''ہاں، میں نے اس دربار کی بابت بہت کچھ سن رکھا تھا مگر جب میں ان کے پاس گیا اور اپنا دستِ طلب دراز کیا تو جانتے ہو کہ مجھے وہاں سے کیا ملا؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''نہیں، مجھ کو نہیں معلوم کہ تجھ کو وہاں سے کیا ملا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ تجھ کو وہاں سے جو کچھ ملا ہوگا، بہت قیمتی ہوگا۔''

درویش نے محبوب الٰہی کی جوتیاں خسرو کے سامنے رکھ دیں اور کہا۔ ''یہ تحفہ ملا تھا مجھ کو۔''

خسرو نے ان جوتیوں کو نہایت قیمتی تبرک سمجھ کر اٹھا لیا، فرمایا۔ ''اگر تو پسند کرے تو میں انہیں خرید لوں کیونکہ یہ ہفت اقلیم کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی ہے۔''

درویش نے جواب دیا۔ ''بابا! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جوتیوں کو نقدی میں بدل لوں۔''

اس وقت خسرو کے پاس بہت کچھ تھا، مال وزر، لونڈیاں، کنیزیں۔ انہوں نے یہ سارا کا سارا درویش کے حوالے کر کے پیرو مرشد کی جوتیاں سر پر رکھ لیں، فرمایا۔

تاج خسرو ہے یہی تختِ سلیماں ہے یہی۔

☆☆☆

ایک دن بازار سے گزر ہوا تو دیکھا دُھنیا روئی دھنک رہا ہے، اس وقت کوئی صاحب خسرو کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''خسرو! کیا خیال ہے، ہر دُھنیا ایک ہی انداز میں روئی دھنکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا سارے دُھنیے ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں۔''

کی دوسرے نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ دُھنیوں کی استاد قدرت خود ہے اور اس نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔''

خسرو کے ساتھی نے ان سے پوچھا۔ ''حضرت! اگر اس آواز کو لفظوں میں قید کیا جائے تو کیا آواز نکلے گی؟''

در پئے جاناں جاں ہم رفت جاں ہم رفت جاں ہم رفت
رفت رفت جاں ہم رفت ایں ہم رفت واں ہم رفت
آں ہم رفت آں ہم رفت ایں ہم آں ہم ایں ہم آں ہم رفت
رفتن رفتن رفتن وہ وہ رفتن وہ رف رف رفتن وہ رفتن وہ

اس میں کمال کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے دُھنیے کو روئی دھنکتے دیکھا اور سنا ہے، وہ خسرو کی لفظی عکاسی میں اسے ہو بہو پائیں گے۔ دُھنیا تانت پر جب ضرب لگاتا ہے تو اس میں یہی آوازیں نکلتی ہیں۔

☆☆☆

خسرو اپنے عہد ہی میں اتنے مشہور ہو چکے تھے کہ جدھر سے بھی گزر جاتے، لوگ انہیں پہچان کر آپس میں اشاروں کنایوں میں باتیں کرنے لگتے۔ اس طرح یہ ایک دن گھومتے پھرتے پنگھٹ پر جا پہنچے۔ کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھی۔ خسرو پیاسے تھے۔ کنویں کے پاس رک گئے اور ان میں سے کسی ایک سے پانی مانگا۔

ایک نے خسرو کو پہچان لیا، اس نے تینوں سے کہا۔ ''تم نے اسے پہچانا؟''

تینوں نے جواب دیا۔ ''نہیں تو، یہ کون ہے؟''

اس نے کہا۔ ''یہ کھسرو (خسرو) ہے۔''

ایک نے خسرو سے پوچھا۔ ''کیا تم سچ مچ کھسرو ہو۔''

دوسری نے کہا۔ ''وہی کھسرو، جس کا کلام مشہور ہے اور جو پہیلیاں بھی گھڑتا ہے۔''

خسرو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں خسرو ہوں، وہی شاعری اور پہیلیوں والا خسرو۔''

ایک نے کہا۔ ''پھر تم اپنی شاعری میں کھیر کی بات کرو۔''

دوسری نے کہا۔ ''چرخے کا ذکر بھی۔''

تیسری نے کہا۔ ''اور ڈھول کا بھی۔''

چوتھی بولی۔ ''اور کتے کا بھی۔''

خسرو نے کہا۔ ''میں سخت پیاسا ہوں، پہلے مجھے پانی پلا دو۔''

عورتوں نے جواب دیا۔ ''نہیں، پہلے ہماری خواہش پوری کرو، بعد میں پانی۔''

خسرو نے کہا لو سنو۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا
''لا پانی پلا۔''

☆☆☆

یہ ایک متفقہ رائے ہے کہ خسرو کے کلام میں سوز و گداز، رفعت خیالی، روانی، تنوع، ندرت اور نفاست پائی جاتی ہے۔ اس میں حضرت محبوب الٰہی کا فیضان پوری طرح شامل اور موجود ہے۔ وہ ایک طرف تو شاہی درباروں میں قصائد پڑھتے نظر آتے ہیں۔ بادشاہوں کی مدح سرائی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف حضرت محبوب الٰہی کے قدموں میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ ان پر درباروں اور شاہوں کا رنگ نہیں چڑھ سکا، ہاں تصوف نے انہیں رنگ میں ضرور رنگ لیا۔ وہ بھری پُری دنیا میں رہ کر بھی اس سے الگ تھلگ رہے۔

خسرو ہر انسان کو آدمی نہیں مانتے تھے۔ کہتے تھے۔ ''اگرچہ آدمی بے حساب است ولیکن در دیوانِ آدمیت ہمہ را در حساب آدمیت محو اں شد۔''

(اگرچہ آدمی بے شمار ہیں لیکن زمرہ آدمیت میں سب شامل نہیں ہیں)

خسرو نے معاصرین کو مال و زر اور جاہ و منصب کی طرف بھاگتے دیکھا تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا۔

مرد گیر دہرور کہ نانت دہند　　درِ کعبہ زن تا امانت دہند

(رزق کی تلاش میں مارا مارا نہ پھر اکر، خدا کے گھر کی جانب متوجہ ہو جا تا کہ تجھے امان مل جائے)

ضامن روزیٔ تو روزی رساں　　دیدۂ کور تو بسوئے جناں

(تیری روزی کا ضامن تو خدا ہے لیکن تو اپنی بے بصری کے سبب دنیا کی طرف دیکھ رہا ہے)

خسرو اپنے عشق میں شدت کے طالب رہے۔ وہ اس سلسلے میں غیر قانع اور حد درجہ حریص تھے۔

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ تر بادا
تنم از بے دلی بے چارہ شد، بے چارہ تر بادا

(میرا دل عاشقی میں آوارہ ہو گیا ہے، خدا کرے اور آوارہ ہو جائے۔ میرا جسم محبت میں بے چارہ ہو گیا ہے، خدا اس کی بے چارگی میں اضافہ کرے)

ہر کس کہ در قید عشق شد مجنوں تا قیامت زبند او نہ رہید

(جو شخص قیدِ عشق میں ایک بار مجنوں ہو گیا، اسے تا قیامت رہائی نصیب نہیں ہو سکتی)

خسرو نے اپنی مثنوی شیریں فرہاد میں عشق کے اسرار و رموز کو بہ زبان فرہاد یوں بیان کیا ہے۔

بگفتش کیستی، در چہ سازی　　بگفتا عاشقم، در جاں گزاری
(پوچھا تو کون ہے اور کیا کرتا ہے　　جواب دیا کہ میں عاشق جانثار ہوں)
بگفتش عشق بازاں رانشاں چیست　　بگفتا آں کہ باید در بلا زیست
(پوچھا عاشق کی پہچان کیا ہے؟　　جواب دیا، ان کی جان ہمیشہ آفت میں رہتی ہے)
بگفتش، عاشقاں زیں رہ چہ پویند　　بگفتا، دل دہند و درد جویند
(پوچھا عاشق کس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، جواب دیا دل دیتے ہیں درد لیتے ہیں)

☆☆☆

سلطان غیاث الدین تغلق بنگال میں تھا، خسرو بھی بنگال ہی میں تھے۔ سلطان کا بیٹا الغ خان خسرو کو بہت چاہتا تھا۔ بادشاہ بنگال سے واپس ہوا۔ مگر اس سفر میں خسرو سلطان کے ساتھ نہیں تھے۔ بادشاہ حضرت محبوب الٰہی کی شان میں گستاخیاں کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ دوسری طرف حضرت محبوب الٰہی کو بھی کشف سے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا آخری وقت آ چکا ہے چنانچہ ربیع الآخر 725 ہجری میں آپ کا وصال ہو گیا۔ خسرو کو یہ خبر بنگال میں ملی۔ یہ بھاگم بھاگ دہلی پہنچے، جب یہ مزار کی طرف بڑھے تو چند لوگوں نے آپ کو روک دیا۔ خسرو رو رہے تھے۔ رقت زدہ آواز میں کہا۔ ”تم لوگ مجھے حضرت محبوب الٰہی کے پاس کیوں نہیں جانے دیتے؟“

ایک شخص نے جواب دیا کہ حضرت محبوب الٰہی نے سختی سے منع کیا ہے کہ خسرو کو میرے مزار پر نہ آنے دیا جائے کیونکہ اگر خسرو میرے مزار پر آ گیا تو ہو سکتا ہے کہ میں بھی قبر سے اٹھ کر باہر آ جاؤں۔ بس اسی وجہ سے میں نے آپ کو اندر جانے سے روک دیا ہے۔

خسرو نے مزار کو دیکھتے ہی دور سے نعرہ بلند کیا۔ ”سبحان اللہ! آفتاب زیر زمیں و خسرو زندہ۔“

آخر غم نے جنون کی شدت اختیار کی اور خسرو کسی بات کی پروا کیے بغیر مزار پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، منہ پر سیاہی مل لی اور یہ شعر پڑھا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

(محبوب اپنے چہرے پر زلفیں ڈالے سو رہا ہے۔ اے خسرو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ شام ہو چکی ہے، اب تو اپنے گھر چل)

خسرو ہر ایک سے یہی کہتے پھر رہے تھے کہ اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہوں گا، بہت جلد چلا جاؤں گا۔

چنانچہ 18 شوال 725 ہجری کو یہ آفتاب ڈوب گیا۔

آپ کے عقیدت مندوں نے کوشش کی کہ انہیں محبوب الٰہی کے پہلو میں دفن کیا جائے مگر اس بار پھر مزار کے متولی نے ان سب کو روک دیا اور کہا۔ ”میں ایسا اس لیے نہیں ہونے دوں گا کہ آگے چل کر ان دونوں مزاروں کی پہچان تک مشکل ہو جائے گی۔“

آخر خسرو کو ان کے پیر و مرشد کے پائنتی دفن کر دیا گیا۔

امیر خسرو کا مزار چوڑائی میں بیس فٹ سات انچ لمبائی میں اٹھائیس فٹ چھ انچ کے ایک قطعہ پر واقع ہے۔ احاطے کی دیوار سرخ پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ احاطے کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔

کہتے ہیں خسرو کے پیر و مرشد حضرت محبوب الٰہی کے عرس کا افتتاح آج بھی خسرو کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

خسرو کی تصانیف کی تعداد بیالیس بتائی جاتی ہے۔

صوفی، عاشق، مصنف، شاعر، ماہر موسیقی، کہہ مکرنیوں، پہیلیوں کے موجد، نسبتوں کے باوا آدم، بہت ساری زبانوں کے عالم، منتظم، کئی سازوں کے موجد، خسرو کی معلوم نہیں کتنی حیثیتیں تھیں۔ ان کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔

کہہ مکرنیاں

برسا برس وہ دیس میں آوے — منہ سے منہ لگا رس پیاوے
واخاطر میں خرچے دام — اے سکھی ساجن نہ سکھی آم (آم)

☆☆☆

میں پڑی تھی اچانک چڑھ آیو — جب اترو تو پسینا آیو
سہم گئی کچھ سے کہی نہ پکار — اے سکھی ساجن نہ سکھی بخار (بخار)

☆☆☆

لپٹ لپٹ کے وا کے سوئی — چھاتی سے پاؤں لگا کے روئی
دانت سے دانت بجے تو تاڑا — اے سکھی ساجن نہ سکھی جاڑا (جاڑا)

☆☆☆

وہ آوے تو شادی آوے — اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے وا کے بول — اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول (ڈھول)

☆☆☆

پہیلیاں

سب کوئی اس کو جانے ہے — پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں لیکھا ہے — فکر کیا، ان دیکھا ہے (خدا)

☆☆☆

جل کر بنے جل میں رہے — آنکھوں دیکھا خسرو کہے (کاجل)

☆☆☆

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں — بوجھے نہیں تو چھوڑو گاؤں (دیا)

☆☆☆

مُن سکھی بابل مورے اور اماں میری، ابا کو بھیجوری کہ ساون آیا...... جیسے مشہور زمانہ گیت بھی خسرو ہی کے ہیں۔

ماخذات

تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی۔ افضل الفوائد، امیر خسرو۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ
حیات امیر خسرو، تقی محمد خورجوی۔ خسرو شیریں بیان، اقبال صلاح الدین
بزم مملوکیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن

صنف کرخت میں بے شمار اولیا نے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے لیکن صنف نازک میں رابعہ بصری ؒ نے جس طرح اس معبود برحق کی عبادت و ریاضت کا حق ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اللہ کی پاک ذات پر توکل نے آپ کو جو بلند مقام عطا کیا اس کا تصور ایک عام انسان کی سوچ سے باہر ہے۔

رابعہ بصری کی کرامات و مشاہدات پر مبنی حیرت انگیز تحریر

تسلیم و رضا کا پیکر

ضیا تسنیم بلگرامی



79 ہجری کی ایک تاریک رات میں بصرہ کے ایک غریب گھر میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تین بچیاں برابر برابر لیٹی ہوئی گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ ان کا باپ اسماعیل اپنی بیوی کے پاس کھڑا بڑی بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے۔ گھر میں نہ تو تیل تھا کہ چراغ جلایا جا سکتا اور نہ ہی کوئی اور چیز کہ تیل کی جگہ اس سے کام لے لیا جاتا۔

بیوی کا درد کے مارے بڑا برا حال تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''اسماعیل! اگر تم دایہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو نہ سہی لیکن کسی طرح کہیں سے کچھ تیل ہی مانگ لاؤ کہ اندھیرا تو دور ہو۔ مجھے تو اس اندھیرے میں بڑی وحشت ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں میں زندہ

بھی رہوں گی یا مر جاؤں گی۔''

شوہر نے حسرت سے کہا۔ ''گھبراؤ مت، خدا بڑا مہربان اور رحم والا ہے، وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔''

بیوی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم پڑوس سے تیل مانگ کر نہیں لا سکتے؟''

شوہر نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ ''مانگ کر تو لا سکتا ہوں لیکن رات زیادہ ہو چکی ہے، میرا خیال ہے پڑوسی بھی سو گئے ہوں گے۔''

بیوی کا تکلیف سے برا حال تھا۔ منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اسماعیل! مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں مر جاؤں گی۔'' اس کے بعد اپنی سوتی ہوئی بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے بعد ان کا کیا ہوگا؟''

شوہر نے جواب دیا۔ ''خدا بڑا کارساز ہے، یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں ہیں۔ تم مت گھبراؤ اور اپنے خدا پر یقین رکھو اور پھر ایسے معاملات پر غور کرنے سے کیا حاصل جو ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔''

بیوی نے درد و اذیت سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، بولی۔ ''لیکن سوچ پر قفل ڈال دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں یہ سب کچھ خود بخود سوچنے پر مجبور ہوں۔ میں جاندار ہوں، پتھر نہیں ہوں جو بے جان اور بے حس ہوتا ہے۔''

درد کی ایک لہر نے بیوی کو بے ہوش سا کر دیا، بڑی بے بسی سے کہا۔ ''خدا کے لیے ذرا سے تیل کا انتظام کرو، میرا اس تاریکی میں دم گھٹ رہا ہے۔''

اسماعیل نے بے دلی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں کوشش کرتا ہوں، شاید کام بن جائے۔''

وہ دردِ زہ میں تڑپتی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر باہر چلا گیا اور ایک پڑوسی کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف سکوت اور خاموشی کا عالم طاری تھا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ اسماعیل کا دل بھر آیا۔ اس نے اپنے رب سے عرض کیا۔ ''خدایا! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے آج تک کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ آج میری بیوی کا دردِ زہ سے بہت برا حال ہے۔ گھر میں ذرا سا تیل بھی نہیں کہ روشنی کی جا سکے۔ بیوی مصر ہے کہ میں کسی پڑوسی کے سامنے دستِ سوال دراز کروں لیکن تو میرے استغنا اور میری قانع اور راضی بہ رضا طبیعت سے خوب واقف ہے۔ تو ہی بتا میں کسی سے کچھ کس طرح مانگ سکتا ہوں۔ اے اللہ! تو میری اور میری بیوی کی مشکل دستِ طلب دراز کرائے بغیر ہی حل کرا دے۔''

اسماعیل دروازے پر دستک دیے بغیر ہی واپس آ گیا اور بیوی سے کہا۔ ''افسوس کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پر دستک دے کر ذرا سا تیل مانگ لوں لیکن ہمت نہ پڑی۔''

اب بیوی کا درد سے بہت برا حال تھا، کراہتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے۔ میں صبر و شکر سے کام لوں گی، اے کاش! اس بار لڑکا ہو کیونکہ تین لڑکیاں تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔''

کچھ دیر بعد کسی دایہ کے بغیر ہی ایک نیا وجود دنیا میں آ گیا۔ بچے کے رونے کی آواز نے اسماعیل کو خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ بیوی پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ خدا جو مہربان اور رحیم بھی ہے، اس نے ان دونوں پر رحم کیا تھا۔ اسماعیل ذرا سہما بیوی کی طرف بڑھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ یہ نیا وجود لڑکی ہے یا لڑکا اور جب یہ معلوم ہوا کہ پیدا ہونے والی لڑکی ہے تو اسماعیل کو چکر سا آ گیا۔

بیوی نے نحیف آواز میں پوچھا۔ ''کیا ہے؟ لڑکی یا لڑکا؟''

اسماعیل نے آواز میں خوشی اور طمانیت کا تاثر بھرنا چاہا اور جواب دیا۔ ''لڑکی۔''

بیوی نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی، کہا۔ ''میں لڑکی کو ناپسند تو نہیں کرتی۔ یہ بھی خدا کی دین ہے، اس نے جو کچھ دے دیا میں اس پر اس کی شکر گزار ہوں۔''

یہ لڑکی چونکہ تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لیے اسماعیل نے اس کا نام رابعہؒ (چوتھی) رکھ دیا۔

اسماعیل نے خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہیں اور اسماعیل سے کہہ رہے ہیں۔ ''اسماعیل! مت پریشان ہو، تیری یہ بچی جس کا تو نے رابعہؒ نام رکھا ہے، بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی اور اس کی شفاعت سے ایک ہزار افراد بخشے جائیں گے۔''

اسماعیل نے کہا۔ ''یا رسول اللہ! عسرت اور تنگ دستی نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر رکھا ہے اور میں کسی کے آگے دستِ طلب بھی نہیں دراز کر سکتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا۔ ”تو والیِ بصرہ کے پاس یہ تحریر لے کر چلا جا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے تو ہر روز مجھ پر ایک سو بار درود بھیجتا ہے اور جمعے کی شب چار سو بار۔ لیکن آج جمعے کی شب تو درود بھیجنا بھول گیا ہے لہٰذا کفارے کے طور پر حاملِ ہٰذا کو چار سو دینار دے دے۔“

بیداری کے بعد اسماعیل پر رقت طاری ہوگئی، دیر تک رونے کے بعد رسول ﷺ اللہ کی ہدایت پر اس نے والیِ بصرہ کے نام وہ تحریر لکھ دی اور والیِ بصرہ کے دربان کے حوالے کر دیا۔ پرچہ کا اندر پہنچنا تھا کہ والیِ بصرہ کے قصر میں زلزلہ سا آگیا۔ اس نے حکم دیا۔

”حضورِ اکرم ﷺ کی یاد آوری کے شکرانے میں دس ہزار دینار اسی وقت فقرا میں تقسیم کر دیے جائیں اور چار سو دینار اس شخص کو دے دیے جائیں جو یہ تحریر لے کر آیا ہے۔“

اس کے بعد والیِ بصرہ، اسماعیل کی خدمت میں خود بھی حاضر ہوا اور انتہائی لجاجت سے کہا۔ ”آپ کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے، بے تکلف مجھ سے مانگ لیا کریں۔ آپ کی ضرورت پوری ہو جایا کرے گی۔“

لیکن غیرت مند اسماعیل کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ وہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے لیے والیِ بصرہ کو تنگ کرتے رہتے۔

☆☆☆

رابعہؒ اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ پرورش ہوتی رہی۔ غیرت مند باپ نہایت عسرت اور پریشانی سے ان کی پرورش کرتا رہا لیکن ایک شام اسماعیل کو ایک چونکا دینے والے واقعے سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک ہی دسترخوان پر پورا کنبہ بیٹھا تھا۔ ہر کوئی تیزی سے کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا لیکن رابعہؒ خاموش بیٹھی کھانے والوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ باپ بڑی حیرت سے رابعہؒ کی اس کیفیت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ باپ کے علاوہ کسی کو بھی اس کی فکر نہ تھی کہ رابعہؒ کھانے میں ان کا ساتھ کیوں نہیں دے رہی ہے۔

باپ سے نہیں رہا گیا نہایت شفقت سے پوچھا۔ ”رابعہؒ بیٹی!“

رابعہؒ نے چونک کر جواب دیا۔ ”جی بابا جان! کیا بات ہے؟“

باپ نے پوچھا۔ ”تو کھانا کیوں نہیں کھا رہی!“

رابعہؒ نے غمزدہ آواز میں جواب دیا۔ ”بابا جان! میں سوچتی ہوں کہ خدا جانے یہ کھانا حلال ہے یا مشتبہ؟“

باپ نے بڑے دکھ سے بیٹی کی طرف دیکھا، کہا۔ ”بیٹی رابعہ! ایک بات تو خود تو نے بھی محسوس کی ہوگی کہ میں نے ہمیشہ حرام حلال کا ضرور خیال رکھا ہے۔ اگر میں کبھی حلال رزق سے محروم رہا ہوں تو میں نے حرام کھانے پر فاقے کو ترجیح دی ہے۔“

رابعہؒ نے کہا۔ ”لیکن بابا جان! میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں بھوک پر صبر کر لینا چاہیے، یہ اس لیے کہ ہمیں آخرت میں آگ پر نہ صبر کرنا پڑے۔“

پھر ایسا ہوا کہ باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا، ماں بھی چل بسی۔ اب چاروں بہنیں ایک ساتھ رہ رہی تھیں۔

ان دنوں بصرے پر قحط کا عذاب نازل ہوا۔ لوگ رزق کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ دوستوں نے دوستوں کو پہچاننا چھوڑ دیا۔ خونی رشتے اپنا پاس و لحاظ ختم کر بیٹھے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم تھا۔ رابعہؒ کی تینوں بہنیں رابعہ کو چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں چلی گئیں۔ رابعہؒ پریشان ہو کر ادھر ادھر رہنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگیں۔ یہ کسی سہارے کی تلاش میں بصرے کے اس حصے کی طرف چل پڑیں جہاں متمول خاندان رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ پر ایک شخص نے انہیں روک لیا اور پوچھا۔ ”لڑکی! تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”دونوں فوت ہو چکے۔“

اس شخص نے قہقہہ لگایا، بولا۔ ”خوب! اب تیرا سرپرست کون ہے؟“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”اللہ...... جو ہم سب کا سرپرست ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو تجھے کسی سے ڈرنا بھی نہیں چاہیے۔ آ تو میرے ساتھ چل۔“

رابعہؒ نے پوچھا۔ ”کہاں؟ تو مجھے کہاں لے جائے گا؟“

آدمی نے جواب دیا۔ ”لڑکی! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی بہت بھوکا ہوں۔ کئی وقت سے کچھ بھی نہیں کھایا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بھوک کے مسئلے کو کس طرح حل کروں گا لیکن ابھی ابھی جیسا کہ تو نے مجھے بتایا تھا کہ ہم سب کا سرپرست خدا ہے، میں تیری ذہانت اور حاضر جوابی کا قائل ہو گیا۔ اس نے تجھے بھیج کر میری بھوک کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ بڑا کارساز اور مہربان ہے۔“

اس نے رابعہ کو پکڑ لیا اور ایک دوسرے شخص کے ہاتھ بیچ دیا۔ خریدنے والے نے چند دن رابعہؒ سے خدمت لی اور اس کے بعد

اچھی قیمت پر کسی دوسرے کے حوالے کر دیا۔ اس نئے خریدار نے رابعہؒ سے بڑی بے دردی سے کام لینا شروع کر دیا۔ بازار کے سودے کی خریداری سے لے کر گھر کے کام کاج تک، ہر کام رابعہؒ کو انجام دینا پڑتا۔

ایک دن آپ بازار سے سودا خرید کر لا رہی تھیں کہ کسی اوباش نے آپ کا پیچھا کیا۔ آپ اس سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں لیکن اس شاطر نے بھی آپ کا پیچھا کیا۔ آخر اس شخص نے آپ کو گھیر ہی لیا۔ آپ نے اس کے گھیراؤ سے نکلنے کی کوشش کی تو اتنے زور سے گریں کہ ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ راہ گیروں نے آپ کی مدد کی اور انہیں گھر پہنچا دیا۔ رابعہؒ کے مالک کو کچھ علم نہ تھا کہ رابعہؒ کا ہاتھ ٹوٹ چکا ہے۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ سجدے میں گر گئیں اور خدا سے عرض کیا۔ ''اے اللہ! میں... بے یار و مددگار تو پہلے ہی تھی، اب ایک ہاتھ بھی ٹوٹ گیا لیکن میں پھر بھی تیری رضا چاہتی ہوں۔ تو مجھے جس حال میں چاہے رکھ، میں تجھ سے گلہ نہیں کروں گی۔''

رابعہؒ نے جواب میں ایک پُراسراری آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ''رابعہؒ! غمگین نہ ہو کل تجھے وہ مرتبہ ملنے والا ہے کہ مقرب ملائکہ بھی تجھ پر رشک کرنے لگیں گے۔''

رابعہؒ نے سکوت اختیار کیا اور بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی گلہ و شکوہ نہ کرنے کا عہد کر لیا۔

یہ دن میں روزے رکھتیں اور رات بھر عبادت میں مشغول رہتیں۔ ان کے مالک کو رابعہؒ کے مرتبے کا ابھی تک کوئی علم نہ تھا۔

ایک رات ان کے مالک کی نصف شب کو آنکھ کھل گئی۔ رابعہؒ کے بستر پر جو نظر کی تو وہ خالی نظر آیا۔ وہ حیران ہو کر اٹھ بیٹھا اور رابعہؒ کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے آپ کو ایک کونے میں نماز پڑھتے دیکھا۔ اس وقت وہ سجدے میں پڑی تھیں اور ان کے سر پر نور کا ایک گول دائرہ ہالہ کیے ہوئے تھا۔ رابعہؒ سسک سسک کر کہہ رہی تھیں۔ ''خدایا! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں چوبیس گھنٹے تیری عبادت میں گزار دیتی لیکن تو ہی بتا میں کیا کروں۔ تو نے خود ہی تو مجھے غیر کا محکوم بنا دیا ہے۔ غیر کی اسی محکومی نے مجھے مجبور کر رکھا ہے کہ میں تیرے دربار میں دیر سے حاضری دوں۔''

رابعہؒ کا مالک حیران رہ گیا۔ اس وقت تو وہ چپ چاپ واپس اپنے بستر پر واپس گیا لیکن اب اس کی نیند اڑ چکی تھی، وہ پوری رات جاگتا رہا۔ علی الصباح رابعہؒ کے پاس پہنچا اور ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا، ادب سے کہنے لگا۔ ''رابعہؒ! مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تیرے مرتبے سے لاعلم تھا لیکن رات میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے تو تجھ سے اپنی خدمت لینے کے بجائے تیری خدمت کرنا چاہیے تھی۔ میں کتنا نالائق اور اندھا ہوں جو تجھے پہچان نہ سکا۔ اب میں اس کا اسی طرح کفارہ ادا کر سکتا ہوں کہ یا تو آپ بدستور اسی گھر میں رہیں اور میں آپ کی خدمت کروں اور اگر کسی طرح آپ کو میری یہ بات منظور نہ ہو تو میری طرف سے آپ آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلی جائیں۔''

رابعہؒ مدتوں پنجرے میں بند رہنے والے پرندے کی طرح عجلت میں باہر نکلیں اور ان مجلسوں کا رخ کیا جہاں اس عہد کے صوفیائے کرام وعظ و تلقین فرمایا کرتے تھے۔ انہی میں خواجہ خواجگان حسن بصریؒ بھی شامل تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی ریاضت اور ذہانت کے چرچے ہونے لگے۔ اس عہد کے نامی گرامی صوفی بھی ان پر رشک کرنے لگے۔

رات کے سناٹے میں وہ چھت پر چڑھ جاتیں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے کہتیں۔ ''خدایا! رات نے پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ زمانہ محوِ خواب ہے، امراء اور بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ حبیب اپنے حبیب سے مجوِ راز و نیاز ہے لیکن میں رابعہ تیرے سامنے کھڑی ہوں اور تیری محبت کی آگ میں جل رہی ہوں۔''

آپ نے یہاں تک شہرت حاصل کر لی کہ بصرہ کے نامی گرامی حضرات ان سے شادی کی درخواست کرنے لگے۔ خدا نے حسن و جمال بھی ایسا دیا تھا کہ جو دیکھتا شادی کی توقعات وابستہ کر لیتا۔

ایک دن صبح ہی صبح والیِ بصرہ محمد بن سلیمان ہاشمی کی سواری رابعہؒ کے دروازے پر رکی۔ گلی میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ رابعہؒ کے گھر کی طرف رشک و حسد سے دیکھنے لگے۔ والیِ بصرہ کے غلام نے رابعہؒ کے در پر دستک دی۔ جب رابعہؒ نے دروازے کی آڑ سے پوچھا کہ تو میرے پاس کس لیے آیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا۔ ''رابعہؒ! میں والیِ بصرہ محمد بن سلیمان ہاشمی ہوں۔ لوگ صبح سے شام تک میرے در پر درخواستیں پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اتفاق تو دیکھ، آج میں خود تجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''اے والیِ بصرہ! تو کتنا نادان اور احمق ہے کہ اپنی درخواست اللہ کے پاس لے جانے کے بجائے میرے پاس لے آیا۔''

والیِ بصرہ نے کہا۔ ''رابعہؒ! میری آمدنی دس ہزار درہم ماہانہ ہے، میں یہ ساری کی ساری تمہیں دے دیا کروں گا۔''

رابعہؒ نے پوچھا۔ ”اور اس کے عوض تو مجھ سے کیا چاہے گا؟“

والیٔ بصرہ نے جواب دیا۔ ”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

رابعہؒ نے کہا۔ ”اے بصرہ کے حاکم! جب تک تو دنیا سے رغبت رکھے گا، پریشان رہے گا۔ یاد رکھ بے رغبتی اور زہد، دنیا میں باعثِ راحت ہیں، رغبت رنج و ملال پیدا کرتی ہے۔ تو اپنے لیے توشۂ آخرت تیار رکھ اور اسے آگے روانہ کر دے۔ اپنا وارث تو خود بن، دوسروں کو تو اپنا والی وارث ہرگز نہ بنا۔ ورنہ وہ تیرا ترکہ آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ ہمیشہ روزے رکھا کر اور دل میں اس خیال کو مستقل کرلے کہ گویا تو ابھی پیدا ہوا ہے۔ اور رہا میرا معاملہ تو اگر خدا مجھے تیری پیشکش سے زیادہ دے دے، تب بھی میرا دل خوش نہ ہوگا کیونکہ میں اپنے اللہ سے ایک گھڑی بھی غافل رہنا نہیں چاہتی۔“

والیٔ بصرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

آپ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہو گئیں۔ ایک گدھا آپ کے ساتھ تھا۔ اس پر آپ کا سامان لدا ہوا تھا۔ اس قافلے نے ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالا اور آپ عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئیں۔ رابعہؒ کا گدھا بہت کمزور تھا، مر گیا، قافلے والوں کو آپ سے ہمدردی تھی، کہا۔ ”رابعہؒ! تم فکرمند نہ ہونا۔ ہم لوگ تمہارا سامان اپنے مویشیوں پر لاد لیں گے۔“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”خوب! کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں نے یہ سفر تمہارے سہارے کے پیشِ نظر کیا ہے؟ اگر تم لوگوں نے میرا ساتھ دیا بھی تو میں اسے قبول نہیں کروں گی۔ میں اسی کا سہارا قبول کروں گی جس کے علاوہ دوسرا کوئی سہارا نہیں۔“

قافلے والے تنگ آکر، انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ رابعہؒ اپنے گدھے کے پاس پہنچیں اور خدا سے کہنا شروع کیا۔ ”خدایا! کسی نادار اور عاجز کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے کہ پہلے تو اسے اپنے گھر کی طرف رجوع کیا، پھر راستے ہی میں میرے گدھے کو ہلاک کر دیا اور مجھے جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔“

ابھی آپ کے کلمات پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ گدھے میں حرکت ہوئی۔ وہ ایڑیاں رگڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اپنا سامان اس پر لادا اور مکے کی طرف چل پڑیں۔

جب آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئیں تو وہاں ٹھہر گئیں۔ ایک ویرانے میں نکل گئیں اور خدا سے کہنا شروع کیا۔ ”خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میری تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور کعبہ بھی پتھر سے بنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں تجھ سے کسی ذریعے سے ملوں۔ تو میرے اور اپنے درمیان سے کعبے کو نکال دے۔ میں تجھ سے براہِ راست ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔“

انہیں جواب ملا۔ ”رابعہؒ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جب موسیٰؑ نے دیدار کی خواہش کی تھی اور ہم نے اپنی تجلیات میں سے ایک چھوٹی سی تجلی کوہِ طور پر ڈال دی تھی تو وہ اس سے جل کر خاک ہو گیا تھا۔ یہ سب جاننے کے باوجود تو براہِ راست ملاقات کی خواہش مند ہے؟“

اس کے ایک عرصے بعد آپ دوبارہ حج کرنے پہنچیں تو آپ نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ ”دھواں دھواں خانۂ کعبہ“ ان کے استقبال کی خاطر بڑھا چلا آرہا ہے۔

آپ نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور کہا۔ ”تو واپس جا، مجھے مکان کی نہیں مکین کی ضرورت ہے۔“

انہی دنوں کی بات ہے کہ بلخ کے مشہور حکمران، جو بعد میں صوفی ہو گئے تھے، ابراہیم ادہمؒ حج کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خانۂ کعبہ کو دیکھا تو وہ غائب دکھائی دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیر تک دیکھتے رہے لیکن انہیں وہ نظر نہ آیا۔ ابراہیم ادہم کو یہ شبہ گزرا کہ ان کی بصارت زائل ہو چکی ہے۔ وہ رونے لگے لیکن اسی وقت انہیں ایک آواز نے مطلع کیا۔ ”ابراہیمؒ! تیری بصارت موجود ہے۔ وہ زائل نہیں ہوئی۔ کعبہ تو رابعہؒ کے استقبال کو گیا ہوا ہے۔“

ابراہیم ادہمؒ نے حیرت سے سوال کیا۔ ”خدایا! یہ کون سی برگزیدہ ہستی ہے جس کے استقبال کو کعبہ چلا گیا۔“

جواب ملا۔ ”ابراہیمؒ! وہ بہت ہی قابلِ احترام ہستی ہے۔“ پھر کچھ توقف کے بعد حکم دیا گیا۔ ”ابراہیمؒ! اپنے داہنی طرف مڑ کر دیکھ، رابعہ آرہی ہے۔“

ابراہیمؒ نے رابعہ کو دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ ابراہیمؒ نے رابعہؒ سے کہا۔ ”رابعہؒ! آخر کو تم نے نظامِ عالم کو درہم برہم کیوں کر رکھا ہے۔ کعبہ تمہارے استقبال کی خاطر اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”ابراہیمؒ! ہنگامہ میں نے نہیں، تم نے کھڑا کیا ہے۔ تم نے ہر گام پر دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے خانۂ کعبہ تک پہنچنے میں چودہ سال ضائع کر دیے، یہ فضول سی بات ہے۔“

ابراہیمؒ نے کہا۔ ”میں نے ہر قدم پر دو رکعت نفل ادا کی ہیں، اسی لیے اتنی دیر سے پہنچا ہوں۔“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”ابراہیمؒ! ہم دونوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ تم تو نمازیں پڑھ پڑھ کر یہاں تک پہنچے ہو اور میں نے اس فاصلے کو عجز و انکسار سے طے کیا ہے۔“

ابراہیمؒ خاموش ہوگئے۔

رابعہؒ نے حج کرنے کے بعد خدا سے کہا۔ ”خدایا! تو نے حج پر بھی اجر مقرر فرمایا ہے اور مصیبت پر صبر کرنے کی تلقین کی ہے لہٰذا میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ اگر تو میرا حج قبول نہیں فرماتا تو مصیبت پر صبر کرنے کا اجر ہی عطا فرما دے کیونکہ حج کی عدم قبولیت سے بڑھ کر اور کون سی مصیبت ہوسکتی ہے۔“

حج سے فراغت حاصل کر کے آپ بصرہ... واپس چلی گئیں۔

☆☆☆

دو بھوکے آپس میں باتیں کرتے ہوئے رابعہؒ کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ”بھائی میں نے رابعہؒ کے زہد و عرفان کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ آؤ آج اس کا امتحان ہی کرلیں۔“

دوسرے نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

پہلے نے کہا۔ ”غالباً میری طرح تم بھی بھوک کی آگ محسوس کر رہے ہوگے؟“

دوسرے نے جواب دیا۔ ”ہاں، بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔“

پہلے نے کہا۔ ”ہم دونوں رابعہؒ کے پاس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کچھ بتائے بغیر ہی ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ اس طرح ہم اس کے کشف اور علم کا امتحان بھی لے لیں گے۔“

دونوں بھوکے رابعہؒ کے در پر پہنچے اور زور زور سے دستک دینے لگے۔ رابعہؒ نے دروازے کے پاس آ کر تسلی دی، کہا۔ ”پریشان مت ہو، میں تم دونوں کو ابھی شکم سیر کرتی ہوں۔ افسوس کہ تم لوگ ذرا دیر میں پہنچے ہو۔“

دونوں بھوکے حیرت سے رابعہؒ کی آواز سنتے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

رابعہؒ نے ان دونوں کو اپنے اندرونی کمرے میں بٹھایا اور ان کے سامنے دو روٹیاں رکھ دیں کہ...... ”کھاؤ اور اپنے رب کا شکر ادا کرو۔“ ابھی یہ دونوں کھانا شروع بھی نہ کرسکے تھے کہ کسی سائل نے آواز لگائی۔ ”بی بی! خدا بھلا کرے اور تجھے سب سے زیادہ دے۔“

رابعہؒ نے دونوں بھوکوں کے سامنے سے روٹیاں اٹھالیں اور انہیں درویش کے حوالے کردیا۔ دونوں بھوکوں کو رابعہؒ کی یہ حرکت بری لگی۔ ابھی ان دونوں کے دلوں کا تکدر دور بھی نہ ہوا تھا کہ ایک کنیز آگئی۔ اس کے کاندھے پر روٹیوں کا خوان رکھا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی رابعہؒ سے کہا۔ ”حضور! یہ روٹیاں میری مالکہ نے آپ کو بھیجی ہیں۔“

دونوں بھوکے بے صبری سے ان گرم گرم روٹیوں کو دیکھنے لگے۔

رابعہؒ نے پوچھا۔ ”یہ کتنی روٹیاں ہیں۔“

کنیز نے جواب دیا۔ ”اٹھارہ روٹیاں۔“

رابعہؒ نے فوراً کہا۔ ”ان روٹیوں کو واپس لے جا، یہ کسی اور کو بھیجی گئی ہوں گی۔“

بھوکے پریشان ہوگئے۔ ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔ ”میاں! یہ عجیب و غریب عورت ہے، اسے بھوک یا کھانے کی کوئی پروا ہی نہیں۔“

دوسرے نے جواب میں کہا۔ ”اگر اسے کھانے کی پروا نہیں ہے، تو اس کو ہماری بھوک کا تو کچھ خیال کرنا چاہیے۔“

کنیز اپنے کاندھے پر روٹیاں لیے بدستور کھڑی تھی، اس نے رابعہؒ سے کہا۔ ”حضور! یہ روٹیاں آپ ہی کو بھیجی گئی ہیں آپ یقین تو کریں۔“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”کنیز میرا خدا منصف ہے اور اپنے قول کا پکا اور سچا ہے۔ تو میری بات مان لے۔ یہ روٹیاں کسی اور کے لیے بھیجی گئی ہیں تو انہیں اپنی مالکہ کے پاس واپس لے جا اور میں نے جو کچھ کہا ہے ان کے گوش گزار کردے۔“

کنیز روٹیوں سمیت واپس چلی گئی۔ اس نے رابعہؒ کی گفتگو سے اپنی مالکہ کو مطلع کیا تو اس نے ایک لمحہ بھی تامل میں ضائع نہیں کیا۔ کنیز سے کہا۔ ”تو اپنی روٹیوں میں دو کا اضافہ کر کے پھر لے جا اور رابعہؒ سے کہہ دے کہ یہ روٹیاں تمہارے ہی پاس بھیجی گئی ہیں۔ انہیں قبول فرمالیں اور ہمیں شرمندہ نہ کریں۔“

کنیز روٹیاں لے کر دوبارہ پھر پہنچ گئی، رابعہؒ نے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”تو اب کیوں آئی ہے؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ''میں نے مالکہ سے بات کی تھی، وہ کہتی تھیں کہ یہ روٹیاں آپ ہی کو بھیجی گئی تھیں۔ میری مالکہ نے اس میں دو روٹیاں اور شامل کرادی ہیں۔''

آپ نے برجستہ کہا۔ ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خدا اپنے قول کا پکا اور سچا ہے۔''

کنیز چلی گئی اور رابعہؒ نے دونوں بھوکوں سے کہا۔ ''اب تم کھا سکتے ہو۔''

دونوں کھانے پر ٹوٹ کے گرے، خوب شکم سیر ہوکر کھایا لیکن ان کے سامنے جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ ایک معما تھا اور دونوں اس معمے کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش میں لگے تھے لیکن جب عاجز آگئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مجبوراً رابعہؒ سے دریافت کیا۔ ''بی بی! ہم دونوں نے خوب سیر ہوکر کھانا کھالیا، طبیعت سیر ہوگئی لیکن یہ معاملات اپنی سمجھ میں نہیں آئے۔''

رابعہؒ نے دریافت کیا۔ ''کون سے معاملات؟''

دونوں میں سے ایک نے کہا۔ ''پہلے آپ نے ہمارے سامنے دو روٹیاں رکھی تھیں، پھر سائل کی آواز پر دونوں روٹیاں اس کے حوالے کردیں اور جب ذرا دیر بعد ایک کنیز اٹھارہ روٹیاں لے کر آئی تو آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کردیا کہ یہ روٹیاں آپ کو نہیں کسی اور کو بھیجی گئی ہیں لیکن جب ان میں دو کا اضافہ کردیا گیا تو آپ نے انہیں قبول کرلیا۔ یہ سب کیا تھا؟ ہم اس معمے کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''جب تم دونوں میرے پاس آئے تھے تو میں نے ایک نظر میں معلوم کرلیا تھا کہ تم دونوں بہت بھوکے ہو۔ میں نے دو روٹیاں تم دونوں کے آگے رکھ دیں کیونکہ گھر میں موجود ہی دو روٹیاں تھیں لیکن اس دوران سائل آگیا تو میں نے وہ دونوں روٹیاں تمہارے سامنے سے اٹھا کر سائل کو دے دیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ خدا نے انسان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ایک کی جگہ دس دے گا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے عرض کیا کہ خدایا! جب تو نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ایک کی جگہ دس دے گا تو یہ ایک کی جگہ نو کیوں، تیرا وعدہ غلط تو نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ تم دونوں نے دیکھ لیا کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کردیا اور دو کی جگہ بیس روٹیاں مرحمت فرمادیں۔''

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر تک آپ نے شدید ریاضت کی، اعصاب آرام کرنے کے خواہش مند تھے۔ آپ جس جگہ مصروف عبادت تھیں، اس سے ذرا ہٹ کر لیٹ گئیں۔ تھکے ہوئے اعضا عالم خواب میں چلے گئے۔ اسی وقت ایک چور آپ کے حجرے میں داخل ہوا اور آپ کے سرہانے سے چادر اٹھا کر چلنے لگا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی بینائی رخصت ہوچکی ہے۔ وہ ادھر اُدھر بھٹکتا رہا، اسے باہر نکلنے کے لیے دروازہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر اسے ڈر لگا کہ کہیں رابعہؒ کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ پکڑا جائے۔ اس نے چادر جس جگہ سے اٹھائی تھی وہیں رکھ دی۔ چادر کے رکھتے ہی بینائی بحال ہوگئی۔ بینائی کا واپس آنا تھا کہ حرص نے پھر زور کیا۔ اس نے چادر دوبارہ اٹھائی اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ بینائی پھر جاتی رہی اور وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس نے چادر پھر رکھ دی اور چادر رکھتے ہی بینائی پھر واپس آگئی۔ اسی حالت میں رابعہؒ کی آنکھ کھل گئی۔ حجرے میں چور کو دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہ ہوئیں، پوچھا۔ ''تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

چور نے جواب دیا۔ ''بی بی! میں آپ سے کیا چھپاؤں، میں چور ہوں اور کافی دیر سے ایک ناقابل فہم چکر میں مبتلا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کس چکر میں؟''

چور نے پوری روداد سنادی، آخر میں کہا۔ ''اب میں جب بھی چادر اٹھاتا ہوں، اپنی بینائی کھو دیتا ہوں اور جب چادر رکھ دیتا ہوں تو میری بینائی واپس آجاتی ہے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''تو خود کو کسی آفت میں مبتلا کیوں کرنا چاہتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں نے برسوں سے خود کو خدا کے حوالے کردیا ہے اور اب عالم یہ ہے کہ میرے پاس شیطان تک نہیں پھٹکتا، پھر تیری کیا مجال ہے کہ چوری کرسکے۔ میں اس حقیقت پر یقین رکھتی ہوں کہ اگرچہ میں سو جاتی ہوں لیکن میرا دوست، میرا خدا ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔''

چور آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ چوری کی عادت چھوڑ دی اور یادالٰہی میں مشغول ہوگیا۔

ایک دن رابعہؒ ایک پہاڑی پر تشریف لے گئیں۔ تمام صحرائی جانوروں نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سب آپ سے بے حد مانوس نظر آتے تھے۔ اسی دوران میں ایک دوسرے مشہور زمانہ صوفی اور رابعہؒ کے ہم وطن حسن بصریؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پہنچتے ہی تمام جانور ادھر ادھر بھاگ کر روپوش ہوگئے۔ حسن بصریؒ یہ منظر دیکھتے رہے، آخر تعجب سے پوچھا۔ ''رابعہ! یہ معاملہ کیا ہے، جانور مجھے دیکھتے ہی فرار کیوں ہوگئے؟''

رابعہؒ نے پوچھا۔ ''آج آپ نے کھانے میں کیا کھایا ہے؟''

حسن بصریؒ نے جواب دیا۔ ''گوشت اور روٹی۔''

رابعہؒ نے کہا۔ ''جب آپ ان کا گوشت کھائیں گے تو یہ آپ سے کس طرح مانوس ہوں گے؟''

حسن بصریؒ حیرت زدہ سے دیکھتے رہ گئے۔

گھر میں کھانے کی چیزیں تو موجود تھیں لیکن رابعہؒ کئی دن کی بھوکی تھیں۔ گھر میں آپ کی ایک ارادت مند خادمہ کی طرح کام میں لگی رہتی تھی۔ اس نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا، کھانا پکانے کے دوران گھر میں اسے پیاز نہیں ملی، رابعہؒ سے کہا۔ ''بی بی! اگر آپ اجازت دیں تو میں پڑوس سے پیاز مانگ لاؤں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بغیر پیاز ہی کے کھا لوں گی۔''

ہانڈی چولہے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس میں سے لذیذ خوشبو نکل کر ناک کی راہ سے دل و دماغ کو بے چین کر رہی تھی۔ اسی وقت ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور کھلی ہوئی ہانڈی پر منڈلانے لگا۔ اس کی چونچ میں کوئی سفید چیز دبی ہوئی تھی۔ پھر وہ اس سفید چیز کو ہانڈی میں گرا کر چلا گیا۔ رابعہؒ نے اپنی ارادت مند سے کہا۔ ''دیکھنا تو یہ پرندہ ہانڈی میں کیا گرا گیا ہے؟''

اس نے ہانڈی سے وہ چیز نکال لی اور مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، بولی۔ ''بی بی! یہ پیاز ہے۔ آپ نے مانگنے سے منع کیا تھا۔ خدا نے اس پرندے کے ذریعے آپ کا بھرم رکھ لیا اور اس طرح پیاز بھیج دی۔''

آپ نے کہا۔ ''لیکن میں اس ہانڈی کا سالن چکھوں گی بھی نہیں۔ میں اسے نہیں کھا سکتی۔''

خادمہ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ اس ہانڈی میں کیا خرابی پیدا ہو گئی؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''پرندے کی جس حرکت کو تو اشارۂ خداوندی قرار دے رہی ہے، یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ فریب شیطانی ہو۔'' اور آپ نے اس ہانڈی کا سالن چکھا تک نہیں۔

رابعہ بصری فرات کے ساحل پر کھڑی تھیں، مصلیٰ ان کی بغل میں تھا۔ اتفاق سے حسن بصریؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ دونوں کا آمنا سامنا جو ہوا تو حسن بصریؒ نے کہا۔ ''آیئے، ہم دونوں نماز ادا کر لیں۔''

یہ کہہ کر حسن بصریؒ نے فرات کے پانی پر اپنا مصلیٰ بچھا دیا۔

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''حسنؒ! اگر تمہارا یہ فعل مخلوق کی نمائش کے لیے ہے تو بہت خوب ہے مگر دوسرے لوگ ایسا نہیں کر سکیں گے۔'' اس کے بعد رابعہؒ نے اپنا مصلیٰ ہوا میں بچھا دیا، بولیں۔ ''وہاں نہیں، یہاں ہوا کے دوش پر آ جاؤ، ہم دونوں ایک ساتھ نماز پڑھ لیں۔''

حسن بصریؒ نے تعجب سے کہا۔ ''یہ کیا ہے رابعہ؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''ہوا کے دوش پر نماز پڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں اس طرح نماز پڑھتے کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔''

حسن بصریؒ رابعہؒ کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

رابعہؒ نے کہا۔ ''آپ میری شکل کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے جو فعل انجام دیا تھا وہ تو پانی کی معمولی مچھلیاں بھی انجام دے سکتی ہیں اور جو میں نے کیا، اسے ایک حقیر مکھی بھی کر سکتی ہے لیکن یہ دونوں ہی فضول باتیں ہیں۔''

لوگ آپ سے طرح طرح کے سوال کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے پوچھا۔ ''رابعہؒ! تم کہاں سے آئی ہو اور کہاں جاؤ گی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں جس جہان سے آئی ہوں، وہیں واپس چلی جاؤں گی۔''

پھر سوال کیا گیا۔ ''اس جہان میں آپ کا کیا کام ہے؟''

جواب دیا۔ ''کفِ افسوس ملنا۔''

سوال کیا گیا۔ ''کفِ افسوس ملنے کی وجہ؟''

جواب دیا۔ ''میں رزق تو اس جہان کا کھاتی ہوں لیکن کام دوسرے جہان کا کرتی ہوں۔''

سوال کرنے والے نے کہا۔ ''رابعہؒ! تمہاری شیریں بیانی اس قابل ہے کہ تمہیں کسی مسافر خانے کا نگران مقرر کر دیا جائے۔''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''میں اپنے مسافر خانے کی خود ہی نگران ہوں اور خود ہی محافظ بھی۔''

پوچھا گیا۔ ''وہ کس طرح؟''

جواب دیا۔ ''جو کچھ میرے اندر ہے باہر نکال دیتی ہوں اور جو باہر ہے، اسے اندر نہیں جانے دیتی۔ اس لیے مجھے کسی کی آمد و رفت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ میں قلب کی نگہبان ہوں، جسدِ خاکی کی نہیں۔''

پھر سوال ہوا۔ ”رابعہؒ! تم ابلیس کو دشمن تصور کرتی ہو یا نہیں؟“
جواب دیا۔ ”میں رحمٰن کی دوستی میں اتنی محو رہتی ہوں کہ ابلیس کی معاندت کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔“

☆☆☆

آپ کو کمبل کی سخت ضرورت تھی۔ اپنے کسی ارادت مند کو چار درہم دیے اور کہا۔ ”میرے لیے ایک کمبل خرید لاؤ۔“
اس شخص نے پوچھا۔ ”کمبل کس رنگ کا آئے گا، سیاہ یا سفید؟“
آپ نے کہا۔ ”میرے درہم واپس کر دو۔“
اس شخص نے درہم واپس کر دیے۔ آپ نے چاروں درہم دریا میں پھینک دیے اور کہا۔ ”ابھی کمبل خریدا بھی نہیں اور سیاہ و سفید کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ خریداری کے بعد پتا نہیں کیا ہو؟“
خادمہ آپ کی باتیں سن رہی تھی، بہار کا موسم تھا۔ ”بی بی! آپ کنج تنہائی سے باہر نکلیں اور دیکھیں کہ فطرت کتنی رنگین ہے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”باہر نکل کر اگر کچھ دیکھا تو اس میں کمال کی کیا بات ہے؟ ادھر آ میرے پاس اور گوشہ نشین ہو کر میری طرح صانع حقیقی کا مشاہدہ کر۔ کیونکہ میں صانع کے نظارے کو صنعت کے نظارے پر ترجیح دیتی ہوں۔“
ایک دن آپ کی مجلس میں ایک دوسرے بزرگ صالح عامریؒ تشریف فرما تھے، کہنے لگے۔ ”رابعہؒ! اگر کسی کا دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جائے تو کسی نہ کسی دن کھل ہی جاتا ہے۔“
رابعہؒ نے غور سے صالح عامریؒ کی شکل دیکھی اور کہا۔ ”دروازہ کھلنے کا کیا مطلب؟ کیونکہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ بند ہی کب ہوا تھا؟“
اس جواب نے صالح عامریؒ کو چپ کرا دیا۔ بولے۔ ”بی بی! مجھے آپ کی دانش مندی پر مسرت اور اپنی کم عقلی پر رنج ہو رہا ہے۔“
ان سے سوال کیا گیا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ خدا بندے سے کس وقت خوش ہوتا ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اس وقت جب بندہ مصیبت پر اس طرح شکر گزار ہوتا ہے جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو۔“
کسی نے پوچھا۔ ”رابعہؒ! خدا عاصی کی توبہ قبول کرتا ہے یا نہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اگر خدا توفیق نہ دے تو کیا کوئی شخص توبہ کر سکتا ہے؟“
جواب ملا۔ ”ہرگز نہیں۔“
آپ نے کہا۔ ”جب یہ طے ہے کہ توفیقِ ایزدی کے بغیر توبہ نہیں کی جا سکتی تو جب خدا نے توفیق دے دی تو پھر توبہ کو قبول بھی فرمائے گا۔“
آپ کا لباس بہت میلا تھا، ایک بزرگ نے آپ سے کہا۔ ”رابعہؒ! آپ کا لباس بہت میلا ہے حالانکہ اگر آپ ذرا سا اشارہ کر دیں تو بصرہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کو نفیس سے نفیس ترین لباس مہیا کر سکتے ہیں۔“
آپ نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں کسی غیر سے کچھ اس لیے نہیں طلب کرتی کہ ایسے مواقع پر میں حیا کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں، دنیا کا مالک تو خدا ہے اور دنیا والوں کو جو کچھ بھی ملا ہے، عاریتاً مستعار ملا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ جب مخلوق کے پاس خود ہی ہر شے عاریتاً ہو تو اس سے طلب کرنا کیا معنی؟ بلکہ ایسا کرنا شرم ناک ہے۔“
آپ کے جواب نے اس بزرگ کو شرمسار کر دیا۔
آپ کے ہاں مجلس جمی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے مباحث چھڑے ہوئے تھے لیکن یہ سارے کے سارے تھے دنیا، آخرت، خدا، رسول ﷺ اور ایسے ہی دیگر موضوعات سے متعلق۔
آپ نے کہا۔ ”لوگو! میں تمہاری عبادت سے ذرا بھی مطمئن نہیں۔“
کسی صوفی نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
آپ نے پوچھا۔ ”تم جو عبادت کرتے ہو، اس کا تمہیں صلہ ملے گا؟ اور اگر نماز نہ پڑھو، عبادت نہ کرو تو اس کی سزا کیا ملے گی؟“
صوفی نے جواب دیا۔ ”اگر ہم عبادت کریں تو اس کے عوض ہمیں جنت ملے گی اور اگر عبادت نہ کریں تو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔“
رابعہؒ نے کہا۔ ”لیکن میں کہتی ہوں کہ اللہ کی عبادت کسی لالچ سے نہیں کرنی چاہیے۔“
ایک دن آپ نے ایک ہاتھ میں آگ لی اور دوسرے میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا اور نہایت جوش و خروش سے چلی جا رہی تھیں۔

کسی نے پوچھا۔ ”رابعہؒ! یہ کیا؟ کہاں جارہی ہو؟“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”اس آگ سے میں جنت کو جلادوں گی اور پانی سے دوزخ کو بجھادوں گی۔“

کسی نے پوچھا۔ ”یہ کیوں؟ ایسا کیوں کروگی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تاکہ لوگ خدا کی عبادت کسی حرص ولالچ کے بغیر کریں۔“

کسی حاسد نے کہا۔ ”رابعہؒ! تم عورت ہو، کچھ بھی ہو تم مردوں کے مقابلے میں فضیلت اور بزرگی حاصل نہیں کرسکتیں۔“

رابعہؒ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

حاسد نے جواب دیا۔ ”اللہ نے خود مرد کو عورت سے افضل بنایا ہے اور ہمیشہ ہی مرد کو رسول یا نبی بنا کر بھیجا ہے اور کسی عورت کو آج تک یہ شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔“

رابعہؒ نے کہا۔ ”تو صحیح کہتا ہے لیکن یہ بھی تو کہہ کہ آج تک کسی بھی عورت نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا حالانکہ مردوں نے اکثر یہ دعویٰ کیا ہے۔“

حاسد لاجواب اور شرمندہ ہوکر چپ ہوگیا۔

☆☆☆

ایک شخص پیشانی پر پٹی باندھے آپ کی مجلس میں شریک ہوا۔ آپ نے اسے قریب بلایا، پوچھا۔ ”تو نے پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟“

اس شخص نے پٹی کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”سر میں شدید درد ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تیری کیا عمر ہوگی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”تیس سال۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اتنی مدت تم بیمار رہے یا تندرست؟“

اس نے جواب دیا۔ ”عجیب اتفاق کی بات ہے کہ میں اپنے ہوش میں تو بیمار پڑا نہیں کبھی۔“

آپ نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا۔ ”اتنے عرصے تک تم تندرست رہے تو تم نے ایک دن بھی شکریے کی پٹی نہیں باندھی اور اب جو ایک دن ذرا سر میں درد ہوگیا تو شکایت کی پٹی فوراً باندھ لی۔“

اس شخص نے شرمندہ ہوکر سر کی پٹی فوراً کھول دی۔

ایک دن ایک شخص کو اس حال میں دیکھا کہ رو رو کر ”ہائے افسوس، ہائے افسوس“ کہہ رہا تھا۔ آپ نے اسے منع کیا، کہا۔ ”تم ایسا مت کہو۔ بلکہ کہو، ہائے بے غمی، ہائے بے غمی۔“

اس نے پوچھا۔ ”میں یہ کیوں کہوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہو کہ اگر تم واقعی غمزدہ اندوہ گیں یا متاسف ہوتے تو ہائے افسوس ہائے افسوس کہنے کی تم میں نہ ہمت ہوتی نہ جرأت۔“

آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ صوفیائے کرام اور دوسرے ارادت مند آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ عیادت کرنے والوں میں حسن بصریؒ بھی شامل تھے۔ جس وقت حسن بصریؒ حجرے میں داخل ہونے والے تھے، انہوں نے ایک دولت مند کو حجرے کے در پر اس طرح کھڑے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حسن بصریؒ نے پوچھا۔ ”جناب! یہ ماجرا کیا ہے؟ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟“

دولت مند نے جواب دیا۔ ”میں اس یکتائے زمانہ عورت کے لیے ایک چیز لایا ہوں۔ اگر یہ مجھ سے بات چیت کرنا پسند کرے تو مارے خوشی کے میں یہ اچھی سی چیز اسے پیش کردوں۔“

حسن بصریؒ نے کہا۔ ”پیش کرنے میں کیا حرج ہے؟“

دولت مند نے کہا۔ ”میں اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ وہ لینے سے کہیں انکار نہ کردیں۔ ہاں اگر آپ میری سفارش کردیں تو وہ شاید قبول فرمالیں۔“

حسن بصریؒ اندر گئے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس رئیس کی سفارش کی۔ رابعہ بصری نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”حسنؒ! تم جانتے ہو کہ جو شخص اللہ کو برا کہتا ہے اللہ اس کی روزی بند نہیں کرتا اور جس کی زندگی اس کی محبت پر قائم ہو، اسے تو اللہ بغیر رزق ہی کے زندہ رکھ سکتا ہے۔ حسنؒ! جب سے میں نے اسے دیکھا ہے، کل مخلوق سے اپنا منہ پھیر لیا ہے، اب تم ہی بتاؤ کہ جس شخص سے میں واقف نہیں، اس کا مال

کس طرح قبول کرلوں۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس شخص کا مال حرام کا ہے یا حلال کا۔ اس سے کہو واپس جائے۔"

اس موقع پر دوسرے مشہور صوفی سفیان ثوریؒ آپ کی عیادت کو پہنچے۔ وہ رابعہؒ سے اتنے مرعوب تھے کہ کوئی بات ہی نہ کہہ سکے۔

رابعہؒ نے خود ہی پوچھا۔ "فرمائیے سفیانؒ! کیسے آنا ہوا؟"

سفیان ثوریؒ نے کہا۔ "میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف سے آپ کو ہٹالے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! کیا تمہیں اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کہ یہ بیماری بھی اسی کے حکم سے ہے۔"

سفیانؒ نے مرعوب لہجے میں کہا۔ "آپ درست فرماتی ہیں۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "تب پھر دوست کی مرضی کے خلاف تم نے یہ بات کیوں کہی کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف کو دور فرمادے۔"

سفیانؒ پریشان ہوگئے، گھبرا کر پوچھا۔ "آپ کو کسی چیز کی خواہش محسوس ہوتی ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! تم سمجھ دار انسان ہو اور ایسی باتیں کرتے ہو۔ آج بارہ سال سے میں تازہ خرما کھانے کی خواہش رکھتی ہوں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ خرمے یہاں کتنے ملتے ہیں اور کتنی بے قدری سے فروخت ہوتے ہیں لیکن میں انہیں نہیں کھاسکی۔"

سفیانؒ نے پوچھا۔ "ان کے کھانے میں کیا قباحت ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "میں تو غلام ہوں اور غلام کو خواہش سے کیا سروکار؟ میں ڈرتی ہوں کہ اگر میں کسی چیز کی خواہش کروں اور میری یہ خواہش خدا کو ناپسند ہو تو میرے لیے یہ کفر ہوگا۔"

سفیانؒ نے بے بسی سے عرض کیا۔ "آئندہ میں آپ کے کاموں میں دخل نہیں دوں گا۔ آپ میرے متعلق کچھ فرمائیں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! اگر تم دنیا کو دوست نہ رکھتے تو ایک مرد ہوتے۔"

سفیانؒ نے کہا۔ "میں دنیا کو کہاں دوست رکھتا ہوں؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "تم باتیں بہت زیادہ کرتے ہو اور یہ دنیاداری ہے۔"

رابعہؒ کی اس بات نے سفیانؒ کو رلا دیا۔ دعا کی۔ "خدایا! رابعہؒ کہتی ہیں کہ میں دنیا کو دوست رکھتا ہوں، تو مجھ سے راضی ہوجا، میں یہی درخواست کرسکتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "سفیانؒ! تجھے شرم نہیں آتی، اللہ کی رضا تو چاہتا ہے لیکن خود اللہ سے راضی نہیں ہے۔"

مشہور زمانہ صوفی مالک بن دینارؒ آپ کی ملاقات کو پہنچے تو دیکھا، رابعہؒ ٹوٹے ہوئے لوٹے سے وضو کررہی ہیں۔ سامنے ایک بوسیدہ چٹائی بچھی تھی جس پر سرہانے ایک اینٹ کا تکیہ رکھا ہے۔

مالک بن دینارؒ نے کہا۔ "رابعہؒ! میرے ارادت مندوں میں بہت سے مال دار ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے آپ کے لیے کچھ طلب کرلوں؟"

رابعہؒ نے پوچھا۔ "ابن دینارؒ! ایک بات تو بتاؤ، کیا مجھے، تمہیں اور دولت مندوں کو رزق عطا کرنے والی ایک ہی ذات نہیں ہے؟"

مالک بن دینارؒ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟"

رابعہؒ نے کہا۔ "تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ نے درویشوں کو ان کی غربت کی وجہ سے فراموش کردیا ہے اور اسے محض امراء کو رزق دینا یاد رہ گیا ہے؟"

مالک بن دینارؒ نے کہا۔ "نہیں، ایسی بات تو نہیں ہے۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "جب یہ بات نہیں ہے تو پھر وہ ذات جو ہم سب کی ضروریات سے واقف ہے، ہمیں یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ اپنی احتیاج کی یاددہانی کرائیں۔ اس شرم سے میں خاموش رہتی ہوں کہ وہ میری ضروریات سے اچھی طرح واقف ہے، پھر یاددہانی کرانے سے کیا حاصل؟"

ایک بار لوگوں نے دیکھا آپ زاروقطار رو رہی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا۔ "اس طرح رونے کا سبب؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "لوگو! میں اس کے فراق سے خوفزدہ ہوں، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دم نزع یہ صدا نہ آجائے کہ تو لائق بارگاہ نہیں ہے۔"

حسن بصریؒ، رات بھر رابعہؒ کے گھر مقیم رہے اور حقیقت و معرفت پر گفتگو کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے حسن بصریؒ نے محسوس کیا کہ رابعہؒ علم و معرفت کا سمندر ہیں اور خود مفلس ہیں۔

حسن بصریؒ نے دوران گفتگو دریافت کیا۔ ''رابعہؒ! کیا تمہیں نکاح کی خواہش نہیں محسوس ہوئی؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔''

حسن بصریؒ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''حسنؒ! نکاح کا تعلق تو جسم و وجود سے ہے اور جس کا وجود اپنے مالک میں ضم ہو گیا ہو تو اسے نکاح کی ضرورت کیونکر محسوس ہو سکتی ہے؟''

اس کے بعد ایک موقع پر رابعہؒ نے حسن بصریؒ کے پاس موم، سوئی اور بال روانہ کیے اور لے جانے والے سے کہا۔ ''تم حسنؒ سے کہہ دینا کہ موم کے مانند پگھل کر روشنی فراہم کرو، سوئی کے مانند برہنہ ہو کر مخلوق کی خدمت کرو اور جب تم ان دونوں امور کی تکمیل کر لو گے تو تم بال کے مانند ہو جاؤ گے اور کبھی بھی تمہارا کوئی خراب نہیں ہو گا۔''

بصرہ کے صوفیوں میں سے کسی ایک نے آپ کی مجلس میں دنیا کی شکایت شروع کر دی۔ رابعہؒ نے کہا۔ ''حضرت! معلوم ہوتا ہے آپ کو دنیا سے بہت لگاؤ ہے؟''

ان صاحب نے کہا۔ ''نہیں تو، میں تو دنیا سے نفرت کرتا ہوں۔''

رابعہؒ نے کہا۔ ''جناب! یہ ایک کلیہ ہے کہ جس کا جس چیز سے لگاؤ ہوتا ہے، وہ اس کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہے۔ اگر آپ کو دنیا سے واقعی نفرت ہوتی...... تو اس کا تذکرہ یا دو ذکر نہ کرتے۔''

ایک رات عبادت میں گزار دینے کے وقت سفیان ثوریؒ سے کہا۔ ''سفیانؒ! مجھے عبادت گزاری کی جو توفیق عطا ہوئی ہے میں اس کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ بطور شکرانہ میں اس کا روزہ رکھوں۔'' اس کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں روتے ہوئے عرض کیا۔ ''خدایا! اگر تو نے مجھے روز محشر جہنم کی آگ میں جھونکا تو میں تیرا ایک ایسا راز افشا کروں گی کہ اسے سن کر جہنم مجھ سے ایک ہزار سال کی مسافت پر بھاگ جائے گا۔ خدایا! دنیا میں میرا جو حصہ مقرر اور مقدر ہے، وہ اپنے معاندین کو دے دے اور میرا جو حصہ عقبیٰ میں ہے، اسے اپنے دوستوں میں تقسیم فرما دے کیونکہ میں اپنے لیے تجھی کو کافی سمجھتی ہوں۔ اے اللہ! اگر میں جہنم کے ڈر سے عبادت کروں تو تجھے اختیار ہے کہ مجھے جہنم میں جھونک دے اور اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں جنت کے لالچ میں مصروف عبادت رہتی ہوں تو تو فردوس کو مجھ پر حرام کر دے اور اگر میری عبادت تیرے دیدار کی خاطر ہے تو پھر مجھے اپنے جمال عالم افروز سے مشرف فرما دے۔ اور اگر تو نے پھر بھی مجھے جہنم میں ڈال دیا تو میں یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوں گی کہ دوستوں کے ساتھ دوستوں ہی جیسا سلوک ہونا چاہیے تھا۔'' اس کے بعد آپ نے دعا مانگی۔ ''خدایا! تو مجھے حضوری قلب عطا فرما یا پھر بے رغبتی کی عبادت ہی کو شرف قبولیت بخش دے۔''

185 ہجری میں آپ 88 برس کی ہو چکی تھیں آہستہ آہستہ صحت اتنی گر گئی کہ صاحب فراش ہو گئیں۔ صبح و شام عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک دن آپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے عیادت کرنے والوں سے کہا۔ ''لوگو! تم سب ذرا دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔ فرشتے آ رہے ہیں ان کے لیے جگہ چھوڑ دو۔''

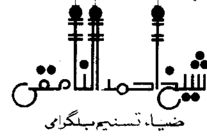
عیادت گزار باہر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد اندر سے آواز آئی۔ ''اے مطمئن نفس! اپنے مولیٰ کی طرف لوٹ چل۔''

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ عیادت کرنے والے دوبارہ اندر داخل ہو گئے۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان کی روح قفس عنصری چھوڑ چکی ہے۔

اسی رات کسی صوفی نے رابعہؒ کو خواب میں دیکھا، پوچھا۔ ''رابعہؒ! منکر نکیر کے ساتھ کیسا معاملہ رہا؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''منکر نکیر نے مجھ سے پوچھا...... تیرا رب کون ہے؟ میں نے جواب دیا۔ واپس جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ جب تو نے پوری مخلوق میں ایک ناچیز عورت کو فراموش نہیں کیا تو پھر رابعہؒ تجھے کس طرح بھول سکتی ہے اور جب دنیا میں تیرے سوا اس کا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں رہا تو پھر ملائکہ کے اس قسم کے سوال و جواب کا مطلب؟''

تذکرۃ الاولیا۔ شیخ فریدالدین عطار۔ حکایات صوفیہ۔ طالب ہاشمی۔ انوار اصفیا۔
رابعہ بصری و دادالکالیبی۔ الطبقات الکبریٰ۔ الشعرانی۔ حکایات شیریں۔



ضیاء تسنیم بلگرامی

رسُولُ اللّٰہ کے ایک صحابی جریرؓ بن عبد اللّٰہ الجبلی کی اولاد کا تذکرہ۔ اُن لوگوں نے عرب کو خیر باد کہا اور ھرات میں آباد ھوگئے۔ وھاں اُن کی اِس اولاد نے علوم اور فنون سے مُنہ موڑا اور لہو ولعب کی زندگی اختیار کی لیکن قسمت کا قلم کچھ اور ھی رقم کرچکا تھا۔ اس عہد کا مشہور روشن ضمیر صوفی اپنا خرقہ اُن کو دینے پر مجبور تھا کیوں کہ اس کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔ صُوفی پریشان تھا کہ اس آزاد رند کو اس قدر کیوں نوازا جارھا ھے مگر مشیتِ ایزدی میں دَم مارنے کی گنجائش ھی کہاں۔ پھر وہ رند شیخ الاسلام قرار پایا۔ چالیس سال بعد اس کو کس طرح علم سے نوازا گیا کوئی نہیں جانتا۔ یہ اُسی آزاد مشرب صُوفی کا تذکرہ ھے۔

رسول مقبولؐ کے ایک صحابی تھے جریر بن عبد اللہ الجبلیؓ۔ یہ ۱۰ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ آپ بلند قامت اور بہت حسین تھے۔ ان کے حُسن کا اعتراف سبھی نے کیا چنانچہ حضرت عمرؓ ان کو یوسفِ اُمّت کہا کرتے تھے۔ بعد میں ان کی اولاد نے بلادِ اسلامیہ کے دوسرے شہروں کی سکونت اختیار کی۔ ہرات بھی ان میں سے ایک تھا۔ یہاں بھی ایک خاندان آباد ہوگیا۔ آسودگی میسّر آئی تو یہ لوگ لہو ولعب میں مبتلا ہوگئے، لیکن اس حال میں بھی ان کے باطن میں کبھی کبھی روشنی کی رمق نمودار ہوکر غائب ہوجاتی تھی۔ اس خاندان کے ایک نوجوان احمد نے تو دنیا اور زندگی ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ شراب نوشی عام تھی اور یہ اپنے دوستوں کے ساتھ شرابیں پیا کرتے تھے۔ ان دوستوں میں شہر کا کوتوال بھی شامل تھا۔ اس زمانے میں شہر کوتوال کو شحنہ کہا جاتا تھا۔ شحنہ کا نام نامق تھا۔ شام کو سبھی دوست احباب جمع ہوکر دلچسپ اور رنگین باتوں میں مشغول ہوجاتے۔ پھر کوئی کہتا "شراب کہاں ہے؟ کیا آج صرف باتیں ہی ہوتی رہیں گی؟"

شیخ احمد جواب دیتے "شحنہ نامق کہاں رہ گیا، اس کے بغیر تو یہ محفل سونی ہے۔"

کسی نوجوان کی طرف سے جواب آتا "یارو! یہ کیا بات ہوئی۔ جب شحنہ آئے گا تو دوسرا دور چل جائے گا۔"

بس پھر فوراً ہی شراب کا دور چلنے لگتا۔

دوسری طرف اس دور کے مشہور صوفی ابوسعید ابوالخیر ایک خرقے کی حفاظت دل وجان سے کر رہے تھے۔ یہ خرقہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ تواتر اکیس شیخ پہن چکے تھے۔ بائیسویں شیخ ابوسعید ابوالخیر تھے۔ آپ اس خرقہ کو پہن کر عبادت کیا کرتے تھے۔ شیخ کو یہ خرقہ بہت عزیز تھا۔ ان کے بیٹے شیخ ابوطاہر کو اس خرقہ کی عظمت اور فضیلت کے بارے میں تفصیل سے معلوم ہوچکا تھا۔ یہ اپنے باپ سے اس خرقے کے بارے میں اکثر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ بالآخر یہ خرقہ اپنے والد سے ایک نہ ایک دن حاصل ہوجائے گا۔

جب شیخ ابوسعید ابوالخیر کا وقت آخر آیا تو انھیں اس خرقے کی فکر ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے ابوطاہر کو اس خرقے کا اہل سمجھتے تھے لیکن جب بھی ابوطاہر کو دینا چاہتے، طبیعت اس پر راغب نہ ہوتی۔ ابوطاہر اشارۃً پوچھتے "باوا جان! اس خرقہ کا مستحق کون ہے؟"

شیخ ابوسعید ابوالخیر جواب دیتے "بیٹے! کیا بتاؤں، میں تو یہ خرقہ تجھ کو ہی دینا چاہتا ہوں لیکن طبیعت راغب ہی نہیں ہوتی کچھ دن ٹھہر جاؤ، شاید مشیتِ ایزدی کچھ اور ہو۔"

زندگی گزرتی جارہی تھی اور ہنوز خرقے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

رات کے پچھلے پہر بارگاہِ ایزدی میں تا دیر آہ وزاری کے بعد ابوسعید ابوالخیر سجدے میں گر گئے اور دعائیں مانگنے لگے "الٰہ العالمین! زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، میرے پاس جو خرقہ ہے وہ کسی کی امانت ہے۔ کس کی امانت ہے، میں نہیں جانتا۔ میں تیری رہنمائی کا طالب ہوں مجھے بتا کہ یہ کس کو دیا جائے گا۔"

وہ گریہ وزاری کے بعد سو گئے اور عالمِ رویا میں انھوں نے جو دیکھا وہ بہت حیرت انگیز اور تقریباً ناقابلِ فہم تھا۔ وہ مے خواروں کی محفل میں کھڑے دیکھ رہے تھے کہ وہاں شحنۂ شہر کوتوال سمیت کئی جوان اور نوجوان نا ونوش میں مشغول تھے۔



آپ نے پوچھا "ان میں وہ کون خوش نصیب ہے جس کو میرا یہ خرقہ دے دیا جائے؟"

ابوسعید ابوالخیر کو ایک نوجوان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ شیخ احمد نامقی کے پاس اور حکم دیا گیا کہ اپنا خرقہ اس نوجوان کو دے دینا۔"

ابوسعید ابوالخیر نے اس نوجوان کا تعارف چاہا "یہ کون ہے؟ کیا نام ہے؟ اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟"

جواب دیا گیا "اس کا نام ہے شیخ احمد، نام کے ساتھ نامقی بھی لگتا ہے اور رسولِ مقبولؐ کے مشہور صحابی جریر بن عبداللہ البجلی کی اولاد میں سے ہیں۔"

ابوسعید ابوالخیر کو تعجب ہوا "میں اپنا خرقہ اس نوجوان کو دوں گا، یعنی اس شرابی نوجوان کو؟"

جواب ملا "ہاں، یہ شرابی ہے، مے خواروں میں رہتا ہے مگر اس سے تیرا کیا واسطہ۔ تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے تو اس کی تعمیل کر۔"

ابوسعید ابوالخیر دم نہیں مار سکتے تھے۔ وہ حکم کے پابند اور مشیتِ ایزدی کے تابع تھے عرض کیا "بارالٰہی! مجھے کیا، میرے پاس جو امانت ہے وہ شیخ احمد نامقی کو دے دی جائے گی۔"

آپ نے نوجوان کو اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیا، چہرے پر موجود علامتوں کو بھی ذہن نشین کر لیا۔

صبح ہوتے ہوتے ابوسعید ابوالخیر کو خرقہ کے اصل مستحق کا نام اور پتا معلوم ہو چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد آپ نے اپنے بیٹے ابوطاہر کو طلب کیا اور کہا "بیٹے! تو اکثر خرقے کی بات کیا کرتا تھا اور تیری یہ خواہش تھی کہ یہ خرقہ تجھ کو دے دیا جائے۔"

ابوطاہر کو امید ہوئی کہ شاید یہ خرقہ ان کو مل جائے گا، جواب دیا "جی باوا جان، مجھے بڑی خوشی ہوگی جو یہ مجھے مل جائے۔"

آپ نے جواب دیا "آج مجھے اس نوجوان سے ملوا دیا گیا، یہ نوجوان رسولِ مقبولؐ کے ایک صحابی جریر بن عبداللہ البجلیؓ کی اولاد میں سے ہے، نام شیخ احمد نامقی ہے، فی الحال خراباتیوں کا ہم نشین ہے۔"

ابوطاہر نے تعجب سے پوچھا "یہ نوجوان خود بھی شراب پیتا ہے؟"

باپ نے جواب دیا "ہاں وہ خود بھی شراب پیتا ہے۔"

ابوطاہر خاموش ہو گئے۔ ابوسعید ابوالخیر نے ذرا تکلیف دہ لہجے میں کہا "بیٹے! جس ولایت کی تو آرزو کر رہا ہے آج وہ دوسرے کے سپرد کر دی گئی اور ہمارے علمِ شیوخت کو ایک خراباتی کے دروازے پر مار دیا گیا ہے۔ جو کام ہمارے سپرد تھا اب وہ اس آزاد مزاج نوجوان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔"

ابوطاہر نے حیرت سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے؟"

باپ نے جواب دیا "افسوس کہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔"

کچھ دیر بعد ابوسعید ابوالخیر نے شیخ احمد نامقی کا حلیہ اور دیگر تفاصیل اپنے بیٹے ابوطاہر کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیں۔ ابوطاہر نے عرض کیا "باوا جان! ان باتوں کا مجھ سے کیا تعلق، آپ یہ خرقہ جس کو چاہیں دے دیں، مجھے درمیان میں نہ لائیں۔"

باپ نے جواب دیا "بیٹے! موت کا کوئی اعتبار نہیں اور مجھے کچھ اس طرح بتایا گیا ہے کہ یہ خرقہ میرے ذریعے نہیں جائے گا۔ جب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا تو یہ نوجوان اس خرقہ کی جستجو میں تیرے پاس آئے گا اور تجھ سے حاصل کرے گا۔"

اور بالکل اسی طرح ہوا، کچھ عرصے بعد ابوسعید ابوالخیر وصال فرما گئے۔ خرقہ امانتاً ابوطاہر کے قبضے میں رہا۔

****

شیخ احمد کے گھر کی باہری بیٹھک میں بے تکلف دوست حسبِ معمول جمع ہو گئے اور ناؤ نوش پر اصرار کیا۔

شیخ احمد نے جواب دیا "دوستو! تم سب خوب جانتے ہو کہ میں کھانے پینے میں بخل نہیں کرتا۔ ہم سب کا مشترک دوست نامق شحنہ اس محفل کی جان ہے، اس کا انتظار کر لو۔ پھر ہم سب اس کے ساتھ جشن منائیں گے۔"

لیکن دوستوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا "ہم اس کا کب تک انتظار کریں گے۔ ایک دور اس کے بغیر چل جانے دو، پھر جب وہ آ جائے گا تو دوسرا دور چلا لیں گے۔"

دوستوں کے بے حد اصرار پر مزے مزے کے لذیز کھانے بچوا لیے گئے اور کھانے کے ساتھ پینے کا دور چلا۔ سب کو بے حد مزہ آ رہا تھا وہ بلانوش سارا کھانا اور ساری شراب چٹ کر گئے۔ نامق شحنہ اس وقت آیا جب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ نامق نے محفل کا جو حال دیکھا تو افسوس کرتے ہوئے کہا "دوستو! یہ تو زیادتی ہو گئی میرے ساتھ۔ تم نے میرا انتظار بھی نہیں کیا اور۔۔۔"

شیخ احمد نے جواب دیا "دوست! گلہ شکوہ مت کرو، دوسرا دور تمہارے ساتھ چلے گا۔ گرما گرم لذیز کھانے اور پک جائیں



کے اور شراب بھی بازار سے اور آجائے گی۔"

نامق شحنہ نے کہا۔"اگر یہ بات ہے تو سارا انتظام تیزی سے کرو، کیوں کہ وقت کم ہے۔"

شیخ احمد نے باورچی کو کھانے تیار کرنے کا حکم دیا اور اپنے ایک دوست کو بہت سارے سکے دیے کہ ان کی شراب خرید لا۔ وہ شراب خریدنے چلا گیا اور باورچی کھانے پکانے لگا۔ کھانے پک گئے مگر دوست شراب لے کر نہیں آیا۔ نامق نے کہا۔"یارو! آج یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہیں دلوں میں فاصلہ تو نہیں پیدا ہو گیا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دوست خالی ہاتھ واپس آ گیا۔

شیخ احمد نے پوچھا۔"وہ شراب کہاں ہے؟"

دوست نے جواب دیا۔"میں نے پورے شہر میں شراب تلاش کر ڈالی لیکن مے خانوں میں مٹکے خالی پڑے ہیں، اب تم ہی بتاؤ میں کہاں سے لاؤں شراب۔"

شیخ احمد نے سکّے واپس لے لیے اور کہا۔"تو کیسا آدمی ہے کہ شراب نہیں لا سکا۔ اب میں لاؤں گا یہ شراب۔"

شیخ احمد جب وہاں سے نکل رہے تھے تو انھیں خوب اچھی طرح یاد تھا کہ ان کے گھر میں چالیس مٹکے شراب اس وقت بھی موجود تھی لیکن شیخ احمد اس شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتے تھے۔

شیخ احمد نے جس خچر کو سفر کے لیے نکالا تھا وہ دولتّیاں جھاڑنے لگا۔ یہ اچھل کر اس کی پشت پر بیٹھ گئے اور کہا۔"تو کیسا خدمت گزار ہے کہ اپنے آقا سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ مجھے جلدی ہے اور تو سستی دکھا رہا ہے۔"

کچھ دیر بعد بازار سے شراب آ گئی اور نامق شحنہ کے ساتھ دوسرا دور چلا، بلانوشوں نے اتنی زیادہ چڑھالی کہ شراب کم پڑ گئی۔ نامق شحنہ نے طعنہ دیا۔"احمد! کیا بات ہے؟ آج تم کنجوسی سے کام لے رہے ہو؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔"نہیں تو، بازار میں جتنی شراب موجود تھی سب خرید لایا۔"

نامق شحنہ نے کہا۔"کوشش کرتے تو اور مل جاتی۔ بہر حال اب جاؤ اور مزید شراب لاؤ، مزہ نہیں آ رہا۔"

شیخ احمد خچر پر سوار ہو کر دوبارہ شراب کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ اس بار خچر نے پھر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دور چل کر کھڑا ہو گیا، شیخ احمد نے پہلے تو اسے ٹانگوں سے دباؤ ڈال کر اور منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال کر خچر کو چلنے پر مجبور کیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ شیخ احمد نے چابک رسید کیا، لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ خچر اس طرح اچھل کود رہا تھا گویا اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں باندھ دی گئی تھیں۔ شیخ احمد کو جلدی تھی۔ کیوں کہ نامق شحنہ اور دوسرے دوست ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

کسی قریبی عزیز نے ان کو اس حال میں دیکھا تو پوچھا۔"شیخ احمد! کیا حال ہے، یہ کس مصیبت میں پڑ گئے؟"

انھوں نے جواب دیا۔"مجھ کو کچھ شراب درکار ہے۔ اس لیے شراب خانے تک جانا چاہتا ہوں لیکن خچر ساتھ ہی نہیں دے رہا۔"

عزیز نے راز کی بات کہہ دی۔"آپ کے گھر میں چالیس مٹکے شراب سے لبریز موجود ہیں پھر کہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔"

شیخ احمد نے جواب دیا۔"یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں گھر کی شراب کام میں نہیں لانا چاہتا، اس لیے اس کا ذکر ہی فضول ہے۔"

عزیز مسکراتا ہوا چلا گیا۔ انھوں نے غصّے میں خچر کی پٹائی شروع کر دی اور کہا۔"آج میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"

لیکن اسی لمحے شیخ کو کسی کی آواز سنائی دی۔"اے احمد! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اس خچر کو ناحق مار رہے ہو، یہ ہمارے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

شیخ احمد نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا، انھوں نے کہا۔"میرا دوست نامق شحنہ میرا انتظار کر رہا ہو گا، میں اس کو کیا جواب دوں گا۔ وہ تو میرا کوئی عذر بھی قبول نہیں کرے گا۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔"خوب تو بھی خوب ہے۔ شحنہ سے عذر کرے گا تو وہ قبول نہیں کرے گا اور مجھ سے توبہ کرے گا تو میں اس کو قبول کر لوں گا۔ اب تو خود ہی فیصلہ کر کہ تیرے حق میں کیا بہتر ہے؟"

اس آواز اور انداز گفتگو نے شیخ احمد کے باطن میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور وہ خچر سے اُتر کر سجدے میں گر گئے اور پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا۔"اے اللہ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب آئندہ شراب نہیں پیوں گا۔ تو اس خچر کو حکم دے دے کہ یہ میرے ساتھ چلا چلے۔ میں نے دوستوں سے جو وعدہ کیا ہے اس کو ہر حال میں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس شرمندگی سے بچا لے۔"



کچھ دیر بعد خچر نے چلنا شروع کر دیا، انھوں نے ایک جگہ سے شراب حاصل کی اور اسے بعجلت لے کر گھر پہنچے، دوست ان کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

ناموق شحنہ اور دوست خوشی سے اچھلنے لگے، شراب کا دور چلا اور تھوڑی سی شراب شیخ احمد کو بھی پیش کی گئی، آپ نے شراب نہیں لی اور کہا "میں نے شراب نوشی سے توبہ کر لی ہے اس لیے میں نہیں پیوں گا۔"

ناموق شحنہ نے کہا "کیوں مذاق کرتے ہو، یہ اچانک توبہ کا خیال کہاں سے آ گیا۔"

شیخ احمد نے جواب دیا "بس خیال آ گیا۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔"

ناموق شحنہ شراب کا پیالہ زبردستی ان کے منہ سے لگانے لگا "لیکن میں تمھارا کوئی عذر نہ سنوں گا۔ ہم پئیں گے تو تم کو بھی پلائیں گے۔"

شیخ احمد نے دونوں ہاتھوں سے پیالے کو ہٹانے کی کوشش کی، لیکن دوست کسی طرح بھی نہیں مانے، وہی آواز جو کچھ پہلے توبہ کا سبب بن گئی تھی، ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی "شیخ احمد! تم دوستوں کا کہنا مان لو اور ان کی دی ہوئی شراب پی جاؤ لیکن آج کے بعد ہرگز نہ پینا۔"

شیخ احمد نے شراب کا پیالہ منہ سے لگا لیا اور اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شراب کا مزہ ہی بدلا ہوا محسوس ہوا، وہ شہد پی رہے تھے۔

دوستوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ شیخ احمد اب بھی ان کے ساتھ شراب پی رہے تھے۔ ناموق شحنہ نے پوچھا "تمھاری توبہ کو کیا ہو گیا؟"

شیخ احمد نے اپنا پیالہ ناموق شحنہ کی طرف بڑھا دیا "لو، اسے چکھو اور دیکھو کہ اللہ نے میری کس طرح شرم رکھی ہے۔"

ناموق شحنہ نے اسے چکھا تو دوسرے دوستوں سے پوچھا "ان کا پیالہ شراب سے کس نے بھرا تھا؟"

ایک دوست نے جواب "میں نے بھرا تھا، مگر کیوں؟"

ناموق شحنہ نے کہا "اس پیالے میں شراب نہیں، شہد ہے۔"

دوست نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہے" پھر پیالے کو اپنے منہ سے لگا لیا اور شہد کا مزہ چکھ کر حیران رہ گیا۔ دوسرے دوستوں نے بھی باری باری اسے چکھا اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

شیخ احمد نے مزید کہا "میرا اللہ نہیں چاہتا کہ میں شراب پیوں اس لیے اب میں کبھی بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

دوستوں پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ بھی تائب ہو گئے۔

شیخ احمد کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے باہر آئے اور ایک قریبی پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ دوست احباب اور عزیز رشتے دار ان کو اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ احمد کو خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کیا کہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اس پہاڑ پر چلا آیا۔

پھر ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "اے احمد! یہ تم نے کیا کیا، بھلا کون اس طرح اللہ کی راہ پر چلتا ہے، تم نے اپنے متعلقین کو ایسے ہی چھوڑ دیا، ان کے حقوق تم پر فرض تھے۔"

شیخ احمد کے منہ سے نکلا "میں نے اپنے گھر میں شراب کے چالیس مٹکے ان کے لیے چھوڑ دیے تھے، اس کے علاوہ بھی گھر میں بہت کچھ ہے۔ ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے کام میں لائیں اور شراب سے ان کا کافی خرچ چل سکتا ہے۔"

کسی نے ان سے پوچھا "اور جب یہ ساری چیزیں خرچ ہو جائیں گی تب؟ اس وقت تم کیا کرو گے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا "پھر میں ان کے پاس چلا جاؤں گا۔"

کسی آواز نے ملامت کی "اے احمد! اللہ کی راہ پر چلتا ہے اور شراب کے مٹکوں پر بھروسا کرتا ہے، خوب! نادان انسان! مجھے تو تو گم کردہ راہ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ پر توکل کر اور پھر دیکھ کہ وہ کیا کرتا ہے۔"

اس آواز اور اندرونی کشمکش نے انھیں پہاڑ سے اتار دیا اور یہ نیچے آ گئے۔ یہ اچانک اپنے گھر میں داخل ہوئے، ایک جگہ سے لاٹھی اٹھائی اور پھر جو چیز بھی سامنے آئی اس کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس توڑ پھوڑ سے لوگوں کو خیال گزرا کہ غالباً شیخ احمد کا دماغی توازن جاتا رہا ہے اور وہ مدتوں غائب رہ کر واپس آئے ہیں تو توڑ پھوڑ شروع کر دی ہے۔ وہ بھاگے بھاگے حاکمِ شہر کے پاس پہنچے اور اس سے شکایت کی کہ شیخ احمد گھر کو برباد کیے دے رہے ہیں۔



حاکم شہر کو غصہ آیا اور اس نے چند طاقتور سپاہیوں کو حکم دیا کہ شیخ احمد کو گرفتار کر کے گھوڑوں کے اصطبل میں باندھ دو۔"

اس حکم پر من و عن عمل ہوا اور شیخ احمد کو اصطبل میں گھوڑوں کے درمیان قید کر دیا گیا۔

شیخ احمد کو یہاں بول و براز کی بساند نے کچھ پریشان کیا مگر پھر کھری کو اپنے لیے بہترین جگہ تصور کیا اور وہاں بیٹھ کر عالم بے خودی میں ایک شعر پڑھا۔

(ترجمہ :۔ اونٹ کو دیکھ وہ چکّی لیے پھیروں میں مشغول ہے، میں پوچھتا ہوں تم اپنے دوست سے کیوں منہ پھیرے ہوئے ہو)

گھوڑوں نے دانہ و گھاس کھانا چھوڑ دیا اور وارفتگی میں اپنے سر دیوار سے ٹکرانے لگے، ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

صبح اصطبل کے ملازم نے یہ حال دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔

وہ بھاگا بھاگا شحنہ کے پاس پہنچا اور اس کو پورا حال بتا کے کہا "اب گھوڑوں کا یہ حال ہے کہ وہ پاگل دیوانے ہو چکے ہیں۔"

شحنہ اصطبل کے ملازم کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور آپ کو باہر لے آیا، معذرت کرتے ہوئے کہا "آپ کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا، بہت بُرا ہوا، بڑی زیادتی ہوئی، آپ ہمیں معاف کر دیں، بڑا کرم ہوگا۔"

"آپ نے جواب دیا "اس کی کوئی ضرورت نہیں، جو مجھ کو جانتا ہی نہیں وہ مجھ سے اسی قسم کا سلوک کرے گا۔"

شحنہ نے کہا "اب آپ آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں۔"

اصطبل کے ملازم نے عرض کیا "لیکن جانے سے قبل گھوڑوں کو پہلے جیسا کر دیں۔"

آپ نے دوسری بار بھی ایک شعر پڑھا جس کا گھوڑوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ پہلے جیسے ہو گئے۔

اب آپ دوبارہ اسی پہاڑ پر چلے گئے، جہاں سے اُتر کر اپنے گھر گئے تھے۔

****

خواجہ ابوالقاسم گرد اپنی دولت اور دانائی کی وجہ سے بہت مشہور تھے، علماء اور مشائخ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن پھر معلوم نہیں ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا جس سے یہ مفلس ہو گئے، ان کا سب کچھ برباد ہو گیا، یہ وضعدار اور شریف انسان کسی کو اپنے بارے میں بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے مزارات پر حاضریاں دینا شروع کر دیں، وہاں یہ زیر لب کہتے "آپ اللہ سے کہیں کہ وہ مجھے ہمت اور حوصلہ دے، میں کسی انسان کے آگے اپنا حال بھی نہیں بیان کر سکتا۔"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملتا۔

اب ان کو جو وقت ملتا یہ اس میں علماء اور مشائخ سے ملاقاتیں کرنے نکل جاتے، کسی بھی عالم یا شیخ کی خدمت میں حاضری دے کر چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا، اور ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

جب پریشانی حد سے بڑھ گئی تو یہ ایک مسجد میں نماز ادا کر کے اداس اور غمگین ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد ایک بزرگ مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعت کی نیت باندھ کر نماز ادا کرنے لگے، نماز پڑھ چکنے کے بعد یہ خواجہ ابوالقاسم گرد کے پاس چلے گئے اور ان کے پاس بیٹھ کر پوچھا "خواجہ ابوالقاسم! کیا بات ہے، تم پریشان کیوں ہو؟"

خواجہ ابوالقاسم چونکہ ان بزرگ کو بالکل نہ جانتے تھے اس لیے کچھ بتانا معیوب سمجھا۔

ان بزرگ نے ذرا درشت لہجے میں کہا "میری طرف دیکھو خواجہ ابوالقاسم، ادھر میری طرف۔"

خواجہ ابوالقاسم نے ان بزرگ کی طرف دیکھا تو اور زیادہ پریشان ہو گئے۔ نورانی چہرے پر ہیبت اس بلا کی تھی کہ وہ تا دیر انھیں نہیں دیکھ سکے۔

ان بزرگ نے اچانک نہایت نرم اور مشفقانہ لہجہ اختیار کیا "ابوالقاسم، تم اپنے بارے میں مجھے بتاؤ تو سہی، بات کیا ہے؟ پریشان کیوں ہو؟"

خواجہ ابوالقاسم مجبور اور بے بس ہو گئے، اور اپنا حال ان کے سامنے رکھ دیا۔ آخر میں کہا "اب میں برباد ہو چکا ہوں اور کوئی صورت سدھرنے کی نظر نہیں آتی۔"

ان بزرگ نے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں پہاڑ پر خواجہ احمد موجود ہیں، تم ان کے پاس جاؤ اور انھیں یہ سب بتاؤ،



میرا خیال ہے وہ کوئی نہ کوئی صورت بہتری کی نکال لیں گے۔"

خواجہ ابوالقاسم نے کہا "حضرت! میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ ہی میری مشکل آسان فرمادیں گے، لیکن آپ نے مجھے خواجہ احمد کے حوالے کر دیا۔"

بزرگ نے جواب دیا "حوالے میں نے نہیں کیا، مشیّتِ ایزدی یہی ہے۔ میں نے تمھاری رہنمائی کر دی، اب تم فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔"

خواجہ ابوالقاسم دوسرے دن پہاڑ پر چڑھ گئے اور خواجہ احمد کو تلاش کر لیا۔ اس وقت خواجہ احمد مراقبے میں تھے، کچھ دیر بعد جب وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو خواجہ ابوالقاسم نے ان کو سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا "اے ابوالقاسم! تمھارا کیا حال ہے؟"

خواجہ ابوالقاسم نے حیرت سے پوچھا "کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟"

خواجہ احمد نے جواب دیا "میں تم سے ملنا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم کو ایک ضرورت آ پڑی ہے۔"

خواجہ ابوالقاسم نے اپنا حال کہہ سنایا اور کہا "اب حال یہ ہے کہ میں کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتا۔"

خواجہ احمد نے جواب دیا "پریشان نہ ہو، اللہ نے چاہا تو پریشانی جلد دور ہو جائے گی۔ آج رات میں اللہ سے تمھارے لیے رجوع کروں گا، دیکھیے کیا جواب ملتا ہے۔"

خواجہ ابوالقاسم وہیں ٹھہر گئے اور دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

دوسرے دن خواجہ احمد نے ان کو اپنے حجرے میں طلب کیا اور انھیں بتایا "میں نے تمھارے بارے میں اللہ سے رجوع کیا تھا، مبارک ہو کہ میری بات مان لی گئی۔"

خواجہ ابوالقاسم نے پوچھا "پھر اب کیا اور کس طرح ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا "تم کو مجھ سے کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ یہ ہوگا کہ اب تم کو اپنی ضروریات کے لیے کسی کے آگے دستِ طلب دراز نہیں کرنا پڑے گا۔"

خواجہ ابوالقاسم کے لیے یہ بھی بہت تھا۔ پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپ نے سوال کر دیا "اب تم یہ بتاؤ کہ ہر روز تم کو کتنا خرچ درکار ہوتا ہے؟"

ابوالقاسم نے جواب دیا "چار دانگ۔"

آپ نے پوچھا "وہ سامنے پتھر دیکھ رہے ہو؟"

ابوالقاسم نے جواب دیا "ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "اس پتھر کے سپرد تمھارا کام کر دیا گیا ہے، اب تم ہر روز وہاں سے چار دانگ حاصل کر لیا کرنا۔"

ابوالقاسم نے پوچھا "تو کیا چار دانگ کے لیے مجھے ہر روز یہاں آنا پڑے گا؟"

آپ نے جواب دیا "بالکل۔ چونکہ چار دانگ کا مسئلہ اس پتھر کے سپرد کیا گیا ہے۔ جب اس پتھر کو صبح آ کر اٹھاؤ گے تو تم کو چار دانگ مل جایا کریں گے۔"

ابوالقاسم اس پتھر کے پاس گئے اور اس کو اٹھایا۔ وہاں سے چار دانگ کا سونا مل گیا۔ یہ خوش خوش سونا لیے ہوئے خواجہ احمد کے پاس گئے اور کہا "یہ ایک مثقال سونا تو مل گیا ہے لیکن اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ مجھے کب تک ملتا رہے گا؟"

آپ نے جواب دیا "زندگی بھر، جب تک تم زندہ ہو۔"

ابوالقاسم نے پوچھا "اور پھر؟ میرے بعد؟ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا "تمھارے بچے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور اس وقت تک فائدہ اٹھاتے رہیں گے جب تک درمیان میں خیانت نہ آ جائے۔"

خواجہ ابوالقاسم مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

****

شیخ ابوسعید ابوالخیر وصال فرما چکے تھے اور ان کے صاحبزادے ابوطاہر خرقۂ صدیقی کے لیے خواجہ احمد کا انتظار کر رہے تھے۔

رسولِ پاک نے فرمایا

- تم پر اہل و عیال کا بھی حق ہے۔ ریاضت سے بدن کو اتنا نہ تھکاؤ کہ دل بیزار ہو جائے اور شاق گزرے۔
- گوشت میں لوکی ڈال لیا کرو۔
- اپنے دسترخوان کو سبز چیزوں سے زینت دیا کرو۔ اس لیے کہ سبز چیز اللہ کے نام سے شیطان کو ہانک دیتی ہے۔
- اپنے گھروں، صحنوں اور دہلیزوں کو پاک صاف رکھا کرو۔
- پانی کے برتنوں کو ڈھانپ دیا کرو اور مشکیزوں کے منہ بند رکھا کرو۔
- کھانے کے لیے ہاتھ دھونے کے بعد کپڑے سے مت پونچھو اور گرم کھانے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مت پھونکو۔
- پانی پی کر سانس برتن میں مت چھوڑو۔

وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئے اور دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی: "اے کاش شیخ احمد کبھی بھی نہ آئیں۔"

اسی رات ابوطاہر نے خواب میں اپنے والد شیخ ابوسعید ابوالخیر کو دیکھا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے کہیں جارہے تھے۔

ابوطاہر نے ادب کے ساتھ سوال کیا "حضرت! آپ کہاں جارہے ہیں؟"

شیخ ابوسعید ابوالخیر نے جواب دیا "ابوطاہر! تم بھی میرے ساتھ چلو کہ قلبِ اولیا تشریف لارہے ہیں۔"

ابوطاہر ان کے ساتھ جانے کے لیے کھڑے ہوئے، مگر ان کی آنکھ کھل گئی۔

دوسرے دن صبح ابوطاہر اپنی خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد انھوں نے ایک شخص کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا، انھوں نے شیخ احمد کو ایک نظر میں پہچان لیا۔ ذرا سی دیر کے لیے انھوں نے اپنے آپ سے کہا "اے کاش، یہ خواجہ احمد نہ ہوں اور اگر یہ خواجہ احمد ہوں تو مجھ سے اپنا خرقہ نہ مانگیں۔"

قریب آجانے پر شیخ احمد کو پہچان لیا گیا۔ ابوطاہر نے چند قدم چل کے ان کا استقبال کیا اور کہا "حضرت! میں تو آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

شیخ احمد مسکرانے لگے "واللہ، میں تو یہ جانتا ہوں کہ کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ امانت میں خیانت کرے، تمھارے پاس میری امانت ہے، اس کے بارے میں کوئی خواہش نہ کرو۔"

ابوطاہر کو شرمندگی محسوس ہوئی، کہا "بس ذرا سی غلطی خواہش اور فکر کی وجہ سے ہوگئی تھی۔ ویسے آپ کی جو امانت میرے پاس ہے اسے آپ جب چاہیں لے لیں۔"

خواجہ احمد نے جواب دیا "میں اسی کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

ابوطاہر نے مذکورہ خرقہ ان کے حوالے کر دیا اور سکون کی سانس لی۔

اب آپ ہرات واپس جانا چاہتے تھے لیکن چاہتے یہ تھے کہ ان کو ہرات والے واپس آنے پر مجبور کریں۔

آپ ہرات کے قصبہ شکیباں میں قیام پذیر ہوگئے، یہاں ان کے ساتھ چند دوسرے مشائخ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

ایک شیخ نے آپ سے دریافت کیا "حضرت! کیا آپ ہرات نہیں جائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا "کیوں نہیں، میں ہرات ضرور جاؤں گا لیکن اس کی ایک شرط ہے۔"

شیخ نے پوچھا "وہ کیا؟"

آپ نے جواب دیا "ہرات کے شیخ جن کا تعلق انصاریوں سے ہے، جب وہ لے جائیں گے تو میں ضرور



جاؤں گا۔"

یہ باتیں ہرات کے شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کے صاحبزادے جابر کو پہنچیں تو انھوں نے اعلان کر دیا "ہم خواجہ احمد کے پاس جائیں گے اور ان کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر ہرات لائیں گے۔"

اس کے بعد شیخ جابر نے ہرات میں اعلانِ عام کر دیا کہ ہم سب عنقریب خواجہ احمد کے پاس جائیں گے اور ان کو اپنے شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کے محافہ میں بٹھا کر ہرات کے دروازے تک لائیں گے۔ اس کے بعد ان کو محافہ سے نکال کر کاندھے پر بٹھایا جائے گا، اور وہ بصد ادب و احترام ہرات میں داخل ہوں گے۔"

اس اعلان نے ہرات کے مشائخ اور علماء کو ایک جگہ جمع کر دیا اور پھر جابر بن عبداللہ انصاری کے ساتھ یہ لوگ موضع تکیاں پہنچ گئے۔ شیخ الاسلام کا محافہ ان کے ساتھ تھا۔

شیخ احمد نے ان آنے والوں پر نظرِ کیمیا اثر ڈالی تو سب گنگ و ساکت ہو گئے۔ کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

ایک دن یہ سب شیخ احمد کے مہمان رہے، دوسرے دن شیخ جابر بن عبداللہ نے ان سے کہا "یا شیخ! کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "تم سب مجھ کو ہرات لے جانا چاہتے ہو؟"

شیخ جابر نے کہا "بے شک۔ آپ درست فرما رہے ہیں لیکن کس طرح؟ یہ شاید آپ نہیں جانتے۔"

آپ نے جواب دیا "میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں۔"

شیخ جابر بن عبداللہ نے عرض کیا "میں اپنے والد مرحوم شیخ الاسلام عبداللہ کا محافہ اپنے ساتھ لایا ہوں، آپ اس محافہ میں سوار ہو جائیں گے اور ہم سب مشائخ اور علماء اس محافہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیں گے اور پھر جب ہم سب ہرات میں داخل ہوں گے تو اس طرح کہ آپ ہمارے کاندھوں پر سوار ہوں گے۔"

اس کے بعد شیخ احمد سے درخواست کی گئی کہ محافہ میں بیٹھ جائیں۔

آپ محافہ میں بیٹھ گئے تو اگلے دونوں ڈنڈوں کو شیخ جابر بن عبداللہ انصاری اور قاضی ابوالفضل نے اپنے اپنے کاندھوں پر رکھ لیا اور پچھلے دونوں ڈنڈے امام ظہیرالدین اور امام فخرالدین علی کے کاندھوں پر رکھ دیے گئے اور ان کا محافہ اس شان سے ہرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

چار محافہ بردار کسی اور کو محافہ کے پاس آنے نہیں دے رہے تھے۔ محافہ کے اندر خواجہ احمد بیٹھ تو گئے تھے لیکن انھیں اس سے بڑی شرم آ رہی تھی۔ ابھی محافہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ خواجہ احمد نے حکم دیا "محافہ کو یہیں زمین پر رکھ دیا جائے۔"

چنانچہ محافہ کو زمین پر رکھ دیا گیا۔ آپ نے چاروں محافہ برداروں کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کچھ جانتے ہو کہ عقیدت کسے کہتے ہیں؟"

سب نے متفقہ طور پر ایک ہی جواب دیا "ہم کیا بتائیں گے آپ ہی بتائیں۔"

آپ نے جواب دیا "عقیدت نام ہے فرماں برداری و اطاعت گزاری کا۔"

سبھی نے اس تعریف سے اتفاق کیا۔ "بجا ارشاد، بجا ارشاد۔"

آپ نے فرمایا "اب اگر تم لوگ مجھ سے عقیدت رکھتے ہو تو میرا حکم مانو، میں جو کچھ کہوں اس کو بے چون و چرا تسلیم کرلو۔"

کسی میں بھی اتنا دم نہ تھا کہ آپ کی بات نہ مانتا۔ چاروں نے ایک ہی بات کہی "آپ حکم تو دیں، ہم آپ کی ہر بات مان لیں گے۔"

آپ نے فرمایا "تم سب ذی علم ہو، اللہ نے تم سب کو علم کی دولت سے نواز رکھا ہے اس لیے تم سب میرے ساتھ محافہ میں بیٹھ جاؤ اور عوام کا یہ ہجوم باری باری محافہ کو اٹھائے اور ہرات تک لے جائے۔ اس طرح دس پانچ پر ہی ہمارا بوجھ نہیں پڑے گا۔"

سب نے آپ سے اتفاق کیا اور چاروں بزرگ محافہ میں سوار ہو گئے۔ ہجوم نے محافہ کو باری باری اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ جب یہ لوگ ہرات میں داخل ہوئے تو ہجوم کے بہت سارے لوگ آپ کی خدمت میں یہ شکایت لے کر حاضر ہوئے کہ



انھیں محافہ کو کاندھے پر اٹھانے کی سعادت سے محروم رکھا گیا۔

آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا "اللہ تم کو دوسری برکتوں سے نوازے گا، اس کی رحمت سے مایوس مت ہو۔"

ہرات میں حضرت عبداللہ انصاری کی خانقاہ میں آپ نے قیام کیا۔ یہاں آپ کے پاس دور دور سے لوگ صرف ملاقات اور زیارت کرنے آرہے تھے۔

ہرات ہی میں ایک ایسے شیخ بھی تھے جنھوں نے سالہا سال سے روزۂ وصال رکھا ہوا تھا۔ بیوی گھر میں موجود تھی لیکن اس سے شیخ بالکل لاتعلق رہتے تھے۔ شہر کے ایک رئیس نے ان کے اس عہد اور روش کو اتنا پسند کیا تھا اور اس کا اتنا اثر قبول کیا تھا کہ انھوں نے اپنا ایک بیٹا شیخ کی خدمت میں چھوڑ دیا تھا۔

شیخ نے خواجہ احمد کا چرچا سنا تو اپنی بیوی سے کہا "میرے کپڑے لا، میں بھی شیخ احمد سے ملوں گا اور دیکھوں گا کہ یہ آخر ہیں کیا۔"

بیوی نے جواب دیا "میں کپڑے تو آپ کو دے دوں گی لیکن آپ وہاں جاکے شیخ کا امتحان نہ لیجیے گا۔"

شیخ نے کہا "تو فضول باتیں نہ کر۔ میں وہاں جو چاہوں کروں، تو منع کرنے والی کون۔"

بیوی نے جواب دیا "میں آپ سے بحث تو کرنے سے رہی لیکن میں نے شیخ احمد کے بارے میں جو کچھ سُن رکھا ہے وہ یہی ہے کہ اس وقت ان کے پایہ کا دوسرا کوئی بزرگ نہیں۔ آپ کو ان سے نقصان نہ پہنچ جائے کہیں۔"

شیخ نے بیوی کو بحث کرنے سے روک دیا "مجھے کپڑے لادے اور اپنے کام سے کام رکھ۔"

بیوی نے شوہر کو کپڑے دیے اور شیخ بن سنور کر خواجہ احمد کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ نے خواجہ احمد کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور مسکرانے لگے۔

شیخ نے پوچھا "حضرت! یہ آپ مجھ پر مسکرا کیوں رہے ہیں؟"



خواجہ احمد نے جواب دیا "تیری سادہ لوحی پر، حالاں کہ تیری بیوی تجھ سے زیادہ باخبر ہے۔"

شیخ نے پوچھا "وہ کس طرح؟ یہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہوئی؟"

خواجہ احمد نے جواب دیا "اس نے تجھ کو منع کیا تھا کہ تو میرا امتحان نہیں لے گا لیکن تو امتحان لینے آگیا۔"

شیخ آپ سے مرعوب ہوگیا "اب آپ کیا فرما رہے ہیں میرے بارے میں؟"

خواجہ احمد نے جواب دیا "میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے جو سالہا سال سے وصال کا روزہ رکھا ہوا ہے اس سے تو کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟"

شیخ نے کہا "میرا خیال ہے دنیا کی ساری برائیاں عورت اور مرد کے اتصال اور وصال ہی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لیے میں نے اس سے توبہ کرلی۔"

خواجہ احمد نے فرمایا "اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے، اس سے گریز اور انکار گویا اللہ کی بڑائی اور تخلیق پر اعتراض کرنا ہے۔"

شیخ کی سمجھ میں ساری باتیں آتی جارہی تھیں، پوچھا "اب آپ کیا حکم دے رہے ہیں؟"

خواجہ احمد نے فرمایا "واپسی میں تیرا گزر کوچہ سنگین سے ہوگا، وہاں محمد قصاب مروزی کی دکان پر آنکڑے میں ران کا گوشت لٹکا ہوگا اسے خرید لینا اور پھر بقال سے روغن لے کر شیر خرمہ کا سامان بھی خرید لینا۔ یہ سارا سامان بیوی کو دے کر کہنا کہ گوشت کا تو قلیہ بنا دے اور شیر خرمہ اور روغن سے حلوہ تیار کردے۔ اس کے بعد روزہ وصال کا افطار کرنا یعنی یہ کہ تو نے اب تک جو غفلت اور کوتاہی حقوق زوجیت کی ادائیگی میں اختیار کر رکھی تھی اس کو ختم کردیا جائے۔ تو نے اپنی بیوی پر بڑا ظلم کیا۔ اس کے بعد تو دیکھے گا کہ تجھ پر کیا کچھ منکشف ہوجائے گا۔"

شیخ نے وہی سب کیا جس کا خواجہ احمد نے حکم دیا تھا، انھوں نے اپنے باطن میں روشنی محسوس کی، اس روشنی میں پورا ہرات انھیں صاف نظر آرہا تھا، ہرات کی ہر شے، ہر شخص اپنی اصل شکل میں۔ شیخ بھاگے بھاگے خواجہ احمد کے پاس گئے اور ان کو سب کچھ بتا کے کہا "اب پورا ہرات میری باطن کی نظروں کے سامنے ہے، ہرات کا ہر شخص میرے سامنے ہے، ہرات کی ہر چیز میں واضح طور پر دیکھ رہا ہوں۔"

خواجہ احمد نے فرمایا "شیخ! میں تو تجھ کو بڑے ظرف کا سمجھ رہا تھا مگر تو ہرات ہی پر قانع ہوگیا۔ اب اسی پر صبر اور قناعت کر۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ تجھ کو اس سے زیادہ دے دیا جائے، خیر اللہ کی مرضی۔"

خواجہ احمد نے تعلیم بالکل حاصل نہیں کی تھی لیکن باتیں بڑی عالمانہ کرتے تھے، شادی کرلی اور ان سے اولاد بھی ہوئی۔ آپ کے عقیدت مندوں کو اس بات کا دکھ تھا کہ آپ باتیں تو بہت عمدہ کرتے ہیں مگر ان باتوں کو کتابی شکل میں محفوظ نہیں کرسکتے۔ جب آپ سے اس کا ذکر کیا جاتا تو آپ فرماتے "مت فکر کرو، کتابیں بھی لکھ دی جائیں گی۔" جب آپ چالیس سال کے ہوگئے تو یکایک آپ نے روپوشی اختیار کی اور پہاڑوں میں تشریف لے گئے، وہاں آپ کو مطلع کیا گیا کہ آپ کو اللہ نے علم لدنی سے نواز رکھا ہے۔ اب آپ پڑھ بھی سکتے تھے اور لکھ بھی سکتے تھے، اور اب تصنیف و تالیف کا آغاز ہوگیا۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں، ان میں سراج السالکین کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ان کتابوں کے طفیل غیر مسلموں نے اسلام قبول کرنا شروع کردیا۔ کہتے ہیں آپ نے ہزاروں غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔

کسی نے آپ کی دعوت کی تھی اور آپ وہاں جانے کی تیاری کرچکے تھے، آپ کا خدمت گار آپ کی جوتیاں صاف کر رہا تھا، جب صاف کرچکا تو آپ کے پاؤں کے پاس رکھ کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔

کچھ دیر بعد آپ نے اس سے پوچھا "تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟"

خادم نے جواب دیا "آپ دعوت میں جانے والے ہیں، جب تک آپ یہاں موجود ہیں میں یوں ہی باادب کھڑا رہوں گا۔"

آپ نے کہا "ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ کچھ دیر ٹھہر جا، کچھ لوگ ملنے آرہے ہیں۔"

ابھی آپ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک ترکمان اپنی بیوی اور بارہ سالہ لڑکے کے ساتھ آپ کے پاس آیا۔ لڑکا باپ کا ہاتھ پکڑے سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔



ان تینوں نے آتے ہی آپ کو سلام کیا۔ آپ نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا یہ بالکل اندھا ہے؟"

ترکمان نے جواب دیا۔ "جی ہاں یہ نابینا ہے۔ ہمارے لیے اس کا نابینا ہونا سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔"

آپ نے لڑکے کو بغور دیکھا اور فرمایا۔ "لڑکا تو بہت حسین ہے پھر یہ اللہ نے ایسا کیوں کیا؟"

خواجہ احمد کی پیشانی پر سلوٹیں پیدا ہو گئیں۔ "اے شخص! تو اللہ کی شان میں گستاخی نہیں کرے گا۔ اگر تو باز نہ آیا تو یہاں سے میں چلا جاؤں گا۔"

ترکمان نے جواب دیا۔ "میں تو آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔"

خواجہ احمد نے پوچھا۔ "تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

ترکمان نے اپنے اندھے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ نے اسے دیکھا۔ میرا یہی ایک بیٹا ہے جو نابینا ہے۔ بتلائیے میں کیا کروں؟"

خواجہ احمد نے کہا۔ "لیکن اس کو نابینا کس نے کیا؟ میں نے یا کسی اور نے؟"

ترکمان نے عرض کیا۔ "یہ پیدائشی نابینا ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

ترکمان رونے لگا۔ "میں اس لڑکے کی خاطر شہر شہر خوار ہوتا پھرا ہوں، جہاں بھی امید نظر آئی میں وہاں پہنچ گیا لیکن یہ نابینا ہی رہا۔"

آپ نے پوچھا۔ "پھر میں کیا کروں؟ میرے پاس کیوں آیا ہے تو؟"

ترکمان نے جواب دیا۔ "آپ اس کے حق میں دعا کریں۔ میں یہاں سے اس کی بینائی لے کر جاؤں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ یہ کام تو حضرت عیسیٰؑ کیا کرتے تھے۔ مُردوں کو زندہ کر دینا، نابینا کو بینا کر دینا۔"

ترکمان نے جواب دیا۔ "اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رسولِ مقبولؐ کی اُمّت میں ایسے باکمال بزرگ پیدا ہوں گے جو پچھلے نبیوںؑ جیسے کمالات کا مشاہدہ کرا دیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں ایک دعوت میں جا رہا تھا کہ تیری وجہ سے رُک گیا۔ جا، کہیں اور جا۔ تیرے معاملے میں میں کیا کر سکتا ہوں بھلا؟"

ترکمان نے جواب دیا۔ "اور اب آپ ہم دونوں کا فیصلہ بھی سُن لیں۔ ہم یہاں یہ فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ یا تو بیٹے کی بینائی حاصل کر لیں گے ورنہ ہم دونوں یہاں کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے مر جائیں گے۔"

آپ پریشان ہو گئے۔ "یہ کیسی زبردستی کی باتیں کر رہا ہے تو؟"

آپ نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور دالان کی طرف چل دیے۔ چند مشائخ بھی اس تکرار کو سُن کر وہاں کھڑے ہو گئے تھے۔

ترکمان اور اس کی بیوی کو یہ شبہ ہوا کہ شاید آپ ان تینوں کو چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں۔ دونوں نے اپنے سر زمین پر زور سے مار دیے۔

آپ نے دونوں کو اس حال میں دیکھا اور فرمایا۔ "ہم کیا کرتے ہیں؟"

خادم نے آپ کو مطلع کیا۔ "وہ دونوں اپنے سر زمین پر پٹک رہے ہیں۔"

آپ نے مزید فرمایا۔ "حضرت عیسیٰؑ تو مُردوں کو زندہ اور اندھوں کو بینا کر دیا کرتے تھے مگر دیکھو ہم کیا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد آپ ایک چبوترے پر بیٹھ گئے اور خادم کو حکم دیا۔ "نابینا لڑکے کو میرے پاس لے آ۔"

خادم نابینا لڑکے کو آپ کے پاس لے گیا۔ آپ نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اپنے دونوں انگوٹھے اس کی آنکھوں پر رکھ کے فرمایا۔ "انظر باذن اللہ (اللہ کے حکم سے دیکھ)۔" آپ نے یہ جملہ تین بار ادا کیا۔

آپ نے دونوں انگوٹھے آنکھوں پر سے ہٹا لیے۔ لڑکے نے آپ کی طرف دیکھا اور حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

خادم نے ترکمان اور اس کی بیوی کو بتایا کہ "تمھارے بیٹے کو بینائی مل گئی، اب اپنے سروں کو کیوں پٹکتے ہو۔"

دونوں دیوانہ وار بیٹے کے پاس آئے اور اس کو بینا دیکھ کر اس کی آنکھیں چومنے لگے۔

جو مشائخ وہاں موجود تھے انھوں نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت! دو باتیں وضاحت طلب ہیں، کیا آپ ان کی وضاحت فرمائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ضرور پوچھیں۔"



آپ سے پوچھا گیا "آپ نے پہلے تو یہ فرمایا کہ مُردوں کو زندہ اور اندھوں کو بینا کرنا حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں شامل ہے اور اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ان دونوں باتوں سے آپ کی کیا مراد تھی؟"

آپ نے جواب دیا "پہلی بات کہ مُردوں کو زندہ اور اندھوں کو بینا کرنا حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں شامل ہے، میری اپنی بات تھی۔ یہ میں نے کہا تھا لیکن دوسری بات کہ ہم کیا کرتے ہیں، میری اپنی نہیں۔ اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ یہ الفاظ مجھ سے کہلوا دیے گئے اور جس نے یہ الفاظ کہلوائے تھے اس نے نابینا کو بینا کر دیا۔"

آپ کے پاس علماء اور مشائخ ہر وقت موجود رہتے تھے، حالاں کہ اس سے آپ کو تخلیہ نہیں ملتا تھا اور پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ یہ علماء آپ سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے تھے۔ آپ ان کو ہمیشہ مُقلّد کہا کرتے تھے۔ یہ بات علماءِ کرام کو گراں گزرتی تھی۔ اسی طرح ہرات کے علماء نے ایک بار آپ سے توحید اور معرفت پر گفتگو شروع کر دی۔ علماء نے بڑے جوش و خروش سے دلائل دینا شروع کیے۔ آپ نے نہایت تحمل سے سب کچھ سن کر فرمایا "یہ جو کچھ آپ صاحبان کہہ رہے ہیں تقلیداً کہہ رہے ہیں۔"

علماء کو آپ کی یہ بات بہت گراں گزری، بہت جز بز ہوگئے، کہنے لگے "حضرت! ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ ہم نے خاصا علم حاصل کیا ہے اور اگر آپ چاہیں تو ہم اللہ کی ذات پر ہزاروں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ ہزاروں نہیں اس سے زیادہ بھی دلائل دے دیں گے، تب بھی مُقلّد ہی کہلائیں گے۔"

علماء نے پوچھا "وہ کیوں؟"

آپ نے فرمایا "دلیل وہی بھاتی ہے جو دوسرے دے چکے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی تقلید ہے لیکن میں جو دلیل دوں گا وہ سابقہ دلیلوں سے بالکل مختلف اور منفرد ہوگی۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا "موتیوں کے تین دانے اور ایک طشت لے آ۔"

خادم دونوں چیزیں فوراً لے آیا۔

آپ نے علماء سے پوچھا "ان موتیوں کی حقیقت سے تو آپ سب اچھی طرح واقف ہوں گے؟"

جواب ملا "خوب اچھی طرح، نیساں کی بارش کا ایک قطرہ جس کو صدف اپنے پیٹ میں لے لیتی ہے اور یہ قطرہ اللہ کی قدرتِ کاملہ سے موتی بن جاتا ہے۔"

آپ نے موتیوں کو طشت میں ڈال دیا "اب آپ لوگوں میں سے جس کا جی چاہے یہ کہے (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)۔ آپ کی زبان میں اتنا اثر ضرور ہونا چاہیے کہ یہ تینوں موتی ایک بار پھر پگھل کر پانی ہو جائیں۔"

علماء نے کہا "ایسا کس طرح ممکن ہے، کم از کم اپنی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی۔"

آپ نے جواب دیا "میں جو کہہ رہا ہوں بالکل ممکن ہے، آپ لوگ کہیں تو سہی۔"

علماء نے کہا "اگر یہ ممکن ہے تو پہلے آپ کہیں بعد میں ہم کہیں گے۔"

آپ نے کہا "آپ کہیں تو میں بھی کہوں گا۔"

علماءِ کرام میں سے ہر ایک نے باری باری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا لیکن موتی جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

علماء نے کہا "حضرت! اب آپ کی باری ہے اب آپ کہیں۔"

اس وقت آپ کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نمودار ہوئی۔ علماءِ کرام نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ آپ کی نظریں موتیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا، تینوں موتی حرکت میں آ گئے، وہ طشت میں تیزی سے چکر لگانے لگے اور پھر پانی بن کر تینوں ایک ہو گئے۔ آپ نے فرمایا، اسکن باذن اللہ (اللہ کے حکم سے ٹھہر جا) وہ پانی ایک جگہ ٹھہر گیا اور پھر آہستہ آہستہ ایک موتی بن گیا۔

آپ نے فرمایا "یہ تین موتی تھے لیکن اب تینوں ایک ہو گئے ہیں، یہ ہے اللہ کی قدرتِ کاملہ، وہ اللہ جس کے لیے آپ کے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔ اللہ دلیلوں کا محتاج نہیں۔"



علماءِ کرام حیران و پریشان کبھی آپ کو اور کبھی اس موتی کو دیکھ رہے تھے۔

ابو طاہر جن سے آپ نے خرقہ حاصل کیا تھا، ہرات میں ہی قیام فرماتے تھے، آپ ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے، ابو طاہر نے بھی بڑا بلند مقام پایا تھا۔ ایک بار ان دونوں میں مقابلہ سا ہو گیا۔

ان دنوں خواجہ احمد کا جی چاہتا تھا کہ زرد آلو مل جائے تو کھائیں۔ آپ نے اپنے نفس سے کہا: "زرد آلو تو تجھ کو کھانے کو مل جائے گا لیکن اس کے لیے تجھ کو ایک سال تک روزے رکھنے ہوں گے۔"

نفس اس پر آمادہ ہو گیا اور آپ نے پورا ایک سال روزوں میں گزار دیا، سال پورا ہوا تو آپ کے نفس نے زرد آلو کا مطالبہ شروع کر دیا۔

آپ ایک باغ میں پہنچے، یہاں زرد آلو زمین پر پڑے رہتے تھے، یہ باغ آپ کا اپنا تھا اور ورثے میں ملا تھا، ایک مدت بعد یہاں آنا ہوا تھا، زمین پر گرے ہوئے آلو گیدڑ کھا چکا تھا کیوں کہ گیدڑ کو یہ بہت پسند تھے، اتفاق سے ایک زرد آلو نظر آیا۔ آپ نے اس پر اکتفا کیا اور اٹھا کر کھا گئے، اس کے بعد آپ نے چند زرد آلو درخت سے توڑے اور ان میں سے کچھ کھا گئے اور کچھ آستین میں دوسرے وقت کے لیے رکھ لیے، یہاں سے چل کے راستے میں ابو طاہر کے پاس رک گئے، آپ نے بچائے ہوئے زرد آلو ابو طاہر کو پیش کر دیے۔

شیخ ابو طاہر کچھ دیر زرد آلو کو دیکھتے رہے اس کے بعد کہا: "اے احمد! مالِ وقف میں سے لائے ہوئے زرد آلو مجھ کو دے رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "مالِ وقف میں سے نہیں، اپنی ملک میں سے لایا ہوں، اپنے ہاتھ سے توڑ کر لایا ہوں۔"

لیکن ابو طاہر نے آپ کی بات نہیں مانی: "خوب، مالِ وقف سے زرد آلو توڑ کر لائے اور اپنی ملک کہہ کر مجھے دے رہے ہو، ہم کو اندھا سمجھ رہے ہو۔"

آپ ابو طاہر کی باتیں سنتے رہے اور دل میں دعائیں مانگتے رہے کہ اے اللہ، تو خوب جانتا ہے کہ وہ باغ جہاں سے میں زرد آلو لایا ہوں میری ملکیت ہے، کیوں کہ وہ باغ مجھے اپنے باپ کے ورثے میں ملا ہے، اے اللہ، اس حقیقت کو تو شیخ ابو طاہر پر منکشف کر دے۔"

خواجہ احمد ان کے سامنے خاموش کھڑے تھے، ابو طاہر نے کہا: "خواجہ احمد! کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔"

خواجہ احمد ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

ابو طاہر نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر بلایا، جب وہ آ گیا تو اسے حکم دیا: "جاؤ، اپنے گلے میں سے ایک بکری لو، اسے ذبح کرو اور اسے پکوا کر لاؤ، کیوں کہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ خواجہ احمد کا بھوک سے برا حال ہے اور یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔"

خواجہ احمد خاموش رہے، کچھ دیر بعد جب کھانا تیار ہو کر آیا تو کھانے کو دیکھ کر خواجہ احمد کو محسوس ہوا کہ انھیں شوربا اور گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا ہے، یہ صرف روٹی کھانے لگے۔

ابو طاہر نے کہا: "اے احمد! تم گوشت اور شوربا کیوں نہیں کھا رہے؟"

آپ نے جواب دیا: "مجھے گوشت اور شوربا کھانے سے روک دیا گیا ہے، اس لیے روٹی کافی ہے۔"

ابو طاہر نے اصرار کیا: "خواجہ احمد! آپ مجھ سے صاف صاف باتیں کریں، اگر آپ پر کچھ القا ہوا ہے تو بتا دیں تاکہ میں بھی حقیقت سے واقف ہو جاؤں۔"

آپ نے جواب دیا: "ابھی جب میں گوشت اور شوربے کا پہلا لقمہ لینے والا تھا تو مجھ کو اس سے روک دیا گیا اور بتایا گیا کہ گوشت حلال کا نہیں ہے۔"

ابو طاہر نے کہا: "میرے پاس جو جانور ہیں میرے ہیں، میری ملکیت ہیں پھر آپ یہ بات کس طرح کہہ رہے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا وہ آپ کو بھی بتا دیا اب جھوٹ سچ کے لیے اپنے فرزند کو بلائیں، وہ بتائے گا۔"

ابو طاہر نے اپنے فرزند کو بلا کر دریافت کیا: "صاحبزادے! سنو یہ خواجہ احمد کیا کہہ رہے ہیں؟"

بیٹے نے خواجہ احمد سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"



آپ نے اپنا القابیان کر دیا۔ "مجھے گوشت اور شوربے سے روک دیا گیا ہے، وجہ تم بتاؤ گے۔"

بیٹے نے باپ کو مخاطب کیا "باوا جان! جب آپ نے مجھے حکم دیا تھا، بکریوں کا ریوڑ چرنے کے لیے جا چکا تھا۔ میں یہ گوشت قصاب سے لے آیا۔"

ابوطاہر نے حکم دیا "اچھا اب اس قصاب کو بلالا۔"

وہ قصاب بلوا لیا گیا۔ ابوطاہر نے پوچھا "یہ گوشت جو تو نے دیا تھا، کیسا تھا؟ تو یہ جانور کہاں سے لایا تھا؟"

قصاب نے جواب دیا "حضرت! اب میں آپ سے جھوٹ بولنے سے رہا۔ جب آپ کے صاحبزادے میرے پاس پہنچے اس سے ایک ساعت پہلے شہر کوتوال نے کسی سے ایک بکرا زبردستی چھین کر میرے حوالے کر دیا تھا۔ پھر اس کا آدھا گوشت خود لے گیا اور آدھا میرے حوالے کر گیا۔ وہ میرے حصّے کا گوشت رکھا تھا کہ آپ کے صاحبزادے پہنچ گئے اور میں نے ان کو دے دیا۔"

ابوطاہر نے سر جھکا لیا اور خواجہ احمد چپ چاپ اٹھے اور وہاں سے چلے آئے۔

راستے میں ایک جگہ چند درویش یک جا تھے۔ یہاں درویشوں کا حجرہ تھا جو کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے، ہمیشہ ہی سفر میں رہتے تھے، آپ بھی ان درویشوں میں شامل ہو گئے۔ ایک درویش نے ان کو دیکھا تو دوسروں سے کہا "یہ شیخ احمد ہیں۔ اُمّی۔ مگر موٹی موٹی کتابوں کے مصنّف۔"

دوسرے درویش آپ کو گھیر کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس وقت آپ بے حد اداس تھے، آپ کو یہ دکھ پریشان کر رہا تھا کہ ابوطاہر نے ان کی بات نہیں مانی اور ان کی ذاتی ملکیت کو وقف کہتے رہے۔

کچھ دیر بعد خلافِ توقع ابوطاہر بھی اس حجرے میں پہنچ گئے اور خواجہ احمد سے شکایتہً کہا "حضرت! یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کچھ کہے سُنے بغیر ہی چلے آئے۔"

خواجہ احمد نے جواب دیا "میں آپ سے اور اپنے آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔"

ایک درویش نے ابوطاہر سے پوچھا "اے ابوطاہر! یہ تو بتاؤ کہ تم نے ذاتی اور موروثی ملکیت کا نام وقف کا مال کیوں رکھ لیا؟"

ابوطاہر گھبرا گئے اور اس درویش سے پوچھا "مگر تو کون ہے؟"

درویش نے جواب دیا "میں جو کچھ بھی ہوں وہ تو معلوم ہو ہی جائے گا مگر میں پوچھتا ہوں کہ تو کون ہے؟ اپنے حرام گوشت کو حلال کہنے والا اور دوسروں کی ملکیت کو وقف کہنے والا۔"

یہ بات پوری ہوئی تو درویش خود غائب ہو گیا۔ دوسرے درویش ہنسنے لگے۔

ابوطاہر نے پوچھا "یہ درویش کون تھا؟ اور کہاں چلا گیا؟"

ایک درویش نے جواب دیا "ہم سیر و سفر کے خوگر لوگ تو ان سے اچھی طرح واقف ہیں، یہ خواجہ خضر تھے، لیکن تم حضری لوگ ان کو نہیں جانتے۔"

اب ابوطاہر اپنی جگہ بے حد شرمندہ تھے، کہنے لگے "اے خواجہ احمد! میں نے ملک کو وقف کہہ کر آپ کو جو دُکھ پہنچایا ہے اس پر بے حد شرمندہ ہوں۔"

پھر دونوں بزرگ ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے۔

پیدا کہاں پھر ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

خواجہ احمد کا سالِ ولادت، ۴۴۱ھ (۱۰۴۹ع) اور سنِ وفات، ۵۳۶ھ (۱۱۴۱ع) بیان کیا جاتا ہے۔

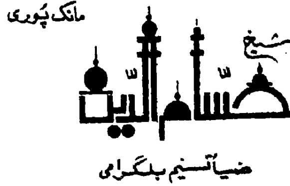


مضمون کے مآخذ

نفحات الانس	اخبار الاخیار	تذکرۃ الاولیاء	لطائفِ اشرفی
مولانا جامی	شیخ عبدالحق محدّث دہلوی	شیخ فرید الدین عطّار	ترجمہ، شمس بریلوی



مانک پوری



ضیا تسنیم بلگرامی

ان کے دادا بھی بلند پایہ صوفی تھے اور باپ بھی۔ ظاہری اور باطنی علوم انہیں اپنے گھر ہی میں حاصل ہو سکتے تھے اور کسی حد تک حاصل بھی کیے۔ لیکن ان کی قسمت کے علوم کہیں اور تھے۔ ان کا اپنے گھر میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ باپ کو ان کی یہ بات ذرا بھی پسند نہ تھی۔ لیکن دل کی آگ فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی گئی۔ خوابوں اور خیالوں میں انہیں آوازیں دی جا رہی تھیں۔ انہیں بلایا جا رہا تھا۔ ایک مقناطیسی شخصیت سیکڑوں میل دور سے انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ آخر یہ اُس طرف کھنچ گئے۔ وہاں کیا تھا؟ ایک شخص مگر نورانی، اس کے نام کے ساتھ بھی لفظ "نور" لگا ہوا تھا۔ وہاں جو علوم آناً فاناً آپ میں منتقل کیے گئے ان سے آپ کو کتابوں کی حاجت نہیں رہی۔ ان کے دل و دماغ کو روشنی عطا ہوئی۔ اس روشنی میں وہ ہر شے کی بابت سمجھ لیتے تھے۔ وہ صوفی تھے۔ ولی تھے سالک تھے اور عارف تھے۔ بیک وقت اتنا کس کو ملا ہے اور کس کو ملتا ہے۔ چشتیہ سلسلے کا ایک روشن چراغ، اس چراغ کی روشنی آج بھی موجود ہے۔ نہ بجھنے والا یہ چراغ زمانی فاصلے کے ساتھ ساتھ روشن سے روشن تر ہوتا چلا جائے گا۔ اللہ کے یہ بندے واصل بحق ہو کر ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے۔

یو۔پی (بھارت) میں الہ آباد سے قریب مانک پور میں جلال الدین اس لیے زیادہ مشہور تھے کہ اُن کا رجحان تصوّف کی طرف تھا، پیشہ کتابت تھا۔ قرآن پاک کی کتابت فرمایا کرتے تھے۔ جب قرآن پاک کی کتابت مکمل ہو جاتی تو اسے آپ دہلی بھجوا دیتے تھے وہاں سے اس کا ہدیہ پانچ سو روپے مل جاتے۔ جس سے آپ اپنا اور اپنے گھر کا خرچ چلاتے۔ اُن کے صاحبزادے مولانا خواجہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ شیخ جلال الدین اپنے بیٹے مولانا خواجہ سے ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ بیٹے رزقِ حلال عین عبادت ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔

مولانا خواجہ نے اپنے باپ کی پوری زندگی کو ہمیشہ غائر نظروں سے دیکھا تھا اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

انھوں نے اپنے والد کو دیکھا کہ وہ وضو کرنے میں مشغول ہیں۔ مولانا خواجہ نے سوچا، شاید وہ نماز کی تیاری کر رہے ہیں لیکن یہ نماز کا وقت بھی نہیں تھا، وہ اپنے باپ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور دیکھنے لگے کہ وضو کے بعد وہ کیا کرتے ہیں؟

شیخ جلال الدین نے وضو کے بعد قلم دوات اور وصلی سنبھالی اور لکھنے بیٹھ گئے۔ یہ اپنے والد کی پشت پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ اُس وقت وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ رہے تھے۔ مولانا خواجہ دم سادھے چپ چاپ کھڑے رہے۔ بسم اللہ کے بعد مولانا جلال الدین نے الحمد للہ رب العالمین لکھا اور پھر آگے لکھتے چلے گئے۔ مولانا خواجہ برداشت نہ کر سکے، پوچھا "پدرِ بزرگوار! یہ آپ کیا کرنے لگے؟"

باپ نے جواب دیا "بیٹے! میں نے کلام پاک کی کتابت شروع کر دی ہے۔"

مولانا خواجہ نے کہا "لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ آپ یہی کام کر رہے تھے، پھر یہ دوسرا۔۔۔۔۔"

باپ نے بات کاٹ دی۔ کہا "بیٹا! تو بھی اپنی جگہ درست ہے۔ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہماری گزر بسر اسی سے ہوتی ہے۔ کلام پاک کی کتابت، اس کا ہدیہ، مسائلِ شرعیہ بتانے کے سلسلے میں ملنے والا نذرانہ۔ بس اسی سے اپنی گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

مولانا خواجہ نے اپنے بچپنے سے جوانی تک جو دوسرا منظر دیکھا تھا، وہ بھی دوسروں سے بالکل مختلف تھا۔ جب تک گھر والے

جاگتے رہتے۔ جلال الدین آرام کرتے رہتے اور جب گھر والے سو جاتے تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ اور فجر کے وقت تک عبادت میں مشغول رہتے۔

پھر ایک دن مولانا خواجہ نے دیکھا کہ گھر میں گوشت پکانے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور نہ تو وہ خود کھا رہے ہیں اور نہ کسی اور کو کھانے دے رہے ہیں۔ مولانا خواجہ کا جی چاہتا کہ گوشت کھائیں مگر جلال الدین کا حکم یہ تھا کہ اس کی اجازت نہیں مل سکتی۔ جب بات برداشت کی حد سے گزر گئی تو مولانا خواجہ نے اپنے والد سے پوچھ ہی لیا۔ "پدرِ بزرگوار! آپ کی باتیں کبھی کبھی میری ناقص عقل سے بالا ہوتی ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ گوشت پر پابندی کیوں لگا دی آپ نے؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "بیٹے! آج کل جانوروں کی چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ میں خوفزدہ رہتا ہوں کہ کہیں کسی چوری کے جانور کا گوشت نہ کھلا دیا جائے ہمیں۔"

مولانا خواجہ خاموش ہو گئے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو مزید سمجھایا، کہا۔ "بیٹے! میں نے جو زندگی گزاری ہے وہ تمھارے سامنے ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم میری اتباع کرو۔ اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہاری پشت سے ایک ولی ظاہر ہو گا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں تمھاری تعلیم و تربیت کرتا رہوں اور تمھیں وہ نکات بتاتا اور سمجھاتا رہوں جو آنے والے مردِ باکمال کی رہنمائی کریں۔ کیونکہ قدرت کا ازل سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ وہ پہلے بساط بچھاتی ہے پھر اس پر کھیل شروع ہوتا ہے۔ آنے والے کے لیے میری زندگی اور میرے اعمال نمونہ ثابت ہوں گے۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنی زندگی شرع اور سنتِ نبوی کے مطابق گزاروں اور حرام لقمے سے خود کو محفوظ رکھوں۔ پتا نہیں میں اس میں کتنا کامیاب رہا اور کتنا ناکام لیکن میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے۔ دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔"

مولانا خواجہ کا ذہن رسا ان باتوں کا کچھ اور مفہوم بھی لے رہا تھا۔ ان کا دل بھر آیا اور پوچھا۔ "پدرِ بزرگوار! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ہمیں ۔۔۔ ؟"

جلال الدین نے اپنے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، کہا۔ "نہیں! اس طرح نہیں سوچتے بیٹے! کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا اور کب مر جائے گا۔ اسی طرح میں بھی لاعلم ہوں اور کچھ پتا نہیں کہ کتنی زندگی لے کر آیا ہوں۔"

شیخ جلال الدین اس گفتگو کے بعد زیادہ دن نہیں جیے اور ۱۳۲۵ء میں انتقال فرما گئے۔ ۱۲۳۱ء میں پیدا ہونے والا یہ ولی چورانوے سال زندہ رہا اور جب سفرِ آخرت پر روانہ ہوا تو اپنے بیٹے مولانا خواجہ کو اپنے عکس کی طرح اس دنیا میں چھوڑ گیا۔ اس گھر میں شیخ جلال الدین مرحوم کے وصال کے تقریباً سوا سال بعد ۱۳۴۱ء میں وہ بچہ پیدا ہوا، جس کی وہ پیش گوئی کر گئے تھے۔ مولانا خواجہ نے اس بچے میں وہ نشانیاں بھی دیکھ لیں جن کا بہت پہلے ذکر کیا جا چکا تھا۔ نومولود کا نام حسام الدین رکھا گیا یعنی دین کی تلوار۔ مولانا خواجہ نے اس بچے پر خاص توجہ دینا شروع کر دی۔

حسام الدین نے ہوش سنبھالا تو گھر میں فقر و فاقہ کے علاوہ کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہاں اس فقر و فاقے میں توکل، استغنا اور قناعت کو بے پایاں دیکھا۔ باپ نے خود ہی تدریس کا فریضہ انجام دیا اور ظاہری و باطنی علوم میں نمایاں اور ممتاز کر دیا لیکن حسام الدین کو معلوم نہیں کیوں ایک تشنگی سی محسوس ہوتی رہتی۔

انھوں نے اپنے والد سے جو کچھ بھی پڑھا تھا، وہ تقریباً ازبر ہو گیا تھا۔ ان میں فقہ کی مشہور و معروف کتاب "الہدایہ" بھی شامل تھی۔ حسام الدین اس کتاب کو نہایت ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اسی دوران انھیں بحالتِ خواب ایک بزرگ نظر آئے۔ انھوں نے حسام الدین سے کہا۔ "حسام الدین! میرے پاس آ جاؤ، میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

حسام الدین نے پوچھا۔ "آپ کہاں ملیں گے؟ میں کہاں آؤں؟"

جواب ملا۔ "پنڈوہ ۔ بنگال میں۔"

اس کے بعد حسام الدین کی آنکھ کھل گئی۔ اب ان کی بے قراری میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ مضطرب و بے قرار ادھر ادھر پھرنے لگے۔ مولانا خواجہ نے بھی اپنے بیٹے کی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ پوچھا۔ "حسام الدین! کیا بات ہے؟ آج کئی دن سے میں تمھیں بہت زیادہ پریشان محسوس کر رہا ہوں، کوئی خاص بات ہے؟"

حسام الدین خواب کی بات بتلاتے ہوئے شرم محسوس کر رہے تھے، کیونکہ انھیں اندازہ تھا کہ ان کا صوفی باپ اس خواب سے خوش نہیں ہو گا، جواب دیا۔ "بابا جان! مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں نے کچھ کھو دیا ہے۔ میں ناقص ہوں، میں نامکمل ہوں، معلوم نہیں

ایسا کیوں ہے؟

مولانا خواجہ نے بیٹے کو سمجھایا۔ "حسام الدین! ذکر و فکر میں مشغول ہو جاؤ ساری بے چینی اور بے قراری دور ہو جائے گی۔"

حسام الدین نے عرض کیا۔ "لیکن ذکر و فکر میں بھی تو دل نہیں لگتا۔"

مولانا خواجہ نے اپنے بیٹے کو ذرا غور سے دیکھا۔ "ذکر و فکر میں دل نہیں لگتا! کیا مطلب؟"

حسام الدین نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "پتا نہیں کیوں؟ میں خود پریشان ہوں۔"

مولانا خواجہ نے بیٹے کو تسلی دی اور حکم دیا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمھیں جب بھی وقت ملے، اللہ اکبر کی ضرب میں لگا لیا کرو، یہ تو کر سکتے ہو؟"

حسام الدین نے جواب دیا۔ "کوشش کروں گا۔"

مولانا خواجہ نے کہا۔ "کوشش کروں گا کیا معنی؟ اگر تم یہ نہیں کرو گے تو سوز سے محروم رہو گے، یہ تو تمھیں کرنا ہی ہوگا۔"

مولانا خواجہ کی کوئی بات بھی اُن پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھے کہ آخر یہ بیٹے حسام الدین کو ہو کیا گیا؟

حسام الدین نے اپنے باپ کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ وہ جب بھی موقع ملتا "اللہ اکبر" کی ضرب میں لگانا شروع کر دیتے، لیکن اُن کی اِن ضربوں میں زور نہیں ہوتا تھا۔ اسی دوران حسام الدین نے ان بزرگ کو پھر خواب میں دیکھا۔ وہ سامنے کھڑے کہہ رہے تھے۔ "کیا بات ہے حسام الدین! تو نے میری بات نہیں سُنی؟ میں تیرا انتظار کر رہا ہوں تو میرے پاس کیوں نہیں آتا؟"

حسام الدین نے جواب دیا۔ "حضرت! میں تو کبھی اپنے گھر سے نکلا بھی نہیں پھر میں آپ کے پاس کس طرح آجاؤں؟"

بزرگ نے کہا۔ "پندرہ۔ بس اتنا ہی یاد رکھو، جب بھی میرے پاس آؤ گے، میں تمھیں آسانی سے مل جاؤں گا۔"

حسام الدین کی آنکھ کھل گئی، وہ پریشان ہو کر بیٹھ گئے اور دیر تک اس خواب کے بارے میں سوچتے رہے۔ اب اُن کے دل میں یہ ارادہ جنم لے چکا تھا کہ اس میں وہ اپنے باپ کی بھی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ مولانا خواجہ نے اپنے بیٹے کو پھر اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "بیٹے حسام الدین! میں نے تجھ کو کبھی جبر سے کسی کام پر مجبور نہیں کیا۔"

حسام الدین نے جواب دیا۔ "اور میں نے بھی کبھی آپ کو پریشان نہیں کیا۔"

مولانا خواجہ نے کہا۔ "لیکن آج کل تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔ میں تم سے تمھاری پریشانی کا سبب پوچھتا ہوں مگر تم نہیں بتاتے، پتا نہیں کیوں؟"

حسام الدین نے سوچا کہ اب خواب کا ذکر ضروری ہو گیا ہے کیونکہ شاید وہ اس پریشانی کا کوئی حل بتا دیں۔

مولانا خواجہ نے انھیں سوچتے ہوئے دیکھا تو نہایت شفقت سے کہا۔ "بیٹے حسام الدین! پریشان مت ہو۔ اگر تم کچھ بتانا نہیں چاہتے تو مت بتاؤ، میں نہیں پوچھوں گا۔"

یہ کہہ کے وہ سامنے سے ہٹ گئے۔

اُن دنوں معاشی حالت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ کئی کئی دن کچھ کھائے پیے بغیر ہی گزر جاتے۔ یہ پریشانی اپنے عروج پر اس طرح پہنچ گئی کہ گھر میں تین دن تک کچھ بھی نہیں پکا۔ بھوک نے سب کا بُرا حال کر دیا تھا۔ حسام الدین کی ماں نے مولانا خواجہ سے کہا۔ "کچھ کیجیے۔ اب تو بس مرنا ہی باقی رہ گیا ہے۔"

مولانا خواجہ نے جواب دیا۔ "مت پریشان ہو نیک بخت! یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے۔"

بیوی نے افسردگی سے کہا۔ "اگر یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے لیکن یہی حالت رہی تو ہم بھی چند دنوں بعد نہیں رہیں گے۔"

مولانا خواجہ کو بیوی کی یہ بات بہت گراں گزری، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ایک شخص مولانا خواجہ سے ملنے آیا، بولا۔ "حضرت! میں ایک فتویٰ لینے آیا ہوں آپ کے پاس۔"

مولانا نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ "میں حاضر ہوں، ارشاد فرمائیں۔"

اس شخص نے آپ کے پاس ایک مسئلہ رکھ دیا، اور کہا۔ "میں نے اس سلسلے میں کئی علماء کو زحمت دی مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آخر کئی آدمیوں نے آپ کا نام لیا کہ آپ ہی اس کا تسلی بخش جواب دے سکتے ہیں۔"

آپ نے کچھ دیر بعد فتویٰ تیار کر دیا۔ اس شخص نے اُسے پڑھا اور بے حد خوش ہوا، بولا۔ "واہ وا، ماشاءاللہ، سبحان اللہ۔ آپ کی بابت جیسا سُنا تھا اس سے بڑھ کر پایا، واللہ جی خوش کر دیا۔"

ضعف ونقاہت سے آپ سے بات نہیں ہو رہی تھی، بولے ”تیرا کام ہو گیا، اب جا۔ پھر جب بھی میری ضرورت ہو، میرے پاس آ جانا“

اس شخص نے اپنے نیفے سے ہمیانی نکالی اور اس میں سے دس اشرفیاں نکال کے آپ کی طرف بڑھائیں، بولا ”حضرت! آپ نے میرا جو کام کیا ہے اس کا محنتانہ تو آپ کو دے نہیں سکتا مگر یہ حقیر نذرانہ پیش خدمت ہے قبول فرما کر شکر گزار فرمائیں۔“

نفسِ امارہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آج فاقوں کا تیسرا دن ہے قبول کرلے لیکن نفسِ مطمئنہ نے انھیں روک دیا اور کہا ”خبردار! جو تُو نے یہ رقم قبول کی۔ تُو خدا کے دین کو بیچے گا کیا؟“

بیوی بھی یہ باتیں سُن رہی تھی اور حسام الدین نے بھی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُن لیا۔ ماں نے بیٹے کو اندر بلوایا، اور کہا ”بیٹے حسام الدین! کچھ دیکھا تُو نے؟ تیرے باپ کو یہ ہو کیا گیا ہے آخر؟“

حسام الدین نے جواب دیا ”میرے باپ کو کیا ہو گیا؟ مجھے تو کوئی ایسی ویسی بات نظر آ نہیں رہی۔“

انھوں نے اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا اور اس پر افسوس کرتے ہوئے کہا ”اچھا تو یہ بات ہے۔ تُو بھی اپنے باپ ہی کا ہم خیال ہے۔“

حسام الدین نے جواب دیا ”ماں! میں تقوٰی میں اپنے باپ کا ہم خیال ہوں۔ والدِ محترم نے جو کچھ کیا، انھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔“

ماں بہت برہم تھی، شاید پریشانی اور غصّے میں اپنے بیٹے کی پوری بات سنی بھی نہیں اور حکم دیا ”جا، اپنے باپ کو بلا کر لا میرے پاس۔ جو کچھ میں نے تجھ سے پوچھا تھا، اب میں اُن سے براہ راست پوچھوں گی۔“

آخر لوگوں نے حسام الدین کے باپ مولانا خواجہ کو اُن کی بیوی کے پاس بھیج دیا۔ بیوی نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا، کہا ”گھر میں تین دن سے کچھ بھی نہیں پکا۔ خدا جو عالم الغیب ہے، اُس نے ہم پر ترس کھا کے اس شخص کو بھیجا تھا۔ تم نے اُس کو فتوٰی مفت میں یوں ہی دے دیا۔ وہ اشرفیاں خوش ہو کر دے رہا تھا مگر تم نے بھی اسی خندہ پیشانی سے اُسے واپس کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا آخر؟“

مولانا خواجہ نے جواب دیا ”مجھے تقوٰی نے اُجرت لینے سے روک دیا تھا، میں کیا کرتا۔ میں مجبور تھا۔“

بیوی نے جل کر کہا ”تم جو چاہو کہو۔ میں ان سب کو بآسانی رد کر دوں گی۔ بتاؤ ہم کیا کھائیں؟ وہ اشرفیاں لے لیتے تو ہمارے فاقے ٹل جاتے لیکن تم کیوں لیتے، تمھارا تو اس میں نام مشہور ہو رہا ہے۔“

حسام الدین نے اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی ”ماں! جو بات ختم ہو گئی اب اس کے ذکر سے حاصل؟ اشرفیاں جو چلی گئیں، آپ کے شور و غل سے واپس تو آئیں گی نہیں۔ باوا جان آپ کے جارحانہ انداز سے پریشان ہو رہے ہیں۔“

ماں نے رونا شروع کر دیا ”اپنے تو مقدر ہی میں پریشانیاں لکھ دی گئی ہیں۔ کسی اور کا کیا شکوہ۔“

شام تک یہی ہوتا رہا۔ اس روز کسی دوسرے شہر سے ملک عین الدین نامی ایک امیر مانک پور آیا ہوا تھا۔ وہ دورانِ سفر ایک دعا پڑھا کرتا تھا۔ اس روز دعا کے کسی لفظ نے اس کو شبہے میں ڈال دیا۔ وہ دیر تک اسی الجھن میں مبتلا رہا لیکن جب وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا تو کسی شخص سے اس نے پوچھا ”آپ کے اس مانک پور میں کوئی ایسا عالم بھی ہے جو ہماری علمی مشکلات کو حل کر سکے؟“

امیر کو جواب دیا گیا ”یہاں عالم تو کئی ہیں لیکن مولانا خواجہ کا کوئی جواب نہیں۔ وہ آپ کی علمی مشکلات کو قطعی حل کر سکتے ہیں۔“

امیر پتا پوچھتا ہوا مولانا خواجہ کے پاس پہنچ گیا اور اُن کے سامنے اپنی مشکل رکھ دی۔ آپ نے اس کو لمحوں میں حل کر دیا۔ امیر بہت خوش ہوا۔ اس نے مولانا خواجہ کی خدمت میں بیس اشرفیاں اور چند جوڑے لباس کے پیش کیے اور عرض کیا ”حضرت! یہ حقیر سا نذرانہ ہے۔ اسے قبول فرمالیں، انکار نہ کیجیے کیونکہ یہ میں اپنی الجھن دور ہونے کی خوشی میں دے رہا ہوں۔“

مولانا خواجہ نے اس نذرانے کو قبول کر لیا اور اندر جا کے بیوی کے حوالے کر دیا، کہا ”نیک بخت! دیکھا تُو نے۔ میں نے ناجائز چیز کو ٹھکرا کے جائز کو قبول کر لیا۔ اب تم سب اس نکتے پر غور کرو کہ جو اپنے اللہ پر بھروسا کرتا ہے اور ناجائز چیز ٹھکرا دیتا ہے اس کو اللہ اس طرح جائز طریقے سے نواز دیتا ہے۔ میں نے تو آج رات کو شکرانے کی نمازوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔“

گھر والے اس نذرانے سے بہت خوش تھے۔ حسام الدین نے انھیں سمجھایا ”آپ لوگوں کو پدرِ محترم کا خاص خیال رکھنا چاہیے کیونکہ یہ ہم میں غنیمت ہیں۔“

باپ نے اپنے بیٹے کو گلے لگا لیا اور کہا ”بیٹے! کوئی میرا خیال کرے نہ کرے، کوئی میری بات سمجھے یا نہ سمجھے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تُو تو اس گھر میں ایک ایسا شخص ہے جو میری بات سمجھ لیتا ہے، اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

اس واقعے نے حسام الدین کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی، ایک تہلکہ برپا ہو گیا مگر حسام الدین کو اپنے گھر میں کسی کمی کا احساس

بدستور رہا۔ وہ معلوم نہیں کیوں اب تک یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اُن کی تعلیم و تربیت کسی اور ہی کے ذمے ہے۔ مولانا خواجہ کو اپنے بیٹے کی کیفیت کا کسی قدر علم ہو چکا تھا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حسام الدین گھر کو چھوڑ کر کہیں اور جائیں۔

حسام الدین پر نیم غنودگی طاری تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ انھیں اپنی طرف بلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "حسام الدین! تم میرے پاس آتے کیوں نہیں؟ آخر رکاوٹ کیا ہے؟"

حسام الدین اپنے باپ سے جو کچھ حاصل کر رہے تھے اُسے بند کر دیا۔ باپ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے حسام الدین تم نے پڑھائی کیوں بند کر دی ہے؟"

حسام الدین نے جواب دیا۔ "بس پڑھ چکا۔ اب مجھے بنگال جانا ہے۔ وہاں ایک بزرگ ہیں جو مجھے بلا رہے ہیں۔ اب میں ان سے پڑھوں گا۔"

باپ نے پوچھا۔ "بنگال سے کون بلا رہا ہے تمھیں؟ اور اگر کوئی بلا بھی رہا ہے تو کیا وہ مجھ سے بہتر تمھاری تعلیم و تربیت کر سکتا ہے؟"

حسام الدین نے جواب دیا۔ "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں میرے مقدر کی ڈور کا ایک سرا انھی بزرگ کے ہاتھوں میں ہے اور مجھے جانا پڑے گا۔"

باپ نے روکنے کی کوشش کی۔ کہا۔ "اگر تو نے کوئی ایسا ویسا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تجھے مشورہ کرنے سے پہلے اس پر نظرثانی کرنی چاہیے۔"

حسام الدین نے کراہت اور اکتاہٹ سے منہ بنایا اور کہا۔ "بس بابا جان! آپ اگر اس مسئلے میں خاموش رہیں تو کرم ہو گا کیونکہ میرے پاس اب اس پر غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

باپ نے کہا۔ "حسام الدین! معلوم نہیں تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں تیرے بنگال جانے سے خوش نہیں ہوں۔ مگر تو وہاں جائے گا تو اپنی مرضی اور خوشی سے جائے گا۔"

حسام الدین کو باپ کی ناخوشی گوارا نہیں تھی اور انھوں نے بنگال جانے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔ لیکن اس کے بعد سے ان کی حالت غیر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ان پر ایسا وقت بھی آ گیا کہ وہ توانائی سے محروم ہو گئے۔ اللہ اکبر کی ضرب لگایا کرتے تھے مگر ایک دن جو ضرب لگائی تو چکرا کے گر گئے۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا اس لیے کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے لیکن کئی دن بعد جب پھر اللہ اکبر کی ضرب لگائی تو وہ سب کے سامنے گر گئے۔ لوگوں کو علم تھا کہ باپ بیٹے میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو گیا ہے۔ سوچا شاید بزرگ باپ کی ناخوشی نے یہ حال کر دیا ہے۔ وہ آپس میں حسام الدین کی طرف اشارے کر کے باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "افسوس کہ یہ نوجوان کتنا عقل مند اور اچھا ہوا کرتا تھا مگر اب شاید پاگل ہو گیا ہے۔ اللہ اس پر رحم کرے۔"

انھی باتوں کے دوران حسام الدین نے بنگال جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور لوگوں سے کہا۔ "لوگو! میں پاگل نہیں ہوں اور نہ ہی میری عقل میں کسی قسم کی کمی آئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے پیر و مرشد سے دور ہوں۔"

کسی نے پوچھا۔ "تمھارا پیر کہاں ہے، تمھارا مرشد کون ہے؟"

حسام الدین نے جواب دیا۔ "وہ بنگال میں ہیں۔ میں نے انھیں اپنی زندگی میں ابھی تک نہیں دیکھا۔۔۔۔"

لوگ ہنسنے لگے، بولے "پاگل ایسے نہیں تو اور کیسے ہوتے ہیں۔"

حسام الدین کو اپنے حال پر رونا آرہا تھا، اُن کا دل بھر آیا اور آنکھیں آنسو برسانے لگیں، وہ دل ہی دل میں کہنے لگے "پیر مرشد! میں کتنا مجبور ہوں کہ آنا چاہتا ہوں لیکن نہیں آپاتا۔ اللہ، اب میں کیا کروں، میری مدد فرمائیے۔"

حسام الدین اسی حال میں سوگئے، انھوں نے دیکھا کہ اُن کے پیر مرشد اُن کے پاس کھڑے ہیں اور پوچھ رہے ہیں "حسام الدین! کیا بات ہے؟ تو اداس کیوں ہے، تو رو کیوں رہا ہے؟"

حسام الدین نے جواب دیا "پیر مرشد! مجھے اپنے پاس بلاتے کیوں نہیں؟ اب تو لوگ مجھے احمق اور پاگل کہنے لگے ہیں؟"

مرشد نے کہا "حسام الدین! فکر نہ کر، غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تیرے ساتھ تیرے پاس ہوں اور اب تجھ کو میرے پاس آجانا چاہیے۔ دیر کیوں اور کس بات کی؟"

حسام الدین نے بیدار ہوتے ہی رختِ سفر باندھا اور بنگال روانہ ہوگئے۔ جب خشکی کا سفر ختم ہوگیا تو کشتی کی فکر ہوئی۔ سامنے وسیع و عریض پاٹ والا دریا تھا۔ آپ دوسرے مسافروں کی طرح کشتی پر بیٹھ گئے۔ اُن کے پاس ہی ایک گدڑی پوش فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ شخص کچھ شناسا نظر آتا ہے۔ شاید اس سے پہلے بھی کہیں ملاقات ہوچکی ہے۔ کشتی چلتی رہی اور حسام الدین فقیر کو دیکھتے رہے۔ کئی بار اُن کے جی میں آئی کہ وہ فقیر سے پوچھیں کہ حضرت میں آپ سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں، کہاں؟ یہ آپ بتائیں گے، کیونکہ میرا حافظہ ساتھ نہیں دے رہا۔

لیکن اس سوال کی ہمت نہ کرسکے۔ یہاں تک کہ دوسرا کنارہ قریب ہونے لگا۔ وہ دم بہ دم اُن کے قریب آتا جارہا تھا۔ حسام الدین نے اس فقیر سے سوال کیا "حضرت! میں آپ سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں، ذرا آپ ہی میری کچھ مدد فرمائیں کہ کب اور کہاں؟"

درویش نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے انھیں نظر بھر کے دیکھا اور ہنستا ہوا دریا میں پھاند گیا۔ لوگوں کو شبہ ہوا، چند پیراکوں نے فقیر کا تعاقب کیا اور دریا میں پھاند گئے۔ وہ لوگ فقیر کو دیر تک ادھر اُدھر تلاش کرتے رہے اور آخرکار ناکام اور مایوس واپس آگئے۔ حسام الدین نے اُن سے پوچھا "وہ فقیر چلا؟"

ایک غوطہ خور نے جواب دیا "ہم نے تو انھیں دُور دُور تک اور گہرائی میں جاکے تلاش کیا، وہ فقیر اندر اگر ہوتا تو ضرور مل جاتا لیکن وہ تو اندر ہے ہی نہیں۔"

حسام الدین سوچتے رہے کہ اگر وہ فقیر دریا کی تہ میں بھی نہیں تو کہاں چلا گیا؟ اس سوال کا جواب انھیں سفر کے دوران کہیں بھی نہ مل سکا۔ اب انھیں یہ بھی سوچنا تھا کہ انھیں جانا کہاں ہے۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا "بنگال میں درویش کہاں ملیں گے؟"

کسی نے جواب دیا "پنڈوہ میں۔ یہیں چشتیہ سلسلے کا ایک نامور خانوادہ رہتا ہے۔"

حسام الدین اللہ کا نام لے کر پنڈوہ روانہ ہوگئے۔ وہاں کسی نے انھیں ایک خانقاہ کے در پر لے جاکے کھڑا کردیا اور اندر خبر پہنچائی گئی کہ ایک طالب بہت دُور سے چل کے آیا ہے اور باریابی چاہتا ہے۔

اندر سے جواب آیا "حسام الدین سے کہو، میں کافی دنوں سے تیرا انتظار کررہا ہوں، اندر آجا۔"

حسام الدین ڈرے سہمے اندر داخل ہوئے اور وہاں جن بزرگ کو اپنے سامنے دیکھا، وہ وہی تھے جنھیں خواب میں وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ یہ پنڈوہ کے نامی گرامی بزرگ نور الحق نور قطب عالم تھے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "حسام الدین! تو ہچکچا کیوں رہا ہے؟ میں تو تیرا انتظار کررہا ہوں۔"

حسام الدین نے جواب دیا "حضرت کیا عرض کروں، پدر بزرگوار مجھے یہاں آنے نہیں دے رہے تھے۔"

نور قطب عالم نے افسوس کا اظہار کیا، کہا "نوجوان! فقیر یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا تابع رہے اور صاحبِ عقل کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اپنے ہوش و حواس درست رکھے لیکن جواں مرد وہ ہے جو اپنا تابع بھی رہے اور اپنے ہوش و حواس بھی درست رکھے۔"

حسام مسحور ہوچکے تھے اور نور قطب عالم کہتے رہے "صاحبزادے! اس کی مثال یوں ہے جیسے پانی اور غسل کرنے والا۔ غسل کرنے والا بھی اپنی حالت پر قائم رہتا ہے اور پانی بھی اپنی حالت پر قائم رہتا ہے۔"

جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو حسام الدین اُن کی شکل میں گدڑی پوش فقیر کو دیکھ رہے تھے جو دریا میں چھلانگ لگا کے کہیں غائب ہوگیا تھا۔ حسام الدین نے اس کی تصدیق کرنا چاہی، پوچھا "حضرت! ابھی جب میں آپ کے پاس آرہا تھا تو میرے پاس ایک گدڑی پوش فقیر تشریف فرما تھے کیا وہ....."

نور قطب عالم نے بات کاٹ دی، کہا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، وہ ایک بزرگ تھے، بس تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

اب حسام الدین اپنے پیر مرشد کے پاس رہنے لگے، پہلے حسام الدین کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن اب کتابیں سامنے موجود ہوتیں اور اُن کا اس طرف دل ہی راغب نہ ہوتا۔ ایک دن نور قطب عالم نے اُن سے کہا "کیوں حسام الدین! کتابیں کیوں نہیں پڑھتے؟"

حسام الدین نے جواب دیا "میں کیا جواب دُوں، مجھے تو یہاں آ کے ایسا لگتا ہے گویا میرے علم میں شب و روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

نور قطب عالم مسکرانے لگے۔

یہاں مواعظِ حسنہ، مجاہدے، ریاضت اور نفس کشی نے انہیں کُندن بنا کے رکھ دیا۔ ایک عرصے بعد نور قطب عالم نے انہیں خرقہ خلافت بخش کے حکم دیا کہ اپنے وطن مانک پور واپس جاؤ۔

حسام الدین نے عاجزی سے عرض کیا "میں یہیں رہنا چاہتا ہوں آپ مجھے اپنے سے جُدا نہ کریں۔"

نور قطب عالم نے جواب دیا "حسام الدین! جو کچھ تیری قسمت میں تھا وہ میں نے تجھے بخش دیا، اب یہاں تیرا کیا کام ہے؟"

حسام الدین نے کہا "لیکن میں خود تو اپنے آپ میں بڑی کمی محسوس کر رہا ہوں۔"

نور قطب عالم نے مزید تسلی دی، کہا "ہاں ایسا محسوس ہوتا ہوگا لیکن میں جانتا ہوں کہ تجھ کو اتنا کچھ مل چکا ہے کہ مزید کی گنجائش نہیں رہی اور جو کچھ تجھے ملا ہے اگر تو اس کو کام میں لائے اور اُسے آگے بڑھائے تو یہی بہت کچھ ہے۔"

حسام الدین نے بدرجۂ مجبوری جدائی گوارا کر لی اور اپنے وطن واپس آ گئے۔ یہاں اُن کے والد نے اپنے بیٹے کو اب جو دیکھا تو خوش ہوئے کیونکہ اب حسام الدین پہلے کے مقابلے میں زیادہ عالم، زیادہ درویش اور زیادہ صاحب حال و قال تھے۔

اب حسام الدین کے پاس بھی لوگ آنے لگے تھے۔ لوگ آتے، مرید ہوتے اور پند و موعظت کے تحائف لے کر واپس جاتے۔ آپ کی تدریس و تربیت دوسروں سے مختلف تھی۔ باتوں ہی باتوں میں جو چاہتے بتا دیتے اور وہ باتیں سامع کے دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتیں۔ اس کے علاوہ سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا۔

آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے کہ "دیکھو۔ اگر تم کبھی ایسے درویش سے ملو جو کمزور درجے کا درویش ہو مگر وہ جس سلسلے سے بیعت ہو، وہ مضبوط اور اعلیٰ ہو تو ایسے درویش سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔"

ایک مرید نے پوچھا "وہ کیوں؟ ہمیں تو اس کمزور درویش سے شایانِ شان سلوک کرنا چاہیے یعنی اگر وہ کمزور اور معمولی درجے کا درویش ہے تو اُسے وہ عزت کیوں دی جائے جو کسی اور کا حق ہے؟"

حسام الدین نے فرمایا "تو ٹھیک کہتا ہے لیکن میں نے جو کچھ کہا اس کو میں کسی اور طرح سمجھا دوں گا کیونکہ کسی تمثیل کے بغیر ایسی باتوں کا سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے مریدوں کو ساتھ لیا اور ایک دوسرے درویش کی طرف چل دیے۔ یہ درویش شہر سے باہر ایک کٹیا میں رہتا تھا، اس نے حسام الدین کے پہنچنے سے پہلے ہی شور کر دیا "وہ آ رہا ہے، وہ یہیں میرے پاس آ رہا ہے، مجھ سے ملنے۔"

چنانچہ جب حسام الدین وہاں پہنچے تو دیکھا درویش اُن کے انتظار میں سرِ راہ کھڑا ہے۔ درویش نے ان کو دیکھا تو کہا "بھئی خوب حسام الدین! یہ کیا تماشا ہے کہ تم نے سمجھانے کے لیے میری کٹیا کو پسند کیا۔"

حسام الدین نے جواب دیا "حضرت! میں بھی کیا کروں، میری باتیں اگر کسی کی سمجھ میں آ بھی جاتی ہیں تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان میں کچھ تشنگی باقی رہ گئی۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو میں نے تمثیلی طریقے کو اپنا لیا۔"

درویش ان سب کو اپنی کٹیا میں لے گیا۔ یہاں درویش کے کئی چیلے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ درویش نے اپنے چیلوں سے کہا "دیکھو آج ہماری کٹیا میں یہ کون آ گیا؟"

چیلوں نے انہیں دیکھا تو احتراماً کھڑے ہو گئے۔ درویش نے حسام الدین سے کہا "میاں حسام الدین! تم نے دیکھا مجھے اور میرے چیلوں کو؟"

حسام الدین نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا "ہاں دیکھا، کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

درویش نے جواب دیا "ہاں، خاص بات یہ ہے کہ ہم درویش لوگ انسانوں سے نفور، بستیوں سے دُور کب کسی کا استقبال کرتے ہیں۔ ہم تو شہریوں کے آدابِ معاشرت کو اپنے لیے پسند ہی نہیں کرتے لیکن ایک تم ہو، تمہارے ساتھی ہیں، شہر سے آئے ہو اور ہم تمہارے آدابِ احترام میں چند قدم چلتے ہیں اور میرے چیلے احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا اس رویّے میں تمہیں کوئی خاص بات نظر آئی؟"

حسام الدین نے جواب دیا "بابا! ہم سب جس کے تابع فرمان ہیں اسی کے حکم پر تم اور تمہارے چیلے میرے استقبال کو آگے بڑھے یا کھڑے ہو گئے۔"

درویش نے کہا "تم بھی ٹھیک کہتے ہو، کہو کیسے آئے؟"

حسام الدین نے کہا "بابا! میں نے اپنے مریدوں سے کہا کہ اگر کوئی درویش مرتبہ و مقام میں کم بھی ہو تو ہمیں اس کو کم نہیں سمجھنا چاہیے بشرطیکہ اس کے پیروں کا سلسلہ اور مقام بہت زیادہ بلند ہو۔"

درویش نے کہا "ٹھیک کہا مگر اس میں ادق بات کون سی ہے؟ کیا بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی؟"

حسام الدین نے جواب دیا "اس میں ادق بات یہی ہے کہ مریدوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر بات سمجھ میں آجاتی تو یہی بات آسان ہو جاتی یا آسان سمجھی جاتی۔"

درویش نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اس مجلس میں ایک مینڈک پھدکتا ہوا داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی درویش کے چیلوں میں سے ایک وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ درویش نے اس کو روکنا چاہا مگر وہ نہیں رکا۔ درویش نے اپنے چیلوں سے کہا "دیکھو وہ کہاں گیا؟ اور یہ بھی دیکھو کہ یہ مینڈک تنہا ہے یا اس کے پیچھے اور بھی کچھ ہے۔"

درویش کے چیلوں نے حکم کی تعمیل کی اور چند چیلوں نے مینڈک جس طرف سے آیا تھا اُدھر دور تک دیکھ کر پتا لگانے کی کوشش کی کہ مینڈک کے پیچھے کوئی اور چیز تو نہیں ہے اور ایک چیلا راہِ فرار اختیار کرنے والے اپنے ساتھی کی تلاش میں ذرا آگے نکل گیا۔ اور کچھ دیر بعد اس کو پکڑ لایا۔ درویش نے حسام الدین کے مریدوں سے کہا "میں راہِ فرار اختیار کرنے والے چیلے سے ایک سوال کروں گا اور یہ اس سوال کا جواب دے گا۔ تم سب سوال اور اس کے جواب کو ذرا غور سے سننا، بس انہی میں حسام الدین کی ادق بات کا جواب موجود ہے۔"

حسام الدین کے مرید تیار ہو کر بیٹھ گئے۔

درویش نے چیلے سے سوال کیا "میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو مینڈک کو دیکھتے ہی فرار کیوں ہو گیا تھا؟"

چیلے نے جواب دیا "جناب والا! میں مینڈک سے نہیں، اس سانپ سے ڈرا تھا جو مینڈک کے پیچھے متوقع تھا۔"

اس کے بعد درویش نے مریدوں کو سمجھایا "دوستو! اگر کوئی درویش کمزور ہے اور کوئی اعلیٰ مقام روحانیت نہیں رکھتا تو اس سے مت ڈرو۔ ڈرو اُن بزرگوں سے جو اس کمزور درویش کی پشت پر موجود ہوں گے۔ کیونکہ یہ بزرگ اپنے ارادت مند کی تحقیر ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔"

اب حسام الدین کے مرید اپنے پیر مرشد کی باتوں کا اصل مفہوم اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

خلافت تو مل چکی تھی لیکن اب حسام الدین بہت زیادہ پریشان رہنے لگے تھے۔ عسرت اور تنگ دستی نے انہیں بہت زیادہ پریشان کر دیا لیکن اُن کے پائے استقامت اور جبینِ تحمل پر کوئی رنگ نہ آیا، نہ لرزش ہوئی نہ شکن پڑی۔

اسی عالم میں آپ نے شادی کر لی اور دونوں میاں بیوی صبر شکر سے زندگی گزارنے لگے۔ جب بھوک زیادہ ستاتی اور گھر میں کچھ کھانے کو نہ ہوتا تو آپ پانی پی کر پیٹ بھر لیتے۔ اسی عسرت اور تنگدستی میں ایک بیٹا پیدا ہوا، وہ بھی اسی طرح پرورش پانے لگا۔ آپ کے ذکر و فکر میں کوئی فرق نہ آیا، وہ اسی ذوق و شوق سے جاری رہا۔

جب بچہ کچھ سمجھ دار ہو گیا تو ایک دن بھوک کی حالت میں آپ کے پاس گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا، بولا "بابا جان بھوک۔"

آپ نے اس کی اشک آلود آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کے کہا "خدایا! میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا، اس پر رحم فرما۔" اس کے بعد اپنے بیٹے سے کہا "جا بیٹے! جا، میں نے تیری درخواست بھیج دی ہے اور اس دربار سے کبھی مایوسی نہیں ہوتی۔"

جو کچھ ہوگا بہتر ہی ہوگا۔"

صابر شاکر باپ کا صابر بیٹا جس طرح آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے پوچھا: "کون ہے؟"

باہر سے کسی نے پوچھا: "کیا پیر مرشد حسام الدین یہیں رہتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "ہاں حسام الدین یہیں رہتا ہے اور یہ جواب بھی عاجز و ناچیز حسام الدین ہی دے رہا ہے۔"

باہر سے کسی نے کہا: "تب پھر آپ یہ لے لیں۔"

حسام الدین باہر گئے، دیکھا، دروازے پر ایک صاحب کچھ سامان لیے کھڑے تھے۔ انھوں نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا: "کھانے کا سامان۔ یہ سامان آپ کو بھیجا گیا ہے۔"

آپ نے یہ سامان لے لیا، یہ کھانا تھا، پکا ہوا، لذیذ کھانا۔ آپ نے پوچھا: "یہ کھانا کس نے بھیجا ہے؟"

لانے والے نے جواب دیا: "میں نام نہیں بتا سکتا کیونکہ مجھے نام بتانے سے منع کیا گیا ہے۔"

وہ شخص کھانا دے کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد پھر کسی نے دستک دی۔ آپ نے پوچھا: "کون ہے؟"

باہر سے پھر وہی سوال کیا گیا: "کیا پیر مرشد حسام الدین یہیں رہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں میں عاجز و ناچیز حسام الدین ہی بول رہا ہوں۔"

آپ نے باہر نکل کے پوچھا: "کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کام؟"

آپ نے اس شخص کو دیکھا، اس کی پشت پر ایک بڑا سا گٹھر رکھا ہوا تھا۔ اس شخص نے اپنا گٹھر زمین پر رکھ دیا اور کہا: "یہ کاش ہیں، ایک من! انھیں آپ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے۔"

آپ نے اس سے بھیجنے والے کا نام پوچھا، تو اس شخص نے جواب دیا: "میں اس شخص کا نام نہیں بتلاؤں گا لیکن یہ آپ ہی کو بھیجے گئے ہیں۔"

آپ نے ماش اندر پہنچا دیے۔ آپ نے یہ چیزیں اپنی بیوی کے حوالے کر دیں اور ایک گوشے میں جا کے آنسو بہانے لگے۔

بیوی نے پوچھا: "یہ تو خوشی کی بات ہے کہ آج اللہ نے ہماری سن لی۔ اور۔۔۔۔"

آپ نے اپنی بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: "بیوی! یہ نہ کہو۔ آج میں اپنے رب کے سامنے بہت شرمندہ ہوں۔"

بیوی نے پوچھا: "اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "میں نے آج تک رزق کے بارے میں کوئی دعا نہیں مانگی تھی۔ آج اپنے بیٹے کو بھوکا دیکھ کر دستِ طلب دراز کر دیا۔ اللہ نے میری سن لی لیکن میں خود بے حد پشیمان ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے اپنی زبان بھی کھولی تو نفس کو خوش کرنے کے لیے۔"

اس جواب نے بیوی کو بھی افسردہ کر دیا، بولیں: "لیکن اللہ واقف ہے کہ آپ نے اس سے جو کچھ مانگا وہ اپنے لیے نہیں، اپنے بیوی بچوں کے لیے مانگا تھا۔"

آپ نے جواب دیا: "ہاں، بس اسی بات سے دل کو ذرا اطمینان ہوتا ہے ورنہ کھانے اور ماش کو دیکھ کر میں لرز گیا تھا۔"

اس کے بعد آپ نے اس سلسلے میں دستِ طلب دراز نہیں کیا اور اللہ نے بھی ان کا بھرم رکھ لیا اور پھر کبھی انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہیں ہوئی۔

اب ان کے پاس جو لوگ آتے وہ آپ سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے جاتے۔ آپ سے طرح طرح کے سوال کیے جاتے اور آپ انھیں ایسے تسلی بخش جواب دیتے کہ وہ مطمئن ہو کر واپس چلے جاتے۔

آپ سے پوچھا گیا: "درویش سالک کیونکر بن جاتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ذکر کرتے کرتے۔ اور اسی ذکر سے سالک عاشق بھی بن جاتا ہے۔"

اس شخص نے دوسرا سوال کیا: "اور سالک عارف کیوں کر بن جاتا ہے؟"

آپ نے فوراً جواب دیا: "فکر کرتے کرتے۔"

آپ اپنے ارادت مندوں کو صبر و تحمل کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ آپ نے فرمایا: "لوگو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ اللہ کے انعامات کیونکر

ظاہر ہوتے ہیں؟" پھر خود ہی جواب دیا۔ "اللہ کے انعامات اچانک ظاہر اور نازل ہوتے ہیں اور ولی اُن سے آگاہ بھی ہو جاتا ہے اس لیے دوستو! میرا آپ کو یہ مشورہ ہے کہ ہمیں اس کا ہمیشہ منتظر رہنا چاہیے کیونکہ اس انتظار کے دوران ہی پردۂ غیب سے وہ ظاہر ہوگا جس کی ہمیں توقع بھی نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں طلب کے بغیر ہی اتنا کچھ دے دیتا ہے کہ اس کی تعریف اور توضیح نہیں کی جا سکتی۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "حضرت! یہ فراق کیا ہے؟"

جواب دیا۔ "انسان کا اصل وطن عالمِ لطون ہے جب انسان عالمِ ظہور میں آتا ہے تو اسے اپنے وطن سے فراق ہو جاتا ہے۔ فراق کا ایک مفہوم تو یہ ہے اور فراق کے بارے میں دوسری بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ فراق یا تو وہ خود ہے یا اس کا نور ہے یا اس کے نور کا عکس ہے۔"

آپ کی باتوں میں بڑی گہرائی ہوتی تھی اور جن کی سمجھ میں یہ باتیں آجاتی تھیں وہ مست و بے خود ہو جاتے تھے۔

ایک بار آپ وعظ فرما رہے تھے، دورانِ وعظ فرمایا۔ "لوگو! درویش کے پاس چار چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے، سامعین بے چین ہو گئے۔ آخر ایک مرید نے دریافت کیا۔ "کون کون سی؟"

آپ نے سوال کا جواب تو دیا نہیں، مزید فرمایا۔ "اور ان چار میں سے دو تو درست اور صحیح ہوں اور دو شکستہ، ٹوٹی ہوئی۔"

کسی نے پھر سوال کیا۔ "کون کون سی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "دو درست چیزیں تو ہیں دین اور یقین اور دو شکستہ چیزیں ہیں پاؤں اور دل۔"

اِن عارفانہ کلمات نے کئی کو مست و بے خود کر دیا اور عالمِ وارفتگی میں شور اٹھا۔ "حق ہے، سبحان اللہ۔"

آپ نے دورانِ وعظ ایک چھوٹی سی حکایت سنائی، فرمایا۔ "لوگو! ایک حکایت سنو۔ اس حکایت میں ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔"

مرید خاموشی سے حکایت سننے لگے۔ آپ نے کہا۔ "ایک درویش دوسرے درویش کے گھر گیا۔ یہ درویش مست و بے خود ہو رہا تھا۔ میزبان درویش نے اس کو جو اس حال میں دیکھا تو اپنی بیوی کو پردہ بھی نہیں کرایا۔ درویش بھی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد مہمان درویش نے سر اوپر اٹھایا اور کہا۔ "یا اللہ!"

میزبان درویش نے اپنی بیوی کے چہرے پر آستین رکھ دی اور اس کو حکم دیا۔ "اے نیک بخت! اب تو اندر چلی جا۔"

عورت اندر چلی گئی اور وہاں اپنے شوہر کو بھی بلا لیا، پوچھا۔ "آپ تو اپنے اس مہمان کو بڑی محبت سے لائے تھے اور اس سے پردہ بھی نہیں کرایا تھا پھر یہ اچانک پردے کی کیا سوجھ گئی؟"

درویش نے جواب دیا۔ "بیوی! بات تو ذرا سی ہے مگر قابلِ غور اور اہم ہے۔"

بیوی نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "بیوی! جب یہ شخص میرے ساتھ آیا تھا، اس پر بے خودی طاری تھی لیکن جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اللہ کو آواز دی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ بے خودی سے نکل کر خودی میں داخل ہو گیا ہے اور خودی میں آنے کے بعد پردہ واجب ہو جاتا ہے۔"

آپ کا دستور تھا کہ ہر روز صبح نصف قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اگر کسی جگہ قرآن پاک کے معانی و مطالب سمجھ میں نہیں آتے تھے تو اس عہد کی تفسیر مدارک کی مدد سے اس کو سمجھ لیتے تھے۔ اس طرح قرآن پاک پڑھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

ایک دن جب آپ سرور اور کیفیت کے ساتھ قرآن پاک پڑھ رہے تھے، آپ نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے۔ "حسام الدین! قرآن پاک کو اسی طرح پڑھنا چاہیے۔ اللہ کو بھی اسی طرح پڑھنا پسند ہے۔"

کسی مرید نے آپ کو سالہا سال اسی طرح پڑھتے دیکھا تو پوچھا۔ "حضرت! آپ تو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شمار کیے جاتے ہیں پھر یہ ہر روز دن کا خاصا حصہ تلاوت کی نذر کیوں کر دیتے ہیں؟ کیا آپ کو بھی اس محنت کی ضرورت ہوتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میری کیا ہستی ہے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی قطب بھی بن جائے تو بھی قرآن پاک کی تلاوت بہت ضروری ہے۔ اگر وہ زیادہ نہ پڑھ سکے تو ایک پارہ ضرور پڑھے۔"

کسی کے بارے میں آپ کو بتایا گیا کہ وہ بے حد لالچی ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ "تب تو وہ ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔"

سوال کرنے والے نے حیرت سے پوچھا۔ "ہماری ہمدردی کا مستحق ہے؟ ملامت کا نہیں، آخر کیوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "لالچ ایک بیماری ہے اور ہم بیمار سے ہمدردی کرتے ہیں۔"

ایک مخیّر کو دیکھا کہ وہ حاجت مندوں پر بے حد خرچ کر رہا ہے۔ ایک ہمدرد نے اس کو سمجھایا کہ تو یہ کیا کر رہا ہے؟ کیا یہ سخاوت خدا پسند کرے گا؟ خرچ میں میانہ روی اختیار کر۔

آپ نے اس کو ٹوک دیا اور فرمایا "تو اسے سخاوت سے کیوں روک رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا "اس لیے کہ رسولِ مقبولؐ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ کھاؤ پیو مگر فضول خرچی مت کرو، یہ بے جا اسراف ہی فضول خرچی ہے۔"

آپ نے فرمایا "حاجت مندوں پر خرچ کر دینا بے جا اسراف میں نہیں آتا۔"

اپنے مریدوں ہی میں سے ایک مرید کو آپ نے دیکھا کہ وہ بہت زیادہ محنت مشقت میں لگا رہتا ہے مگر آسودہ حال نہیں ہوتا۔ وہ خود بھی اپنے آپ سے خوش نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے ہمیشہ یہی شکایت کرتا رہتا تھا کہ میں اتنی زیادہ محنت مشقت کرتا ہوں مگر مجھے اس کے مطابق نہیں ملتا اور پریشان ہی رہتا ہوں۔

آپ نے جواب دیا "یہ تو دوسروں سے کیا پوچھ رہا ہے، اس کا جواب کوئی اور کیا دے گا، میں دوں گا۔"

مرید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "جی۔ ارشاد۔"

آپ نے جواب دیا "اے شخص! دنیا سائے کے مانند ہے اور آخرت آفتاب کے مانند۔ تو سائے کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہ۔ وہ تیرے ہاتھ نہیں آئے گا لیکن اگر تو آفتاب کی طرف بڑھے گا تو سایہ تیرے ساتھ ساتھ چلے گا۔"

وہ شخص اس جواب سے اتنا خوش اور مطمئن ہوا کہ پھر کبھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

آپ کے مریدوں میں ایک شخص بہت سیدھا تھا، حد درجہ سیدھا اور نیک۔ اس سیدھے انسان کو لوگ بہت ستاتے تھے۔ جب آپ سے اس کی شکایت کی گئی اور کہا گیا کہ اس کے حق میں دعا فرمائیں تو آپ نے اس شخص سے کہا "اے شخص! تو اتنا سیدھا اور میٹھا کیوں ہے؟"

اس نے جواب دیا "حضرت! میں کیا کروں، میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔"

آپ نے فرمایا "اے شخص! سن میں کیا کہتا ہوں۔"

وہ گوش بر آواز ہو گیا، آپ نے فرمایا "اتنے شیریں اور میٹھے بھی نہ ہو کہ تجھے مکھیاں چٹ کر جائیں۔"

کسی شخص کے بارے میں آپ کو بتایا گیا کہ وہ اپنے سابقہ حریفوں میں اٹھ بیٹھ رہا ہے اور آپس میں گاڑھی چھن رہی ہے۔

آپ نے اس سے کہا "یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے پوچھا "مجھ کو کیا ہو گیا ہے؟"

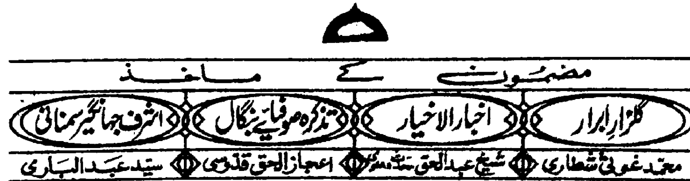
آپ نے فرمایا "میں نے یہ سنا ہے کہ تیری اپنے سابقہ حریفوں سے گاڑھی چھن رہی ہے، کیا یہ درست ہے؟"

اس نے جواب دیا "ہاں، یہ درست ہے مگر اس میں ہرج بھی کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا "اس میں ہرج یہ ہے کہ ہر وقت یہ امکان موجود رہتا ہے کہ وہ تجھے گمراہ کر دیں یا وہ تیرے راستے میں خلل انداز ہوں اور یہاں تک کہ تو اس کی وجہ سے دہلیز پر بھی نہ بیٹھ سکے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تو نے جو شریفانہ راستہ اختیار کر رکھا ہے وہ شیطان صفت پرانے حریف تجھے بھی اپنے راستے پر ڈال دیں۔"

آپ کی یہ باتیں اس عہد کے پورے برصغیر میں گونجنے لگیں۔ انھوں نے اپنے خاندان، اپنے آباؤ اجداد اور اپنے پیر و مرشد کا نام ایسا روشن کیا کہ دنیائے تصوف میں ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آخر ۱۴۴۹ء میں آپ کے فراق کا دور ختم ہوا اور آپ کو اپنے اصل وطن کا وصال حاصل ہوا۔ وصال کے بعد ہر طرف ایک کہرام برپا ہو گیا۔ آپ کے مریدوں نے آپ کے حالات اور واقعات کو دور دور تک تبرک کے طور پر پہنچا دیا۔



یہ ان دنوں کی بات ہے جب دور دور سے یگانۂ روزگار لوگ کھنچ کھنچ کر برصغیر میں داخل ہو رہے تھے۔ بخارا کے ایک جید عالم عطاءاللہ محمود نے بھی ایک طالع آزما کی طرح برصغیر کا رخ کیا اور دشوار گزار راہوں کو طے کرتے ہوئے پشاور کے راستے برصغیر میں داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا شیخ حمید الدین بھی تھا۔ یہ نوجوان بیٹا بھی اپنے علم اور فراست میں لاجواب تھا۔ بیٹے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا باپ محض فکرِ معاش میں اتنا طولانی سفر کیوں کر رہا ہے؟ راہ میں جہاں کوئی دشواری پیش آئی۔ بیٹے نے دبی زبان میں سوال کر دیا۔ ''باواجان! کیا بخارا میں خدا نہیں ہے جو ہمارا رزق پہنچاتا؟''

باپ جواب دیتا۔ ''بیٹے! وطن چھوڑ کر کہیں اور بس جانا سنتِ نبوی ﷺ ہے۔''

بیٹا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا، بولا۔ ''باواجان! اگر ترکِ وطن معیشت کی خاطر ہے تو یہ سنتِ نبوی ﷺ نہیں ہو سکتی۔''

شیخ ناگوری

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان کی فطرت میں اتنے پیچ و خم ہیں کہ سیدھے راستے پر چلنا اس کے لیے ایک بڑی آزمائش سے کم نہیں ہوتا مگر... جنہیں اللہ یہ توفیق دیتا ہے ان کے لیے ہر آزمائش اپنا دامن سمیٹ کر ایک طرف ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ جس بندے کو آزمانے چلی ہے اسے خدا کی طرف سے نمایاں حوصلہ اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہمت عطا کر دی گئی ہے لہٰذا اسے اپنے راستے سے ہٹانا اس کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ اور پسندیدہ لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ کی طرف سے روحانی دولت بڑی فراوانی سے عطا کی جاتی ہے۔

محبتیں تقسیم کرنے والے اللہ کے

ایک ولی کا قصہ



باپ اپنے بیٹے کی باتوں سے لاجواب ہوگیا۔

یہ دونوں دہلی میں داخل ہوئے۔ بیٹا حمید الدین غیر معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اس نوجوان کی علمیت اور لیاقت کا ایک زمانہ معترف تھا۔ باپ نے دہلی میں مختلف ملازمتیں کیں لیکن حمید الدین کو کام نہیں کرنے دیا۔ اتفاق کی بات کہ باپ کا جلد ہی انتقال ہوگیا اور حمید الدین کو معیشت کی فکر ستانے لگی۔ ان کی علمیت اور لیاقت کا شہرہ تو تھا ہی، انہیں بڑی آسانی سے قاضی کا منصب مل گیا۔ انہیں ناگور بھیج دیا گیا۔

مقدمات کی بھرمار رہنے لگی غرض مند انہیں رشوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے مگر یہ حد درجہ متقی اور پرہیز گار تھے۔ طبیعت میں بلا کی قناعت تھی۔ شاطر اور چالاک لوگ ان کی دین داری اور تقویٰ سے عاجز آگئے اور ان کی شکایتیں دہلی دربار کو بھیجنے لگے۔ ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں لیکن یہ تناور اور مضبوط درخت کی طرح اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ سب سے زیادہ وہ لوگ پریشان تھے جو مدعیان یا مدعا علیہان کی طرف سے قاضیوں کو رشوتیں پہنچا کر اپنا کام چلایا کرتے تھے اور ان کی معاش کا انحصار ہی دلالی پر تھا۔ یہ شاطر لوگ جب ہر طرف اور ہر طرح سے مایوس ہوگئے تو ان میں کا ایک دلال حمید الدین کی خدمت میں پہنچا اور صاف صاف باتیں کیں۔

اس نے کہا۔ ”محترم قاضی! کیا آپ کو مال و زر سے ذرا سی دلچسپی نہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھ کو مال و زر سے بس اتنی ہی دلچسپی ہے کہ اس سے میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔“

شاطر شخص نے مسکرا کر کہا۔ ”واہ جناب! یہ کیا بات ہوئی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی جو تیری سمجھ میں نہ آسکے۔“

شاطر نے کہا۔ ”جناب! کتنے مال و زر کی کب ضرورت پیش آئے گی اور ہمارے پاس کتنا مال و زر ہر وقت موجود رہنا چاہیے...... کس کو معلوم؟ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ ہر انسان کے پاس مال و زر کی وافر مقدار اتنی ضرور رہنا چاہیے کہ بہ وقتِ ضرورت انسان خود کو مجبور اور بے بس نہ سمجھنے لگے۔“

آپ نے بڑی بے نیازی سے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جناب حرص و ہوس جب اپنے پاؤں کہیں گاڑ لیتی ہے تو بہ آسانی ہتھیار نہیں ڈالتی۔ اس لیے میں اپنے لیے بطورِ خاص قناعت پسند کرتا ہوں۔“

شاطر نے طنزاً کہا۔ ”اگر آپ واقعی اتنے نااہل اور سخت دل واقع ہوئے ہیں تو پھر آپ کو یہ پیشہ نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔“

آپ نے ذرا سی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے پھر کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”او شیطان کے پرستار دفعان ہو جا میرے پاس سے، ورنہ میں اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر تیرا کام تمام کرادوں گا۔“

وہ شخص گھبرا کر چلا گیا۔ اس دن آپ سارا دن بہت اداس اور پریشان رہے۔ رات کو عشا کی نماز پڑھی اور سوچ میں پڑ گئے۔ آخر رقت زدہ آواز میں گڑگڑانے لگے۔ ”یا اللہ! یہ تیری آزمائش ہے یا شیطان کی؟ میں بہت حیران ہوں کہ انسان کو یہ کیا ہو گیا ہے یہ لوگ میری بربادی کے درپے کیوں ہیں؟ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ اگر انہوں نے مجھ کو بہت زیادہ تنگ کیا تو میں بدرجہ مجبوری قاضی کا منصب چھوڑ دوں گا کیونکہ میں وہ سب نہیں کر سکتا جواب تک دوسرے کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ خدایا! ترغیب و تحریص کے جھکڑ چل رہے ہیں، یہ مجھے بھی اڑا لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں...... اگر تیری مدد شاملِ حال نہ ہو تو کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔“

ان کا گداز دل موم کی طرح پگھلا ہوا تھا۔ کافی رات گئے بستر پر گئے تو ان کی نیند اڑ چکی تھی۔ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے مگر اس کا کوسوں کوئی پتا نہ تھا۔

ان کی آنکھ لگی تو دیکھا رسول مقبول ﷺ ان کے پاس تشریف لائے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ اے حمید، سچ سچ بتا تو اتنا پریشان کیوں ہے؟

حمید الدین کا پیمانۂ صبر چھلک گیا، کہا۔ ”یارسول اللہ ﷺ! میں عاجز و ناتواں انسان، مجھ کو جو منصب عطا ہوا ہے اس پر دیانت داری سے برقرار رہنا بہت دشوار ہے۔ میرا دل دنیا سے اچاٹ ہے۔ آپ میری راہنمائی فرمایئے، میں کیا کروں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”حمید الدین! دنیا میں رہ مگر مسافر کی طرح، تجھے پرسوز دل اور عالمانہ دماغ عطا ہوا ہے۔ ان دونوں سے کام لے۔ سیاحت کر اور ان لوگوں سے ملاقات کر جو دنیا میں رہ کر بھی دنیا میں نہیں ہیں اور جنہیں دولتِ علم سے نوازا گیا ہے۔“

حمید الدین علی الصباح اٹھے اور دنیا کو چھوڑ دیا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ بغداد پہنچے وہاں ان کی

ملاقات شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے ہوگئی۔ حمیدالدین کچھ عرصہ ان کی صحبت میں رہے اور اتنے متاثر ہوئے کہ ارادت نے مریدی کی شکل اختیار کرلی۔

شہاب الدین سہروردی کے پاس دوسرے کئی بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو حمیدالدین کوسب سے زیادہ گرویدہ کرتے رہے۔ شہاب الدین سہروردی کے بعد اگر کسی کی صحبت میں حمیدالدین کا بہت زیادہ جی لگتا تھا تو وہ یہی بزرگ تھے۔ ان کا نام خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھا۔

حمیدالدین ایک سال تک اپنے پیر مرشد کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس کے بعد ان سے اجازت حاصل کرکے مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ یہ جب روضہ رسول ﷺ کی زیارت سے شادکام ہوئے تو ان کی حالت ہی کچھ اور ہوگئی۔ آپ نے رسول اللہؐ کے روضے کی مجاوری اختیار کی۔

یہ کیفیت ایک سال دو ماہ اور آٹھ دن قائم رہی پھر رسول اللہؐ کی اجازت سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ خدا کی تین سال تک مجاوری کرتے رہے۔ یہاں بڑے بڑے اولیاء کرام سے ملاقاتیں ہوئیں اور باطنی فیوض حاصل کیے۔

ایک دن آپ نے ایک بزرگ کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا تو ایسا محسوس کیا گویا ان کی کشش حمیدالدین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے آپ سے اور کچھ تو ہو نہیں سکا، بس قدم اٹھانے میں ان کی اتباع کرنے لگے۔ ان بزرگ کے قدموں پر اپنے قدم رکھ رکھ کر طواف کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ان بزرگ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔ ''حمیدالدین! یہ تو کیا کر رہا ہے؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''اگر آپ یہ جان سکتے ہیں کہ میں کچھ کر رہا ہوں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔''

بزرگ نے فرمایا۔ ''ظاہری عمل سے تجھے کیا مل جائے گا۔ میرے قدموں پر قدم رکھ کر تو کوئی بھی چل سکتا ہے مگر یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے باطنی اعمال کی اتباع کرسکے۔''

حمیدالدین نے پوچھا۔ ''آپ کا کوئی ایک بھی باطنی عمل ایسا ہے جس کی تقلید محال ہو۔''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ میں طوافِ کعبہ کے دوران اپنے ہر بنِ مو سے کلام اللہ کی تلاوت کرتا رہتا ہوں۔''

حمیدالدین نے دل میں سوچا یہ محض دعویٰ ہے یا واقعہ بھی۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس پر یقین کس طرح کیا جائے؟

ان بزرگ نے فرمایا۔ ''کیا سوچ رہا ہے حمیدالدین؟ یہ محض میرا دعویٰ نہیں واقعہ ہے۔ آ، میرے قریب آجا اور خود بھی سن لے۔''

حمیدالدین ان بزرگ کے قریب آگئے تو ایسا محسوس ہوا گویا بہت سے قاری آہستہ آہستہ کلام پاک کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ حمیدالدین پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش آیا تو ان بزرگ کا کہیں پتا نہ تھا۔

کئی سال مکہ معظمہ میں رہنے کے بعد یہ برصغیر واپس آئے، دہلی کا رخ کیا۔ یہاں ایک بار پھر قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوگئی اور ان کے قرب میں رہنے لگے۔

سہروردیہ سلسلے میں سماع جائز نہیں ہے لیکن حمیدالدین کو سماع سے بڑی دلچسپی تھی اور خواجہ بختیار کاکیؒ کے ساتھ محفلِ سماع میں ضرور تشریف لے جاتے تھے۔

اس دور میں چند ایسے جید اور بااثر عالم بھی تھے جو سماع کے سخت خلاف تھے۔ ان علماء کے پرستاروں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔

سلطان شمس الدین التمش کا زمانہ تھا۔ اس کی سفید کوشک کے قریب علی شوریدہ نامی ایک درویش رہتا تھا۔ اس نے ازراہِ عقیدت و محبت حمیدالدین اور بختیار کاکیؒ کی دعوت کی اور محفلِ سماع کا بھی انتظام کیا۔ یہ دونوں صاحبان اس محفل میں تشریف لے گئے۔

سماع کے مخالف بلکہ دشمن علماء میں مولانا رکن الدین سمرقندی کا بڑا نام تھا۔ مولانا کو کسی نے خبر کردی کہ حمیدالدین اور خواجہ بختیار کاکیؒ بادشاہ کے سفید کوشک کے پڑوس میں درویش علی شوریدہ کے گھر میں سماع سننے میں مشغول ہیں۔ ان کا فرطِ جوش سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ فوراً حکم دیا کہ میرے ارادت منداور پرستار اسی وقت میرے پاس جمع ہوجائیں۔ اس حکم کے بعد چشم زدن میں ان کے گرد لوگوں کا اژدہام ہوگیا۔

ایک پُرجوش نوجوان نے پوچھا۔ ''حضرت! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ حمیدالدین محفلِ سماع میں موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں اس محفل کو قوت استعمال کرکے اجاڑ دوں کیونکہ میرا یہ فعل اللہ کے نزدیک مقبول اور مسموع ہوگا۔''

ارادت مندوں نے مولانا کا یہ ارشاد سنا تو بے اختیار ڈنڈے سنبھالے اور جوش میں بھرے ہوئے درویش علی شوریدہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت محفل رنگ پر آئی ہوئی تھی۔

مولانا نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک شخص ان کے پاس گیا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

مولانا نے پوچھا۔ ''کیا اندر حمیدالدین موجود ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، اندر موجود تو ہیں۔''

مولانا نے کہا۔ ''اچھا تو اندر جا اور علی شوریدہ کو میرے پاس بھیج دے۔''

اس شخص نے اندر جا کے علی شوریدہ کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ وہ بہت گھبرایا اور خواجہ بختیار کاکیؒ کو صورتِ حال بتا کے پوچھا۔ ''حضرت! اگر مولانا اپنے ارادت مندوں کو لے کر اندر آ گئے تو ساری محفل اجڑ جائے گی اور لوگ زخمی ہو جائیں گے۔ اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ یہ مصیبت ٹل جائے؟''

خواجہ بختیار کاکیؒ نے حمیدالدین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تم بتاؤ علی شوریدہ کیا کرے؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''بس ایک کام کرے اور کچھ نہیں۔ مولانا کی مجال نہیں جو کسی قسم کا شور و شر کر سکیں۔''

علی شوریدہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ''مثلاً کیا؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''تم اپنے گھر میں کہیں روپوش ہو جاؤ اور اپنے آدمیوں کو سختی سے منع کر دو کہ وہ مولانا کو تمہاری بابت کچھ بھی نہ بتائیں۔''

علی شوریدہ کو اس تجویز نے اور پریشان کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ بڑی پھسپھسی تدبیر تھی اور مولانا پر اس کا کوئی شدید ردِعمل کس طرح ہو سکتا تھا۔

حمیدالدین نے مزید کہا۔ ''علی شوریدہ، تو اس گھر کا مالک ہے۔ تو کیوں خوف زدہ ہو رہا ہے؟''

علی شوریدہ نے جواب دیا۔ ''اگر میں مولانا سمرقندی سے ملاقات بھی نہ کروں تو کیا اس طرح یہ فتنہ دب جائے گا؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''ایسا یوں ممکن ہے کہ مولانا عالم ہیں، معاشرتی آداب سے واقف ہیں۔ ان کی یہ مجال نہیں کہ صاحبِ خانہ کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو میں ان سے مواخذہ کروں گا۔''

خواجہ بختیار کاکیؒ اس تجویز سے بہت خوش ہوئے فرمایا۔ ''حمیدالدین صحیح کہتا ہے۔''

اسی وقت ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور عرض کیا۔ ''علی! تجھ کو مولانا سمرقندی بلا رہے ہیں۔''

علی شوریدہ نے اس شخص کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ ''جا مولانا سے کہہ دے کہ میں علی شوریدہ کو تلاش کر رہا ہوں جیسے ہی ملیں گے ملوا دوں گا۔''

اس شخص نے یہی جواب مولانا کو پہنچا دیا۔ مولانا نے جز بز ہو کر فرمایا۔ ''جا اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کر، علی شوریدہ کو تلاش کر کے میرے پاس لے آ۔''

یہ شخص دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس وقت تک علی شوریدہ نے واقعی خود کو روپوش کر لیا تھا۔ وہ شخص بڑی دیر تک علی کو تلاش کرتا رہا اور ناکام ہونے کے بعد مولانا کو مطلع کر دیا۔ ''مولانا! گھر میں تو علی شوریدہ کا کہیں پتا نہیں، اگر وہ کہیں باہر ہوں گے تو آپ تو دروازے پر موجود ہی ہیں۔ یہیں ملاقات ہو جائے گی۔''

مولانا نے اس شخص کو بہت غور سے دیکھا۔ انہیں اس جواب پر یقین نہیں آ رہا تھا، بولے۔ ''کہیں تو جھوٹ تو نہیں بول رہا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''مولانا! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کے عرض کر رہا ہوں کہ میں نے علی شوریدہ کو بہت تلاش کیا اور ناکام ہو کر آپ کے پاس واپس آ گیا۔''

مولانا کے پرستار یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر درخواست کی۔ ''حضرت! آپ ہمیں حکم تو دیں، ہم دروازے توڑ کر اندر گھس جائیں گے اور پوری محفلِ خرافات کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے۔''

مولانا نے فرمایا۔ ''تم لوگ نادان ہو، بات کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر ہم اس گھر میں جبراً داخل ہوئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

ایک عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔ ''حضرت! وہ کس طرح؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''اندر دو جید ترین ہستیاں موجود ہیں۔ حمید الدین اور قطب الدین۔ اگر میں اس گھر میں صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوا تو اس کا مجھ سے بڑا سخت مواخذہ ہوگا اور میں قاضی اور بادشاہ کے روبرو کوئی صفائی بھی پیش نہیں کر سکوں گا۔''

ایک پرستار نے پوچھا۔ ''تو حضرت اب کیا ہوگا؟''

مولانا سمرقندی نے جواب دیا۔ ''ہمیں صاحب خانہ کے باہر آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

اندر سے قوالوں کی آوازیں آرہی تھیں اور مولانا سمرقندی اپنے ساتھیوں سمیت بے دست و پا کھڑے صاحبِ خانہ کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد پھر کسی نے کہا۔ ''علی شوریدہ کہاں ہے، اس کو بلواؤ۔''

اس بار پھر وہی جواب ملا۔ ''وہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔''

مولانا سمرقندی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''میں علی شوریدہ کی غیر حاضری اور عدم موجودگی کا مفہوم سمجھ چکا ہوں۔ حمید الدین اور قطب الدین نے بڑی خوب صورتی سے مجھے ناکام کر دیا ہے، اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔''

یہ لوگ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ کئی دن بعد مولانا سمرقندی نے حمید الدین سے ملاقات کی اور سماع کی شب والا واقعہ بیان کر کے کہا۔ ''شیخ! آپ نے غضب کی ترکیب اختیار کی تھی۔''

حمید الدین نے جواب دیا۔ ''مولانا! مزاج میں کچھ نرمی بھی پیدا کیجیے۔ محض پیچ و تاب سے کام نہیں چلتا۔ انسان میں سوز وساز بھی ہونا چاہیے۔''

حمید الدین میں تحمل اتنا تھا کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ان کے ہم عصروں میں علماء کا ایک طبقہ بھی تھا جو بحری کہلاتا تھا۔ یہ علماء بھی اپنے عقائد اور مسلک میں نہایت سخت بلکہ پتھر تھے۔ ان میں مولانا شرف الدین بحری کا نام سب سے نمایاں تھا۔

مولانا شرف الدین بحری کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ حمید الدین نے سنا تو بے چین ہو گئے۔ آپ کے مریدوں کو آپ کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے مولانا بحری کے پاس جانے سے منع کیا۔ ایک مرید نے عرض کیا۔ ''آپ اگر مولانا اشرف الدین کی عیادت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو جائیں لیکن اگر اس سلسلے میں ہم مریدوں کی رائے لیں گے تو ہر کسی کو اس سے اختلاف ہوگا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مریض کی عیادت کو جانا سنتِ نبوی ﷺ ہے اور میں اس سنت کو ترک نہیں کر سکتا۔''

کسی دوسرے مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! خطرہ اس بات کا ہے کہ مولانا شرف الدین آپ کو اپنے پاس نہیں آنے دیں گے۔ دروازے پر سے ہی واپس کر دیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''وہ ان کا اپنا فعل ہوگا لیکن میں اپنے نیک فعل سے کیوں باز رہوں۔''

اس مرید نے کہا۔ ''حضرت! جہاں تک مجھے معلوم ہے مولانا شرف الدین بحری آپ سے نفرت وعناد کے معاملے میں مولانا سمرقندی سے بھی آگے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہ کچھ بھی سہی لیکن میں مولانا کی عیادت کو ضرور جاؤں گا۔''

مرید خاموش ہو گئے۔ آپ مولانا کی عیادت کو چلے گئے۔ مولانا بحری کے در پر ان کے پرستاروں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے شیخ حمید الدین کو پہچان لیا اور انہیں دروازے پر ہی روک لیا، بولے۔ ''شیخ! ہمیں پہلے مولانا سے آپ کے سلسلے میں اجازت حاصل کرنا ہوگی، آپ یہیں باہر ہی ٹھہریں۔''

آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اندر کسی عقیدت مند نے مولانا کو مطلع کیا۔ ''حضرت! شیخ حمید الدین آپ کی عیادت کو حاضر ہوئے ہیں۔ اندر آنا چاہتے ہیں، آپ کا کیا حکم ہے؟''

مولانا سوچ میں پڑ گئے، کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''نہیں، انہیں اندر نہ آنے دیا جائے۔''

جب شیخ کو مولانا کے فیصلے سے مطلع کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ ''براہِ کرم مولانا سے یہ معلوم کیا جائے کہ وہ مجھے کیوں روک رہے ہیں؟''

اس سوال کے جواب میں مولانا نے جواباً کہلوا دیا۔ شیخ حمید الدین چونکہ سماع سنتے ہیں جو کسی طور پر جائز نہیں، اس کے علاوہ یہ صوفی لوگ خدا کو محبوب کہتے ہیں جو انتہائی گستاخی ہے۔ اس لیے میں اللہ کے اس گستاخ بندے کی شکل دیکھنا بھی کفر سمجھتا ہوں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''مولانا کی مرضی۔ میں نے سنتِ نبوی ﷺ ادا کر دی لیکن افسوس کہ میں مولانا کی مرضی کے خلاف ان کے گھر میں کس طرح داخل ہو سکتا ہوں۔''

بعد میں علماء نے شیخ کے خلاف ایک محاذ بنا لیا اور ان لوگوں نے شیخ حمید الدین اور سماع کے خلاف ایک فتویٰ تیار کیا اور اس پر

ان سب کے دستخط لیے گئے۔ اس عہد میں ایک مشہور فقیہہ مولانا داؤد تبریزی تھے۔ مولانا، شیخ کی لیاقت اور علمی مقام سے آگاہ تھے لیکن علماء کے دباؤ میں آ کر انہوں نے بھی اس فتوے پر لکھ دیا۔ ''مرقوم داشتہ درست است۔''

شیخ پر اس فتوے کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ جس حال اور جس روش پر تھے قائم رہے۔

مولانا داؤد تبریزی کسی فقہی مسئلے پر شیخ کی رائے لینے کے لیے حاضر ہوئے تو شیخ نے ان سے شکایت کی اور کہا۔ ''مولانا! آپ تو واقف ہیں کہ میں فقہی اور مذہبی امور میں کیا مقام رکھتا ہوں۔''

مولانا نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''حضرت! ایک میں ہی کیا ایک زمانہ آپ کے علمی تجربے کا قائل ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''پھر آپ نے اس فتوے پر دستخط کیوں کیے؟''

مولانا نے ندامت سے جواب دیا۔ ''شرما حضوری اور جبر سے۔ مجھے علماء نے مجبور کر دیا تھا۔''

شیخ نے غصے میں کہا۔ ''تمام علماء کا یہی حال ہے کہ شرما حضوری، جبر اور حسد سے غلط سلط فتوے دے کر اپنی عاقبت خراب کرتے رہتے ہیں۔ وہ تمام علماء علمی سطح پر اتنے ہیں کہ ابھی گویا اپنی ماؤں کے پیٹ سے باہر نہیں آئے اور آپ مولانا داؤد! ان میں آپ کی حیثیت بس اتنی ہے کہ پیدا تو ہو گئے ہیں مگر ابھی اتنی طاقت نہیں آئی کہ ماں کا دودھ بھی پی سکیں۔ مولانا! اخلاقی جرأت پیدا کیجیے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دینے کا مذموم سلسلہ بند کر دیجیے۔''

مولانا سر جھکائے سنتے رہے آخر میں کہا۔ ''شیخ! میرا وعدہ کہ آئندہ میں خود کو ان علماء سے الگ ہی رکھوں گا۔ بس اس بار آپ مجھ کو معاف کر دیجیے۔''

شیخ نے انہیں معاف کر دیا لیکن مولانا تبریزی ان سے زندگی بھر آنکھ نہ ملا سکے۔

☆☆☆

بظاہر تو شیخ کے پرستاروں کی خاصی بڑی تعداد تھی اور ان میں کے اکثر خود کو شیخ کا مرید بھی ظاہر کرتے تھے مگر خود شیخ کا یہ حال تھا کہ کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔ پوری زندگی میں صرف تین کو مرید بنایا۔ ان میں کے ایک شیخ احمد نہروالی بدایونی، دوسرا عین الدین قصاب اور تیسرا شیخ شاہی رسن تاب بدایوانی تھے۔ آپ نے ان تینوں کو جن بلند مراتب تک پہنچا دیا اور اپنے کمالات ان میں جس حد تک منتقل کر دیے، اس عہد کا ہر پاک باطن اس سے واقف تھا۔ آپ خود تو کرامات اور خرقِ عادت کا مظاہرہ نہ فرماتے مگر آپ اپنے تینوں مریدوں کے ذریعے، بہت کچھ دکھا دیتے۔

شیخ احمد نہروالی کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔ ایک شب ان کے گھر میں ایک چور داخل ہوا۔ پورے گھر کی تلاشی لینے کے بعد جب وہ مایوس ہو گیا تو واپسی کی نیت سے دروازے کی طرف چلا۔ شیخ احمد نے اس کا راستہ روک لیا اور آہستہ سے کہا۔ ''خالی ہاتھ مت جاؤ۔''

چور گھبرایا کہ پکڑا گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ چور نے خوشامد کی۔ ''حضرت! اس بار آپ مجھے معاف فرما دیں، آئندہ میں کہیں بھی چوری نہیں کروں گا۔''

شیخ احمد نے فرمایا۔ ''میں نے تجھے پکڑا ہی کب ہے۔ میں نے تجھے اس لیے روک لیا ہے کہ تو یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہ جائے اس گھر میں تجھے کچھ بھی نہیں ملا، بس وہ کپڑا جو میں بُن چکا ہوں بمشکل دس بارہ گز ہوگا اس کو لیتا جا۔''

چور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب دس بارہ گز کپڑا اس کے حوالے کر دیا گیا تو وہ حیران رہ گیا۔ شرم و ندامت سے وہاں رکنا محال ہو گیا، کپڑا لے کر فرار ہو گیا۔

دوسرے دن شیخ احمد کے در پر ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی اور بچے بھی جوان بھی بوڑھے بھی۔ انہی میں رات والا چور بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں رات کا کپڑا بھی تھا۔

آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

چور نے جواب دیا۔ ''حضرت! رات کو تو میں شرم و ندامت سے بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن اس وقت میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ حاضر ہو گیا ہوں، میں تائب ہونے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے پورے خاندان کو اپنا مرید بنا لیں۔''

آپ نے قدرے تامل سے فرمایا۔ ''سوچ لے، یہ بڑی دشوار راہ ہے۔''

چور نے جواب دیا۔ ''میں چوری کرتا رہا ہوں، یہ راہ بھی دشوار تھی۔''

آپ نے متبسم ہو کر ان سب کو اپنا مرید کر لیا اور چور نے زہد و ریاضت میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ ایک مثالی انسان قرار پایا۔

جب حمید الدین کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔ ''شیخ احمد میں میرا فیضان جاری ہے، ایک زمانہ اس سے فیض پائے گا۔''

شیخ احمد کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب یہ جامع مسجد تشریف لے جاتے تو ان کے ساتھ مریدوں کا ایک ہجوم ہوتا۔ درویش علی شوریدہ جب یہ منظر دیکھتے تو شرما کر پوچھتے۔ ''شیخ احمد! آپ کے پیر مرشد نے تو اتنے مرید نہیں بنائے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا اور مریدوں کو ساتھ لے کر چلنے میں کیا مصلحت ہے؟''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''مجھ کو پیر مرشد نے بہت زیادہ مرید کرنے سے منع بھی نہیں کیا ہے اور رہا اس سوال کا جواب کہ میں اتنے سارے مریدوں کو ساتھ لے کر کیوں چلتا ہوں، کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں۔''

ان باتوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شیخ احمد نے ایک جگہ کسی شخص کو ترک سپاہی کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اس ترک کو منع کیا کہ اس شخص کو نہ مارے۔ لیکن ترک نہیں مانا۔ آپ نے فرمایا۔ ''خدا نے حکم دیا ہے کہ برائی کو جبراً روک دیا جائے۔ اب میں اس پر مجبور ہوں کہ تجھ کو ظلم سے جبراً باز رکھوں۔''

ترک سپاہی نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ مظلوم کو اپنے گھیرے میں لے لو اور اس ترک کا ہر وار خود جھیلو۔ خبردار جو اس غریب کو ہلکی سی ضرب بھی آئے۔

مریدوں نے اس پر حرف بہ حرف عمل کیا اور ترک سپاہی کو مجبور اور بے بس کر دیا۔

اتفاق کی بات کہ اسی وقت ادھر سے علی شوریدہ کا گزر ہوا علی شوریدہ ایک بااثر شخص تھا۔ اس نے یہ منظر جو دیکھا تو شیخ احمد سے پوچھا۔ ''شیخ احمد یہ معاملہ کیا ہے؟''

شیخ احمد نے پورا واقعہ سنایا تو علی شوریدہ نے ترک سپاہی کو ڈانٹ پھٹکار کے بھگا دیا اور بعد میں شیخ احمد سے کہا۔ ''حضرت! آپ نے اپنے مریدوں سے کام خوب لیا۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''اس لیے میں اپنے مریدوں کو اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں۔''

علی شوریدہ اپنے سابقہ سوال کا جواب پا کر بہت لطف اندوز ہوا اور فرطِ مسرت سے مسکرانے لگا۔

☆☆☆

شیخ حمید الدین کے دوسرے مرید شیخ عین الدین قصاب تھے۔ انہیں بھی شیخ حمید الدین نے یہ دعا دی تھی کہ دوسروں کے کام آؤ اور ان کی حاجتیں پوری کرو۔

شیخ عین الدین قصاب کو اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ شیخ نظام الدین اولیا بھی ان کی صحبت میں رہنے کو اپنے حق میں مفید سمجھتے تھے۔

اسی عہد کے ایک مشہور شخص قاضی فخر الدین قاقلہ نے شیخ حمید الدین کے پاس جانا شروع کر دیا۔ شیخ نے ان سے کہا۔

''فخر الدین! تم جو کچھ چاہتے ہو اسے شیخ عین الدین کی صحبت میں رہ کر حاصل کرلو۔''

فخر الدین نے عرض کیا۔ ''حضرت! وہ تو آپ کے مرید ہیں، ان سے مجھے کیا ملے گا؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''تقسیم کا کام میں نے اپنے تینوں مریدوں کو دے رکھا ہے، میں براہ راست کچھ بھی نہیں دیتا۔''

فخر الدین یہاں سے اٹھ کر شیخ عین الدین قصاب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ عین الدین انہیں دیکھ کر مسکرائے اور کہا۔ ''اچھا تو تم اپنے آپ سے یہاں نہیں آئے۔''

فخر الدین نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کوئی روشن ضمیر تو ہوں نہیں، کسی راہنمائی کے بغیر میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔''

شیخ عین الدین نے کہا۔ ''اچھا تو تم پابندی سے میرے پاس آیا کرو۔''

فخر الدین کے جی میں آئی کہ کہہ دیں۔ حضرت! میں تو آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں لیکن شرم دامن گیر رہی اور یہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ بس آتے اور ان کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر سکون و طمانیت حاصل کرتے۔ سوچتے کہ دیکھیے کب گوہرِ مراد حاصل ہوتا ہے۔

ایک دن اچانک شیخ عین الدین نے فخر الدین کو آواز دی۔ ''فخر الدین کہاں چلے گئے؟''

فخر الدین ذرا فاصلے پر موجود تھے۔ بھاگتے ہوئے آئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ مؤدبانہ عرض کیا۔ ''غلام حاضر ہے۔''

شیخ عین الدین نے پوچھا۔ ''میں پوچھتا ہوں کیا تم میرے پاس بے غرضی سے رہ رہے ہو؟''

فخر الدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں کیا عرض کروں پہلے تو میں آپ کے پیر مرشد کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے آپ کے پاس بھیج دیا۔ اب مزید آگے کیا عرض کروں۔''
شیخ عین الدین نے کہا۔ ''بات مختصر کرو تم چاہتے کیا ہو؟''
فخر الدین نے جواب دیا۔ ''میں کسی شہر کا قاضی بننا چاہتا ہوں۔''
شیخ نے کہا۔ ''پیر مرشد نے بڑی ذمے داریاں دے رکھی ہیں، جاؤ تمہیں قاضی مقرر کر دیا گیا ہے۔''
فخر الدین نے غیر یقینی سے پوچھا۔ ''کہاں جاؤں؟''
شیخ نے جواب دیا۔ ''میں کہہ رہا ہوں جاؤ۔ تمہارے گھر پر پروانہ تقرری پہنچ چکا ہے۔''
فخر الدین افتاں وخیزاں گھر پہنچے تو واقعی ان کے نام قاضیِ شہر بنائے جانے کا پروانۂ تقرری آچکا تھا۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ فخر الدین کے دوستوں نے انہیں مبارک بادیاں دیں۔ ایک دوست نے پوچھا۔
''فخر الدین! تم قاضیِ شہر بنا دیے گئے، یہ بڑا مشکل کام تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم نے کس بااثر شخص کی سفارش حاصل کی تھی؟''
فخر الدین نے جواب دیا۔ ''کسی کی بھی نہیں۔''
دوست نے کہا۔ ''میں مان نہیں سکتا۔ اتنا بڑا کام کسی سفارش اور وہ بھی بہت بڑی سفارش کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جس دنیا میں تم رہتے ہو، اس میں، میں بھی رہتا ہوں۔ وہ ذریعہ اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو تمہاری مرضی۔''
فخر الدین نے کہا۔ ''دوست! اس میں ایک مردِ حق آگاہ کی سفارش کارفرما رہی ہے۔''
اس کے بعد پوری روداد سنادی۔ دوست کسی سوچ میں پڑ گیا فخر الدین نے پوچھا۔ ''کیا سوچنے لگے دوست؟''
دوست نے جواب دیا۔ ''کیا یہ سب کچھ درست ہے...... میں کس طرح یقین کروں؟''
فخر الدین نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ بتایا ہے نہ تو اس میں مبالغہ ہے نہ شمّہ برابر جھوٹ۔ اگر تم یقین نہیں کرتے تو نہ کرو، اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''
دوست نے پوچھا۔ ''اگر میں شیخ عین الدین کے پاس جانا چاہوں تو کیا مجھے بھی پہلے ان کے پیر مرشد کے پاس جانا پڑے گا؟''
فخر الدین نے جواب دیا۔ ''مناسب تو یہی ہے ویسے تمہاری مرضی۔''
دوست فخر الدین کے پاس سے اٹھ کر شیخ حمید الدین کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یہ شخص بھی چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد شیخ نے اپنے پرستاروں سے کہا۔ ''اللہ والوں کی حالت بھی معالجین جیسی ہوتی ہے۔ جب کسی مریض کو اپنے معالج سے حیرت انگیز فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ فرطِ جوش میں ہر جگہ اپنے معالج کی تعریفیں کرتا پھرتا ہے۔'' اس کے بعد اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ غرض مند بھی کسی کا بھیجا ہوا یہاں آیا ہے۔''
اس شخص نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ ''حضرت! اگر آپ اجازت دیں گے تو میں شیخ عین الدین قبلہ کی خدمت میں چلا جاؤں گا۔ اگر منع فرمائیں گے تو چپ ہو رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''تو جا سکتا ہے۔ عین الدین تیرا کام بھی کر دے گا۔''
یہ شخص ادب سے بدستور بیٹھا رہا، آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''اب یہاں کیوں بیٹھا ہے جاتا کیوں نہیں؟ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہا ہے؟''
یہ شخص اٹھا اور سیدھا عین الدین کے پاس پہنچ گیا۔ عین الدین نے دیکھتے ہی کہا۔ ''اچھا تو تو بھی سفارش لے کر آ گیا۔''
اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھے یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہے تو میں آیا ہوں ورنہ ہرگز نہ آتا۔''
عین الدین نے کہا۔ ''تب پھر چپ چاپ کان دبائے پڑا رہ مجھ سے کیا۔''
یہ شخص فخر الدین سے زیادہ چیکو ثابت ہوا۔ شب و روز ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ ایک دن عین الدین نے پوچھا۔ ''کیا تیرا گھر بار نہیں ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''سرِدست تو میرا کوئی گھر بار نہیں۔ میں نے تو حضرت کے اس آستانے ہی کو اپنا گھر سمجھ لیا ہے۔''
عین الدین نے تیوری چڑھا کے کہا۔ ''خوب! یہ کیسی زبردستی ہے کہ میرے آستانے ہی کو اپنا گھر کہنے لگا۔ یہ تو بتا تو میرا پیچھا

کس طرح چھوڑے گا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔''حضرت! اب میں خود کیا عرض کروں۔ میں کیا چاہتا ہوں، یہ بھی آپ کو بتانا پڑے گا؟''

عین الدین نے منہ بنا کر کہا۔'' کیسے کیسے خطرناک لوگ آجاتے ہیں۔ اپنا مطلب تک بیان نہیں کرنا چاہتے۔''

اس شخص نے بچوں کی طرح مچل کر عرض کیا۔''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ مجھ کو تو اس پر ناز ہے کہ میں خود سے نہیں آیا آپ کے پیر مرشد سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ اگر میں یہاں سے بے نیل ومرام واپس ہوا تو سیدھا آپ کے پیر مرشد کے پاس پہنچ جاؤں گا اور کہہ دوں گا کہ جس کے پاس آپ نے بھیجا تھا اس نے خالی ہاتھ واپس کر دیا۔''

عین الدین نے کہا۔''اچھا اب تو اپنے گھر جا، وہاں امیر داد کے منصب کا پروانہ تقرری تیرا انتظار کر رہا ہے۔ شاید تو چاہتا بھی یہی تھا۔''

اس شخص کی فرطِ جذبات سے حالت غیر ہوگئی۔ بے اختیار اٹھ کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں منصبِ امیر داد کا پروانہ تقرری واقعی اس کا منتظر تھا۔

ان دونوں واقعات نے بڑی شہرت حاصل کی اور غرض مند لوگ ان دونوں کے پاس پہنچنے لگے۔ یہ لوگ شیخ عین الدین کے پاس جانے اور ان سے اپنی مطلب برآری کا طریقہ کار معلوم کرنے لگے۔ ان دونوں نے ایک ہی طریقہ کار اختیار کیا تھا، انہیں ڈر محسوس ہوا کہ اگر ان کے بھیجے ہوئے لوگوں میں ایسے لوگ بھی شیخ عین الدین کی خدمت میں پہنچنے لگے جن کی خواہشات ادنیٰ اور سفلہ ہوئیں تو کتنی شرم ناک بات ہوگی۔ ان دونوں نے ہر ایک کو ٹالنا شروع کر دیا۔

انہی غرض مندوں میں مولانا وجیہہ الدین نامی ایک شخص بھی شامل تھے۔ یہ بھی قاضی فخر الدین کے پاس پہنچے اور اپنا مدعا بیان کیا۔

قاضی فخر الدین نے ہچکچاتے ہوئے عرض کیا۔''مولانا! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں شیخ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔''

مولانا وجیہہ الدین نے کہا۔'' قاضی صاحب! میں جو مقصد لے کر ان کے پاس جاؤں گا، اس سے آپ کے شیخ بھی خوش ہو جائیں گے۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

قاضی فخر الدین نے ساری تفصیل بتا دی اور کہا۔'' جب تک پیر مرشد شیخ حمید الدین وہاں جانے کی اجازت نہ دے دیں، آپ نہ جایئے گا۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔''

مولانا نے جواب دیا۔'' آپ مطمئن رہیں، نہ تو میں خود شرمندہ ہونا چاہتا ہوں اور نہ ہی آپ کو شرمندگی سے دوچار کرنا چاہتا ہوں۔''

قاضی صاحب نے فرمایا۔'' تب پھر آپ خدا کا نام لے کر چلے جایئے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔''

مولانا یہاں سے اٹھ کر شیخ حمید الدین کے پاس پہنچے۔ شیخ نے مولانا کو دیکھتے ہی متبسم ہو کر فرمایا۔'' آیئے مولانا! مجھے آپ کا ہی انتظار تھا۔ واللہ آپ دونوں سے افضل ہیں۔''

مولانا نے انکساری سے عرض کیا۔'' حضرت! میں کیا ہوں شاید کچھ بھی نہیں۔ ہاں اگر آپ کی نظرِ کرم ہوگئی تو شاید کچھ ہو جاؤں۔''

شیخ نے فرمایا۔'' آپ اسی وقت عین الدین کے پاس تشریف لے جائیں، وہ آپ پر پوری توجہ دے گا۔ اس سے فرمایئے گا کہ میں نے آپ کو اصرار کر کے بھیجا ہے۔''

مولانا کچھ دیر شیخ کی صحبت میں موجود رہے، اس کے بعد شیخ عین الدین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ عین الدین بھی انہیں دیکھ کر مسکرائے، بولے۔''مولانا! آپ نے یہاں آنے میں دیر کیوں کر دی؟''

مولانا نے جواب دیا۔''شیخ! میں نے کیا دیر کی جب حکم ربی ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔''

شیخ عین الدین نے فرمایا۔'' اچھا، آپ آئے تو ہیں اپنی مرضی سے لیکن واپس جائیں گے میری مرضی سے۔ آپ کچھ عرصے میرے پاس ضرور رہیں گے۔''

مولانا نے جواب دیا۔'' حضرت! آپ کچھ عرصے کی بات کر رہے ہیں، میں پوری زندگی آپ کی صحبت میں بسر کر دینا چاہتا ہوں۔''

عین الدین نے فرمایا۔''مولانا! آپ جو منصب چاہتے ہیں وہ بھی عظیم ہے، آپ فکر نہ کریں۔''

مولانا وجیہہ الدین شیخ عین الدین کی خدمت میں رہنے لگے۔ پہلی ملاقات کے بعد تو مولانا کو یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید شیخ نے انہیں بالکل ہی بھلا دیا ہے، وہ دوسروں سے ہمکلام بھی ہوتے مگر مولانا سے کوئی بات نہ کرتے۔ مولانا کو اس صورتِ حال سے

وحشت ہونے لگی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ کبھی سوچتے شیخ سے عرضِ حال کیوں نہ کر دیا جائے۔ کبھی یہ سوچتے کہ کیوں نہ ایک بار پھر ان کے پیر مرشد کی صحبت میں جا کے ان سے کچھ کہلوا دیا جائے۔ مولانا انہی وسوسوں میں گرفتار تھے کہ ایک دن شیخ عین الدین نے انہیں آواز دی۔ ''مولانا! ذرا تشریف تو لائیں میرے پاس۔''

مولانا کا دل دھڑکنے لگا۔ عجلت میں ان کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ''حضرت! خیریت تو ہے؟''

شیخ نے ناگواری سے کہا۔ ''مولانا! یہ کن وسوسوں میں مبتلا رہنے لگے ہو۔ بخدا میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور تم معلوم نہیں کیا سوچتے رہتے ہو۔ تم پڑھے لکھے معقول آدمی ہو اور اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہو کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا اور تم اپنا گوہرِ مراد بہ تعجیل حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔''

مولانا نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''میں شرمندہ ہوں، مجھ کو معاف کر دیجیے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''اچھا، اب آج مجھے بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

مولانا پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''یعنی حضرت! اب آج میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

شیخ نے برہمی سے کہا۔ ''یہ حیرت سے دیدے کیوں پھاڑ رہے ہو؟ میں علم غیب تو نہیں جانتا کہ تمہارے بتائے بغیر ہی تمہارا مطلب پالوں۔''

مولانا نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ علم غیب تو نہیں رکھتے لیکن روشن ضمیر تو ہیں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو، اپنا مطلب بیان کرو۔''

مولانا نے کہا۔ ''حضرت! میں چاہتا ہوں کہ عالم ربانی ہو جاؤں۔ بے مثل اور عدیم النظیر عالم ربانی۔ دور دور تک میرے علم کا شہرہ ہو اور اس سے میں اسلام کے فروغ اور احیاء کی خدمت انجام دے سکوں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''بس یا اور کچھ؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''تب پھر میرے پاس کیوں پڑے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔''

مولانا نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''تو میں کچھ لیے بغیر ہی چلا جاؤں؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''مولانا! آدمی خوب ہو تم۔ تم نے جو کچھ مانگا تھا وہ دے دیا گیا۔ اب یہ تکرار کیسی؟ جاؤ اپنا کام کرو جا کر۔''

مولانا انہیں سلام کر کے اپنے گھر چلے گئے اور اسی دن سے انہوں نے اپنے آپ میں حیرت انگیز تبدیلیاں محسوس کرنا شروع کر دیں۔ انہیں ایسا لگنے لگا گویا علم ان پر القا ہو رہا ہے، علوم کے مخفی اور دقیق گوشے اس طرح آشکار ہونے لگے گویا ان میں کبھی دقائق اور اسرار تھے ہی نہیں۔ مولانا وجیہ الدین بہت جلد عالم ربانی کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

☆☆☆

شیخ حمید الدین کے تیسرے مرید شیخ شاہی رسن تاب بدایونی تھے۔ آپ نے انہیں بدایوں بھیج دیا تھا۔ ان پر بھی اپنے پیر مرشد کی خاص نظر رہتی تھی۔ یہ رسیاں بٹا کرتے تھے، یہی ان کا کسبِ معاش تھا۔ ان کا کشف بھی بے حد مشہور تھا۔ شیخ حمید الدین بدایوں اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں کو شیخ شاہی کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے اس مرید اور خلیفہ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی دانستہ یا نادانستہ انہیں دھوکا دینا بھی چاہے گا تو شیخ شاہی اپنے کشف سے اس سے واقف ہو جائیں گے۔

ایک شخص شیخ حمید الدین کے پاس سے چل کر بدایوں پہنچا اور شیخ شاہی کی صحبت میں اس لیے رہنے لگا کہ وہ کسی موقع پر شیخ شاہی کا امتحان ضرور لے گا اور یہ دیکھے گا کہ آخر وہ کس طرح اپنے کشف کے ذریعے کسی دھوکے سے مطلع ہو جاتے ہیں۔

شیخ شاہی نے اس کو اپنے مریدوں میں داخل کر لیا اور اس پر خاص نظرِ کرم رہنے لگی۔ سفر و حضر میں یہ شخص آپ کے ساتھ ہی رہتا۔ آپ اس سے اکثر فرماتے رہتے کہ دیکھو کسی فقیر کا امتحان نہ لینا کیونکہ اس میں تمہیں بھی پریشانی اٹھانا پڑے گی اور فقیر کو بھی اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وہ شخص جواب دیتا۔ ''میری یہ مجال کہ میں کسی فقیر کا امتحان لوں، توبہ توبہ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

شیخ شاہی نے کہا۔ ''میں نے جو بات کہی ہے، وہ ایک نہ ایک دن سچ ثابت ہوجائے گی۔''

چند ماہ بعد شیخ شاہی اپنے مریدوں کے ساتھ ایک باغ میں قیام فرما تھے۔ ان میں وہ شخص بھی شامل تھا جس سے امتحان اور آزمائش کی باتیں ہو چکی تھیں۔ شیخ شاہی نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ آج کھیر کھانے کو جی چاہتا ہے، تیار کرو۔

حکم کی دیر تھی، تین مرید کھیر پکانے میں مشغول ہو گئے اور ان میں وہ شخص بھی شامل تھا۔

جب کھیر تیار ہو گئی تو آپ اپنے درویشوں کے ساتھ کھیر کھانے بیٹھ گئے۔ ابھی کھیر کا پہلا ہی چمچہ منہ میں ڈالا تھا کہ ہاتھ رک گیا اور اپنے مریدوں سے کہا۔ ''وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے کھیر پکائی ہے؟''

مریدوں نے کھیر پکانے والے تینوں ساتھیوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آپ نے ان سے کہا۔ ''دوستو! میں نے کھیر چکھی تو پہلے ہی لقمے میں مجھے محسوس ہو گیا کہ اس میں خیانت ہوئی ہے۔''

اس شخص نے جس سے کچھ باتیں ہو چکی تھیں، جواب دیا۔ ''خیانت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں سمجھا نہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ کھیر کا کچھ حصہ پہلے ہی کھایا جا چکا ہے۔ یہ بعد میں ہمارے پاس لائی گئی۔''

اس شخص نے انکار کیا۔ ''حضرت! ایسا نہیں ہوا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔''

آپ نے اصرار کیا۔ ''دیکھ تو سوچ لے، میں نے کھیر کو چکھتے ہی خیانت کی بو سونگھ لی ہے۔''

اس شخص نے اپنے ذہن پر زور دیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے کھیر تو نہیں کھائی مگر جب میں دودھ پکا رہا تھا تو وہ میری غفلت سے ابل کر ادھر ادھر گرنے لگا تھا۔ میں نے اس کو ضائع نہیں ہونے دیا اور تھوڑا سا پی لیا تھا۔''

شیخ شاہی نے فرمایا۔ ''یہ صریحاً خیانت ہے۔''

خطا کار نے عرض کیا۔ ''حضرت! اب تو غلطی ہو ہی گئی جو سزا تجویز فرمائیں گے، میں بھگتنے کو تیار ہوں۔''

شیخ نے حکم دیا۔ ''اس کو دھوپ میں کھڑا کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ یہ پسینے میں نہا جائے اور جتنا دودھ پیا ہے اس کے لگ بھگ اس کا پسینا بہہ جائے۔''

اس شخص کو دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا اور ذرا۔۔ دیر بعد ہی اس کے جسم سے پسینا بہہ نکلا۔

کچھ دیر بعد آپ نے اس کو سائے میں بلا لیا اور ایک مرید کو حکم دیا کہ جا کسی حجام کو بلا لا۔

چنانچہ ایک حجام بھی حاضر کر دیا گیا۔ آپ نے حجام کو حکم دیا۔ ''میں نے خیانت کے جرم میں اپنے ایک دوست کو دھوپ میں کھڑا کر کے پسینے سے شرابور کر دیا تھا۔ اب میں دوستی کے ناتے سے اپنے جسم سے اتنا ہی خون نکلوانے کو تیار ہوں۔''

مریدوں کو حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ حجام کو اس حکم کی تعمیل میں تامل تھا۔

آپ نے سختی سے فرمایا۔ ''میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کر۔''

آخر آپ نے اس کو بالکل مجبور کر دیا۔ حجام نے استرے اور نہرنی سے آپ کے جسم کے کئی حصوں کو نشتر لگا لگا کر لہولہان کر دیا۔ آپ کے کپڑے تر ہو گئے اور زمین کی مٹی تر ہو گئی۔ آخر مریدوں سے نہیں رہا گیا، رونے لگے اور گزارش کی خدا کے لیے بس کیجیے بہت ہو چکا۔

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے اس شخص کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ فقیر کو آزمائش میں نہ ڈالنا۔ اس سے دونوں کو ہی پریشان ہونا پڑے گا۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''آپ نے خیانت کی سزا دی یہ تو انصاف تھا لیکن پسینے کے عوض اپنا خون بہا دیا، اس کو کیا کہیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر وہ انصاف تھا تو یہ حقِ دوستی تھا۔''

لوگوں نے جب یہ واقعہ حمید الدین ناگوری کو سنایا تو آپ غمگین ہو گئے فرمایا۔ ''وہ میرا مرید ہے، اس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔''

☆☆☆

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا وصال ہو گیا۔ شیخ کو اس کا از حد ملال ہوا۔ ہمیشہ آزردہ و غمگین رہے۔

یہ سلطان شمس الدین التمش کا دور تھا۔ اس سال موسم برسات یوں ہی گزر گیا۔ فصلیں برباد ہو گئیں۔ شہر قحط سالی کا شکار ہو گیا۔ رعایا پرور شریف سلطان بہت پریشان رہنے لگا۔ اس نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

مصاحبین نے متفقہ عرض کیا۔ ''اس سلسلے میں اہلِ اللہ کی دعائیں حاصل کرنی چاہئیں۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''تب پھر تم لوگ شہر میں پھیل جاؤ اور اہلِ اللہ کو تلاش کر کے ان سے میری طرف سے درخواست کرو۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، کرنے کو تیار ہوں اور کرتا رہوں گا۔ لیکن یہ کام میرے اختیار کا نہیں کہ میں اپنے شاہی اختیارات سے بارش کروادوں۔ یہ کام اہلِ اللہ کا ہے، وہ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ وہ اس میں میرا ساتھ دیں اور مخلوق کو تباہی و بربادی سے بچالیں۔''

سلطان کے آدمی پورے شہر میں پھیل گئے مگر ان میں کے بیشتر شیخ حمید الدین ناگوری کے پاس پہنچے اور سلطان کا پیغام انہیں پہنچادیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''میں سلطان کی خواہش پر دعا کر تو سکتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ سلطان علماء ظاہر کے کہنے پر مجھ پر سختی نہ شروع کردیں۔''

سلطان کے آدمیوں نے پوچھا۔ ''کس قسم کی سختی؟ آخر ایسا کیوں ہوگا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''ایسا اس لیے ہوگا کہ وہ لوگ سماع سننا پسند نہیں کرتے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ بارش سماع کی برکت ہی سے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں؟''

مصاحبین نے آپ کی بات سلطان تک پہنچادی۔ سلطان نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ''اگر شیخ ایسا فرما رہے ہیں تو فوراً ہی محفلِ سماع کا انتظام کردیا جائے کیونکہ اس جواب میں یہ اشارہ موجود ہے کہ بارش سماع کے طفیل ہی ہوگی۔''

سلطان کے حکم پر محفلِ سماع منعقد کردی گئی۔ شیخ حمید الدین اور شہر کے دوسرے صوفی بھی وہیں پہنچ گئے۔ سلطان بھی ان کے پیشواؤں میں شامل تھا۔ شہر کے بہترین قوالوں کو طلب کرلیا گیا۔ اس محفل میں جو صوفی شریک ہوئے تھے، وہ بہت بلند پایہ تھے۔ آپ نے قوالوں کو حکم دیا کہ شروع کریں۔

سماع کا آغاز ہوا۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ تیری رحمت پر بھروسا کر کے مجمع لگالیا ہے، میں تجھ پر ناز کرتا ہوں، تو مجھے شرمندہ نہ ہونے دے۔''

جب محفل ذرا رنگ پر آنے لگی تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔ آپ نے لوگوں کو منع کیا کہ اگر بارش تیز ہوجائے تو یہاں سے اٹھا نہ جائے۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ قوال مست و بے خود تھے اور سامعین بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھے۔ وہ بارش میں تربتر، شرابور ہو چکے تھے مگر انہیں وہاں سے جانے کا ہوش نہیں آرہا تھا۔

سلطان نے شیخ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا، آپ نے فرمایا۔ ''سلطان! آپ خود بھی درویش ہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے رب کا شکریہ ادا کیجیے۔''

سلطان نے عرض کیا۔ ''میں نے اپنے رب کا شکر پہلے ہی ادا کرلیا لیکن واسطے کا کام چونکہ آپ نے انجام دیا ہے، اس لیے مجھ پر آپ کا شکریہ بھی لازم ہے۔''

یہ ۶۰۵ھ کے ۹ رمضان المبارک کا دن تھا۔ آپ بہ پابندی روزے رکھ کر رات کی تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ اس شب آپ نے تراویح میں پورا قرآن ختم فرمادیا۔ آخر میں نمازِ وتر ادا کی اور آخری سجدے میں کافی دیر پڑے رہے۔ ارادت مندوں کو اس طویل سجدے پر حیرت ہوئی اور ڈرتے ڈرتے آپ کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی لیکن شیخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آخر ایک شخص نے خود بھی سجدے میں جا کر شیخ کے کان سے اپنا منہ لگادیا بولا۔ ''حضرت! خیریت تو ہے، پہلے تو کبھی آپ نے اتنا طویل سجدہ نہیں کیا تھا؟''

آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کو اٹھانے کی کوشش کی تو آپ ایک طرف ڈھلک گئے اور اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کی روحِ مبارک حالتِ سجدہ میں ہی پرواز کر چکی ہے۔

ماخذات

بساتین السلاطین	تاریخ فرشتہ	عہدِ سلاطین دہلی	بدون تاریخ	فرمانروایانِ اسلام	مآثر الامرا
مرزا ابراہیم زبیری	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	طبا طبائی	لین پول	صمصام الدولہ شاہنواز خان

علی بن محمد خارجی

ضیاء تسنیم بلگرامی

تاریخ کا عبرت آمیز و عبرت آموز سیاہ باب

تاریخ اسلام کا وہ سیاہ باب جس نے ایک عرصہ تک بغداد، سامرہ، بصرہ اور اس کے قرب و جوار کو گھنا ئے رکھا۔ خلافت کی افواج بے بس ہو کر رہ گئیں۔ اس نے سیاہ فام غلاموں میں ایسی روح پھونک دی کہ آقاؤں کی طنابیں توڑ دی گئیں۔ وہ بے بس و مجبور ہو گئے۔ کالوں کی دہشت سے بستیاں اجڑ گئیں۔ لوگوں نے گاؤں اور قصبے چھوڑ دیے اور پناہ کی تلاش میں دربدر ہو گئے۔
جھوٹے خارجی نبی کے حالات اور واقعات اگر بغداد اور سامرہ کی محلاتی سازشوں اور خلفا کی نااہلی کے تناظر اور پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ اس قدر کیسے پھل پھول گیا۔ متواتر کئی خلیفہ ترکوں سے اپنی بقا کی جنگ لڑتے رہے۔ ان کو اس جھوٹے نبی کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اسلام اور مسلمانوں سے بے خبر خلفا ترکوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے رہے اور جھوٹا نبی من مانی کرتا رہا۔ اس کے حالات اتنے زیادہ اور وسعت طلب ہیں کہ انہیں اختصار سے بیان کرنا... حقائق سے خواہ مخواہ پہلو تہی کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس کے بقیہ حالات تیسری اور آخری قسط میں بیان کر دیے جائیں گے۔

علی بن محمد کا حوصلہ ابوصالح کی آمد سے بہت بڑھ گیا تھا کیونکہ ابوصالح نہایت ہوشیار اور بہادر شخص تھا۔ ارادوں میں چٹانوں جیسی سختی پائی جاتی تھی، ابوصالح پستہ قامت تھا، وہ اپنے تین سو ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "میں نے جب بھی اپنی اور اپنے زنگی بھائیوں کی حالت زار پر غور کیا تو نہایت افسوس ہوا کہ ہم سب انتہائی وفادار اور محنتی ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں پاتے، میری مایوسی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ میں اللہ سے شکوے کرنے لگتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ اے اللہ، ہم میں کیا کمی ہے جو ہمیں تو نے اس قدر ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ کیا تیرے قبضۂ قدرت میں اتنی سی بات بھی نہیں کہ ہم میں ایک پیغمبر ہی بھیج دے جو ہماری اصلاح بھی کرے اور ہماری مدد بھی کرے۔

ابوصالح کی باتیں علی بن محمد بھی سن رہا تھا اور اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا ۔ اسے یہ محسوس کر کے زیادہ طمانیت حاصل ہوئی کہ میدان جنگ کی ذمے داریاں ابوصالح سنبھال لے گا۔ جب ابوصالح خاموش ہوا تو علی بن محمد نے کھڑے ہو کر ابوصالح کی بڑی تعریفیں کیں اور کہا "تو پستہ قامت ہے اس لیے میں تجھ کو آئندہ قصیر کہہ کر مخاطب کیا کروں گا۔" ابوصالح کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

وہاں زنگیوں کی بہت بڑی تعداد جمع تھی۔ علی بن محمد ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور زنگیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس نے ایک بار پھر وعدہ کیا کہ وہ عنقریب غلاموں کو آقا بنا دے گا اور انہیں اس حد تک اسباب عیش فراہم کرے گا کہ ان کے آقا بھی دیکھیں گے تو رشک کریں گے۔ اس نے ہجوم میں سے دو آدمیوں کو الگ کیا، انہیں اپنے پاس بلایا اور ایک سے پوچھا "تیرا نام؟"

اس نے جواب دیا "علی بن ابان۔"

علی بن محمد نے دوسرے سے بھی یہی سوال کیا، پوچھا "تجھ کو لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "محمد بن مسلم۔"

علی بن محمد نے ان دونوں کو ایک نسبتاً اونچے پتھر پر کھڑا کر دیا اور کہا "دوستو! ان دونوں کو اچھی طرح پہچان لو، ان میں سے ایک کا نام علی بن ابان ہے اور دوسرے کا نام محمد بن مسلم۔ یہ دونوں ہمارے میمنے اور میسرے کے سردار ہیں اور ہماری کل فوج کے سردار ابوصالح قصیر۔ آئندہ ان عہدے، مراتب کا خیال رکھا جائے گا۔"

ایک زنگی نے پوچھا "کیا ہم امیرالمومنین معتمر باللہ کی فوج کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

علی بن محمد نے جواب دیا "ضرور کر سکیں گے کیونکہ میں نے تم کو اللہ کے حکم سے متحد کیا ہے اور اسی کے حکم سے اب خلافت کی افواج سے جنگ کروں گا اور یاد رکھو کہ جو کام اللہ کے حکم اور مشیت سے انجام دیا جا رہا ہو اس میں ناکامی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ایک زنگی نے انکشاف کیا "مجھ کو میری ہی رنگت کے ایک درباری نے بتایا ہے کہ خلیفہ معتمر اپنے باپ کو قتل کروا دینے کے بعد خلیفہ

بنا تو اب اپنے دونوں بھائیوں موید اور معتز کو خلافت سے دستبرداری پر مجبور کر رہا ہے اور ان حالات میں کہ خلیفہ منتصر نے اپنے داخلی اور خاندانی معاملات ہی کو بگاڑ لیا ہے اور اپنے بہت سارے دشمن قصر خلافت اور شاہی محلات میں پیدا کر لیے ہیں۔ وہ اب ان بیرونی جنگوں میں کس طرح کامیاب ہو گا؟" علی بن محمد زنگی کی ان باتوں سے بہت خوش ہوا اور اعلان کیا کہ یہ باتیں سب تک پہنچا دی جائیں کیونکہ اس سے انہیں حوصلہ ملے گا۔



خلیفہ منتصر ابھی صرف چوبیس سال کا تھا اور اس میں جذباتیت کی شدت پائی جاتی تھی، وقائع نویس اور سرکاری مخبر اس کو خبردار کر رہے تھے کہ علی بن محمد نے زنگیوں میں جو صور پھونکا ہے اس سے وہ متحد ہوتے جا رہے ہیں۔ علی بن محمد کے جھنڈے تلے جمع ہو جانے والے زنگی ایک فوج کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے آقاؤں کو قتل کر دیا اور اب وہ ہمیں قتل کر دینا چاہتے ہیں اس لیے اس کا سدِباب بہت ضروری ہے۔ نوجوان خلیفہ نے غصے میں اپنے مشیروں سے پوچھا "یہ جو کچھ میں نے اپنی حکمتِ عملی سے حاصل کیا ہے، کیا اب میں ان غلام زنگیوں سے ڈر جاؤں گا۔" اس کے بعد اس نے اپنے قریبی مشیر احمد بن خصیب، وصیف اور بغا سے پوچھا "میرے بھائی موید اور معتز آزاد پھر رہے ہیں اور تم سب یہ جانتے ہو کہ میرے باپ متوکل نے ان دونوں کو اپنا ولی عہد اور جانشین نامزد کر دیا تھا۔ اب مکے، مدینے اور ہماری حکومت کے دیگر عمال اور والیان کو یہ معلوم ہے کہ معتز اور موید جائز جانشین اور ولی عہد ہیں۔"

بغا نے منتصر سے کہا "امیرالمومنین! ہمیں ان دونوں سے ڈر ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اس لیے ان کا قتل جائز ہے۔"

منتصر نے انہیں حکم دیا "تم لوگ ابھی اور اسی وقت ان دونوں کے پاس جاؤ اور ان سے خلافت سے دستبرداری کی تحریر لکھوا لو تاکہ اس خطرے سے بھی نجات مل جائے۔" وہ لوگ اسی وقت موید اور معتز کے پاس پہنچے اور اپنی غایت بیان کی۔

موید خوف زدہ تھا اس نے کہا "میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

لیکن معتز نے انکار کر دیا اور کہا "میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میرے مخالف اور غاصب رسوا ہوں گے۔" یہ جواب لے کر تینوں خلیفہ منتصر کے پاس واپس گئے اور لفظ بہ لفظ جواب دُہرایا، منتصر نے غصے میں حکم دیا "دونوں کو قید کر دیا جائے۔"

وہ لوگ الٹے قدموں واپس گئے اور دونوں کو کوٹھریوں میں قید کر دیا۔ جب دونوں کو الگ کر کے لے جایا جا رہا تھا تو موید نے معتز سے کہا۔ "بھائی! تمہاری ضد ہمیں قتل کروا دے گی، ہمیں ولی عہدی سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔"

معتز نے غصے میں جواب دیا "میں ہرگز دستبردار نہیں ہوں گا اگر منتصر نے ایسا کیا تو ساری دنیا میں بدنام ہو جائے گا کیونکہ ہماری ولی عہدی کا علم ہر ایک کو ہے اور ہمارے انکار پر منتصر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ ہمیں قتل کروا دے۔"

دونوں قید کر دیے گئے لیکن موید نے درخواست کی "ہم دونوں کو ایک جگہ رکھا جائے تاکہ میں بھائی معتز کو سمجھا بجھا کے ولی عہدی سے دستبرداری پر رضامند کر لوں۔"

خلیفہ منتصر سے اجازت حاصل کر کے دونوں کو ایک ہی کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔ اب دونوں بھائیوں میں بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ بمشکل تمام دونوں ولی عہدی سے دست برداری پر راضی ہو گئے۔ خلیفہ کو اس سے مطلع کیا گیا۔ خلیفہ نے ان تینوں کو قلم دوات، کاغذ اور کاتب کے ساتھ دونوں کے پاس بھیج دیا۔ کاتب نے دونوں کو دستبرداریِ ولی عہدی کی عبارت اِملا کروائی اور دونوں کے دستخط لے کر تحریر خلیفہ منتصر کو پہنچا دی۔

اس دستبرداری نامہ میں دونوں کو منتصر کے بعد ولی عہد قرار دیا گیا تھا۔ جب منتصر اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر رہا تھا تو کسی خوشامدی نے خلیفہ منتصر کو مشورہ دیا "امیرالمومنین! آپ یہ کیا غضب کر رہے ہیں، آپ اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کریں اور ان دونوں کے نام اس میں سے نکال دیں۔"

منتصر نے اس شخص کا مذاق اڑایا اور کہا "میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے۔ کیا تو یہ ذمّے داری قبول کر سکتا ہے کہ جب تک میرا بیٹا جوان نہ ہو جائے میں زندہ رہوں کیونکہ مجھ کو یہ بات پسند نہیں کہ میں ان دونوں کو ولی عہدی سے خارج کر کے اپنے ننھے منے بیٹے کو ولی عہد نامزد کر دوں اور میں بہت جلدی چل بسوں اور اقتدار پر میرے چچا، ماموں کے بیٹے میرے بچے کے سرپرست بن کے حکومت کرنے لگیں۔"

خوشامدی نے جواب دیا "زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے، کوئی انسان اس کی ذمّے داری کس طرح قبول کر سکتا ہے۔"

منتصر نے اپنے دونوں بھائیوں کو دربار میں طلب کیا اور دونوں کو اپنے دائیں بائیں بٹھا کے چمٹا لیا اور کہا "ہو سکتا ہے تم دونوں مجھ کو ظالم سمجھ رہے ہو لیکن میں ظالم اس لیے نہیں ہوں کہ میں نے تم دونوں کو زندہ رکھا اور کسی قسم کی جسمانی اذیت نہیں دی، اب تم دونوں یکے بعد دیگرے ولی عہد ہو۔"

ایک زنگی غلام جو خلیفہ کے خدمت گار کی حیثیت سے پیچھے کھڑا رہتا تھا، اس نے خلیفہ کو خلافِ توقع جواب دیا "کمال ہے! آپ خود کو ظالم نہیں سمجھ رہے ہیں جبکہ اپنے باپ متوکل کو قتل کر کے آپ خلیفہ بنے۔ کیا کسی بیٹے کا باپ کو قتل کر دینا ظلم نہیں ہے۔"

خلیفہ منتصر نے حکم دیا "اس کو قید کر دیا جائے' غلام اس طرح زبان نہیں کھول سکتے۔" زنگی غلام کو قید کر دیا گیا۔

منتصر نے اپنے مشیروں سے پوچھا "اس کالے غلام میں اتنی جرأت اور بے باکی کہاں سے آگئی؟"

وصیف نے جواب دیا "امیرالمومنین! آپ کو علی بن محمد تو یاد ہو گا' وہ قصیدہ گو شاعر اب ان کالوں کا نبی بن گیا ہے اور یہ جرأت اور بے باکی اسی نے ان میں پیدا کر دی ہے۔" یہاں دربار اور قصر خلافت میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی خبریں علی بن محمد کو پہنچ رہی تھیں' اس نے اپنے آدمیوں سے کہا "ابھی خلیفہ سے جنگ کرنے کا وقت نہیں آیا۔ یہ لوگ آپس ہی میں لڑ جھگڑ کر تباہ ہو جائیں گے۔"

اور واقعی قصر خلافت میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی' خلیفہ منتصر کو یہ احساس بری طرح شرمندہ کر رہا تھا کہ اس نے غم و غصے میں اپنے باپ متوکل کو قتل کروا دیا تھا۔ اسی الجھن اور پریشانی میں اس نے رات کے پچھلے پہر ایک خواب دیکھا کہ اس کے سامنے ایک بہت بڑا زینوں کا سلسلہ ہے' وہ ان زینوں پر چڑھنے لگا' وہ چڑھ رہا تھا اور سیڑھیوں کی گنتی کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ پچیسویں سیڑھی پر پہنچا تو کسی غیبی آواز نے اس کو رک جانے کا حکم دیا "رک جا' کسی اگلی سیڑھی پر پاؤں مت رکھنا' تیری آخری حد یہ پچیسویں سیڑھی ہے۔"

خلیفہ منتصر بیدار ہو گیا اور پریشان ہو کر ٹہلنے لگا' صبح ہوتے ہی ابن یحییٰ نجومی کو طلب کیا اور اس کو اپنا خواب سنا کے پوچھا "اس خواب کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟"

ابن یحییٰ نے جواب دیا "امیرالمومنین! آپ نے اپنی زندگی کی چوبیس سیڑھیاں آسانی اور روانی سے طے کر لیں۔ پچیسویں سیڑھی آپ کے اقتدار کی سیڑھی ہے۔ اب دنیا میں آپ کو اس سے بڑا مرتبہ نہیں مل سکتا اس لیے ہاتف غیبی نے آپ کو خبردار کیا کہ یہ دنیا کا آخری ترقی کا زینہ ہے۔" وہ کئی دن تک بہت پریشان رہا اور چپ چپ رہنے لگا۔

اسی دوران یسر نامی خادم خلیفہ سے قریب رہنے لگا' یہ بیت المال کا متولی اور محافظ تھا۔ ایک دن یہ خلیفہ کے بلوانے پر محل میں گیا تو اسے اس کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں لوگ بیٹھ کے انتظار کیا کرتے تھے کہ خلیفہ اذن باریابی دے تو وہ اندر جائیں' اس وقت خلیفہ سویا ہوا تھا۔ اچانک چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر کسی کے زور زور سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ محل میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ اس چیخ کی آواز کی طرف بھاگے۔ یسر بھی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ عبداللہ بن عمرالبازیار بھی جو خلیفہ کا خاص مشیر تھا' ایک طرف سے نمودار ہوا اور انتظار گاہ میں داخل ہو گیا۔ یسر سے کہا "اے یسر! تجھ پر خرابی ہو' یہ چیخ کی آواز کس کی تھی؟"

یسر نے جواب دیا "چیخ کی آواز تو میں نے بھی سنی اور میرا خیال ہے یہ امیرالمومنین کی آواز تھی۔"

عبداللہ بن عمر نے خلیفہ تک رسائی حاصل کی اور پوچھا "میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی آنکھوں کو کبھی بھی نہ رلائے' آپ کیوں رو رہے تھے؟"

اس وقت بھی منتصر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا "اے عبداللہ تو میرے قریب آجا۔"

عبداللہ البازیار نے عرض کیا "باہر یسر بھی اذن باریابی کا منتظر ہے اگر آپ اجازت دیں تو اس کو بھی اندر بلوالیں۔"

خلیفہ نے اجازت دے دی۔ عبداللہ نے یسر کو بھی اندر بلا لیا۔ خلیفہ نے دونوں سے کہا "تم دونوں میرے قریب آجاؤ تاکہ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیوں چیخا اور رویا تھا" دونوں خلیفہ کے قریب گئے۔ خلیفہ منتصر پس و پیش میں تھا اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کی ادائیگی کے لیے مناسب الفاظ اور پیرایۂ بیان تلاش کر رہا تھا' یکایک بتانے لگا "آج میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ میرا باپ متوکل میرے پاس آیا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ اے منتصر! تیری بربادی ہو کہ تو نے مجھ کو قتل کر کے مجھ پر ظلم کیا اور میری خلافت مجھ سے چھین لی لیکن آج میں تجھ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ تو مجھ سے خلافت چھین کے اس سے زیادہ دنوں تک لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ بس چند روز خلافت کے مزے لوٹ لے' اس کے بعد تجھ کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد جیسے مجھے ہوش آگیا۔ جب میرا باپ متوکل یہ سب کہہ رہا تھا میں اس وقت بھی چیخیں مار مار کے رو رہا تھا اور اس وقت بھی نہ میرا دل میرے قابو میں ہے اور نہ میری آنکھیں میرے اختیار میں۔"

عبداللہ بن عمرالبازیار نے کہا "امیرالمومنین! آپ بالکل فکر نہ کریں اور خواب کے بارے میں کیا کہا جائے' یہ کبھی سچے ہوتے ہیں اور کبھی جھوٹے۔ آپ تو اپنے خوف' غصے اور پریشانی کو شراب میں ڈبو دیجئے۔ عورتوں سے دل بہلایئے اور خواب کی پروا نہ کیجئے۔"

منتصر نے عبداللہ کے مشورے پر عمل کیا مگر دل کو سکون پھر بھی نہ ملا۔ کئی دن بعد اس نے یسر کو حکم دیا "میں اس وقت کھیل سے دل بہلانا چاہتا ہوں اس لیے میرے باپ نے جو قیمتی نوادر جمع کر رکھے ہیں ان میں سے ایک فرش نکال کے میرے پاس لے آ۔"

یسر نے حکم کی تعمیل کی اور ایک ایرانی نادر فرش نکال لایا۔ منتصر نے ایک جگہ اشارہ کیا "اسے یہاں بچھا دے۔"

یہ فرش وہاں بچھا دیا گیا۔ منتصر نے اس نادر قیمتی فرش کے درمیان میں ایک دائرہ بنا ہوا دیکھا' اس دائرے میں کسی انسان کی صورت بنی ہوئی تھی۔ یہ شخص گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے سر پر تاج رکھا ہوا تھا اور کناروں پر گرداگرد کچھ فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا۔

منتصر نے یسر سے پوچھا "تجھ کو فارسی آتی ہے؟ اگر آتی ہے تو اسے پڑھ کر سنا۔"

یسر نے جواب دیا "مجھے فارسی بالکل نہیں آتی۔"

خلیفہ نے حکم دیا "کسی فارسی خواں کو بلا۔"

کچھ دیر بعد ایک فارسی خواں لایا گیا۔ منتصر نے اس کو حکم دیا "اسے پڑھ کر اس کا مفہوم عربی میں منتقل کردے۔"
قاری خواں نے اسے پڑھ کر سکوت اختیار کیا۔ منتصر نے سختی سے حکم دیا "تو خاموش کیوں ہو گیا تو اس کا مفہوم بتاتا کیوں نہیں؟"
قاری خواں نے جواب دیا "امیرالمومنین! اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے آپ کو پریشانی اٹھانی پڑے اس لیے میں اس کو نہیں پڑھنا چاہتا۔"

منتصر نے بے حد اصرار کیا اور کہا "اگر تو اس کا مطلب نہیں بتائے گا تو میں کسی دوسرے فارسی خواں سے پڑھوا لوں گا۔"
اب فارسی خواں مجبور ہو گیا اور اس نے پڑھ کے سنانا شروع کیا "اس میں لکھا ہے کہ میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمزہوں' میں نے اپنے باپ کو قتل کردیا تھا اور جب میں تختِ حکومت پر بیٹھا تو مجھے چھ مہینے سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔" منتصر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ منتصر نے بھی اپنے باپ کو قتل کروادیا تھا اور حکومت کرتے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے' اس لیے اس کو وہم ستانے لگا۔

اب منتصر مستقل ذہنی اذیت میں مبتلا ہو چکا تھا اور اسے ایک شعر بار بار یاد آرہا تھا اور زیرِ لب دُہراتا رہتا تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا۔
"میرا جی اس دنیا سے خوش نہ ہوا جسے میں نے حاصل کیا تھا اور اب میں اپنے پروردگار کے پاس واپس جارہا ہوں۔"
آخر کار منتصر کو بخار رہنے لگا' طبیبوں نے بتایا معدے پر ورم ہے اور اس کے لیے دوائیں دیں پھر طے پایا کہ فصد کھولی جائے۔ آخر فصد کھولنے کے ماہر طبیب کو بلایا گیا' اس نے فصد کھولی مگر وہ خود بہت گھبرایا ہوا تھا۔ منتصر کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی' اس نے نقاہت میں طبیب کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا "سچ بتا تجھ کو اس کام کی کتنی رقم ملی ہے؟"
طبیب نے نشتر کو چھپالیا اور جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔"
خلیفہ منتصر بے ہوش ہو گیا اور طبیب نے خدمت گاروں کو بتایا کہ اب خلیفہ کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ طبیب آلاتِ جراحی کے ساتھ گھر پہنچا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا اور اس کے خوف نے اسے بخار میں مبتلا کردیا۔ آخر اپنے ایک لائق فائق شاگرد کو بلوایا اور نیم غنودگی میں اس کو حکم دیا "میری فصد کھولی جائے۔" اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔
شاگرد نے نشتروں کا معائنہ کیا اور ان میں جو سب سے اچھا نشتر نظر آیا اُس سے اپنے استاد کی فصد کھول دی۔
طبیب کو احساس ہوا کہ اس کی حالت غیر ہوتی جارہی ہے' اس نے آنکھیں کھول کر اپنے شاگرد اور آلاتِ جراحی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تو نے کس نشتر سے میری فصد کھولی ہے؟"
شاگرد نے جواب دیا "ان میں جو سب سے اچھا نشتر تھا اس سے۔"
طبیب ہول گیا اور کہا "بیٹے تو کہیں جائے گا نہیں کیونکہ خلیفہ منتصر کی طرح کچھ دیر بعد تو میرے کفن دفن کی تیاری کر کیونکہ اب میں اچھا نہیں ہو سکتا۔ اسی نشتر سے میں نے خلیفہ کو پریشان کیا تھا اور فصد کھول کے اللہ کے پاس جانے کا راستہ کھول دیا تھا کیونکہ یہ نشتر زہر آلود تھا۔ اب اسی سے میں خلیفہ کے پاس جارہا ہوں۔"
کہتے ہیں کہ جس وقت قصرِ خلافت سے رونے دھونے کی آوازیں بلند ہوئیں اسی وقت طبیب کے گھر میں بھی کہرام برپا تھا۔
طبیب کو کس نے زہر آلود نشتر سے فصد کھولنے کا حکم دیا تھا یہ نہیں معلوم ہو سکا لیکن جب نئے خلیفہ کے انتخاب کی باتیں شروع ہوئیں تو خلیفہ متوکل کے قاتلوں نے اس بات پر اتفاق کرلیا کہ نیا خلیفہ متوکل کی اولاد میں سے نہیں ہونا چاہیے۔ آخر کار محمد بن احمد بن معتصم کو خلیفہ چن لیا گیا اور اس کا خطاب مستعین باللہ قرار پایا۔ چنانچہ اس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ موید اور معتز کے حامیوں نے نئے خلیفہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا اور کافی خون ریزی کے بعد جب نئے خلیفہ کو اقتدار میں لانے والوں نے باغیوں پر قابو پالیا تو کسی نے یہ رائے دی کہ موید اور معتز کو قتل کردیا جائے۔ لیکن اکثریت نے اس سے اختلاف کیا اور کہا "ان دونوں نے باغیوں کو حملے پر نہیں اُکسایا تھا اس لیے ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔"
موید اور معتز کے مخالفوں نے کہا "لیکن ان کا آزاد رہنا ہمارے لیے ہر وقت خطرے کا سبب بنا رہے گا اس لیے اگر ان کو قتل نہ کیا جائے تو انہیں قید ضرور کردیا جائے۔" اس رائے سے سب ہی نے اتفاق کیا اور موید اور معتز قید خانے میں ڈال دیے گئے۔
یہاں یہ ہنگامے برپا تھے اور علی بن محمد ان کی ایک ایک بات سے آگاہ تھا۔ مخبروں کا ایک جال تھا جو علی بن محمد کے لیے کام کررہا تھا۔ اس نے اپنے پیروؤں سے کہا "یہی وقت ہے کہ ہم اپنی کارروائیوں کا آغاز کریں' قصرِ خلافت کا ہر شخص سازشوں میں مشغول ہے اور وہ ہم پر توجہ نہیں دے سکتے۔" چنانچہ اس نے بصرے کا رخ کیا اور یحییٰ بن محمد کو اپنے لشکر کا امیر بنایا۔ بصرے والوں نے یکے بعد دیگرے تین لشکر یحییٰ بن محمد کے مقابلے پر روانہ کیے اور تینوں کو شدید مقابلے کے بعد شکست سے دوچار ہونا پڑا۔
یحییٰ بن محمد جب بھی انہیں شکست دیتا راہِ فرار اختیار کرنے والوں سے کہتا "بغداد جاؤ اور خلیفہ سے مدد لے کر ہمارے مقابلے پر آؤ۔" کسی زخمی نے خلیفہ کا مذاق اڑایا "کون خلیفہ؟ منتصر وہ تو اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ مستعین باللہ! وہ خلیفہ ہے اور رہتا نہیں کتنے دن خلیفہ رہے گا اس لیے جب تم لوگ یہاں سے فرار ہو کے بغداد یا سامرہ پہنچو تو وہیں ہمارا انتظار کرنا اور ہم اس خلافت سے تمہیں ہمیشہ کے لیے نجات دلادیں گے۔"

اِن جنگوں سے علی بن محمد کو بڑا سامان ملا۔ جنگی سازوسامان اور رسد وغلہ جس سے انہیں بڑی بے فکری ہو گئی۔ یہ خبریں قصرِ خلافت پہنچیں تو اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کے ابوہلال ترکی کو ایک فوج دے کر علی بن محمد کی بیخ کنی کے لیے روانہ کردیا گیا۔ علی بن محمد نے اسے بھی شکست دے دی اور اس کی لشکر گاہ کو لوٹ کر پامال کردیا اور سیکڑوں آدمیوں کو قتل کردیا۔ یہ خبر قصرِ خلافت پہنچی تو بعجلت کسی منصوبہ بندی کے بغیر ابومنصور نامی فوجی سپہ سالار کی نگرانی میں علی بن محمد کے مقابلے پر روانہ کردیا گیا۔ علی بن محمد اور زنگیوں کے حوصلے بہت بلند تھے اور اب انہیں مال ودولت کافی مقدار میں مل گیا تھا اس لیے ان کی ہوس میں اضافہ ہوا اور زیادہ جوش وخروش سے مقابلہ کرنا شروع کردیا۔ علی بن محمد کو جب مخبروں نے یہ خبردی کہ ابومنصور ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کے مقابلے پر آرہا ہے تو اس نے بھی اپنے دو سرداروں کو ابومنصور کے مقابلے کے لیے تیار کیا' ایک کا نام تھا علی بن ابان اور دوسرے کا نام تھا محمد بن مسلم۔

ابھی جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی اور خلافت کا سپہ سالار ابومنصور راستے ہی میں تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس جنگ کو جھوٹے مدعی نبوت کے خلاف جہاد سمجھ کر خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کرنا شروع کردیا جس سے ابومنصور کے لشکر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ ذرا ذرا سی خبریں علی بن محمد کو پہنچ رہی تھیں۔ اس نے بھی بھرپور جنگی تیاری کی اور جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں تو ان کا جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس وقت دریا کے کنارے ایک ہزار کشتیاں لنگرانداز تھیں اور ان کشتیوں میں اشیائے خوردونوش اور اسلحے کا ذخیرہ جمع تھا۔

علی بن محمد نے اپنے فوجی سردار علی بن ابان کو حکم دیا "پہلے تو ان کشتیوں پر قبضہ کرلے اور اس پر جو سامان ہے اسے اپنی تحویل میں لے لے اس طرح ابومنصور جنگ کے بغیر ہی ایک بڑی شکست سے دوچار ہوجائے گا۔"

علی بن ابان نے اپنے جھوٹے نبی علی بن محمد کا پرچم اٹھا رکھا تھا۔ زنگیوں نے نعرے لگائے "مظلوموں کی جنگ ظالموں کے خلاف۔ ہمارا نبی ہم میں موجود ہے اس لیے شکست کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' ہم عنقریب علاقے فتح کرتے ہوئے بغداد اور سامرہ میں داخل ہوجائیں گے اور اپنے نبی کو بغداد کے قصرِ خلافت میں بحیثیت روحانی خلیفہ تخت پر بٹھادیں گے اور پھر پوری دنیا ہمارے زیرِ فرمان آجائے گی۔" اس شوروغل نے گھاٹ پر کھڑی ہوئی کشتیوں میں ہلچل مچادی۔ علی بن ابان نے ان کشتیوں پر اچانک حملہ کردیا اور کشتیوں کے عملے نے دریا میں چھلانگیں لگادیں اور تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ زنگیوں نے لوٹ مار شروع کردی اور کشتیوں پر قبضہ کرلیا۔

ابومنصور کو زنگیوں کی اس کارروائی کا علم ہوا تو اس نے غصے میں خود مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک نخلستان کو میدانِ جنگ کی حیثیت سے منتخب کیا۔ دوسری طرف علی بن ابان اور محمد بن مسلم نے ابومنصور کے مقابلے کے لیے اس کے مقابل اپنے اپنے فوجی دستے پہنچادیے۔ علی بن محمد اور اس کے سپہ سالار نہایت تحمل اور ہوش مندی سے اپنے منصوبوں پر عمل کررہے تھے۔

نخلستان کے مقابلے میں ابومنصور کو شکست ہوئی اور علی بن محمد کے زنگی سردار اس کا مقابلہ کرتے ہوئے بصرے کی طرف بڑھے۔

بصرے والوں نے اپنے طور پر مقابلے کا منصوبہ تیار کررکھا تھا چنانچہ جب علی بن ابان اور محمد بن مسلم بصرے کے قریب پہنچے تو بصرے والے پہلے ہی سے مقابلے کے لیے تیار نظر آئے' دونوں میں خوفناک تصادم ہوا اور کئی گھنٹے مقابلہ جاری رہا آخرکار زنگیوں نے بصرہ والوں کو شکست دے دی۔ ابومنصور شکست اٹھا کر فرار ہوگیا۔ یہ خبریں بغداد اور سامرہ پہنچ رہی تھیں مگر خلیفہ' ولی عہد' امرا اور درباری اپنی اپنی جنگوں میں مشغول تھے۔ مستعین باللہ اپنی خلافت کو بچانے کی فکر کررہا تھا۔ امرا اس سے زیادہ سے زیادہ فائدے اٹھانے کی کوششوں میں مشغول تھے۔ موید اور معتز نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنے حامی امرا کو آگے بڑھانے کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ درباری ہر اس شخص کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے جس سے انہیں کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ ان حالات میں علی بن محمد اور زنگی نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے منصوبوں پر عمل کررہے تھے اور انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ خلافت عباسیہ تباہی کی طرف جارہی ہے یا ترقی کی طرف۔

خلافتِ عباسیہ اور عباسی خلفا نے ترکوں کی ایما پر سامرہ کو بغداد کی جگہ دارالخلافہ بنا رکھا تھا کیونکہ اس چھوٹی سی جگہ کو اپنے قابو میں رکھنا آسان تھا جبکہ بغداد اپنی وسعت کی وجہ سے ترکوں کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ مستعین باللہ اس نکتے کو سمجھ چکا تھا اور بغداد واپس جانے کی فکر میں تھا۔ وہ امرا جنہوں نے خلیفہ متوکل کے قتل میں حصہ لیا تھا اب وہ خلیفہ مستعین باللہ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

معتز اور موید کے حامی امرا رشوتیں دے دے کر ان دونوں سے ملاقاتیں کررہے تھے اور ان دونوں کے لیے کوششوں میں مشغول تھے۔ بغا شرابی' وصیف اور باعز اپنی طرف سازشوں میں مشغول تھے' باعز ایک عرصے سے بغا شرابی کی مصاحبت میں تھا اور ہر وقت بغا شرابی کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ یہ ایک بہترین سپہ سالار بھی تھا۔ خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد باعز کے وظیفے میں اضافہ کردیا گیا تھا اور مضافات کوفہ میں جاگیریں اس کے نام کردی گئی تھیں۔ ان جاگیروں میں کسی ذمے دار شخص سے باعز کی اَن بن ہوگئی۔ باعز نے بغا شرابی سے اس کی شکایت کی اور کہا "آپ اس کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھائیں۔"

بغا شرابی نے وعدہ کیا "ذرا تحمل سے کام لے' میں بہت جلد تیرے دشمن کا کام تمام کردوں گا۔" اور ساتھ ہی باعز کے دشمن کو ایک خط کے ذریعے مطلع کردیا "باعز سے ہوشیار رہنا۔ یہ تیرے خلاف خطرناک منصوبے بنا رہا ہے۔"

باعز کو کچھ شبہ ہوگیا اس نے قصرِ خلافت میں آنا جانا بند کردیا۔

خلیفہ مستعین نے باعز کی کمی محسوس کی تو اس کے بارے میں وصیف سے پوچھا "یہ باعز کیسا آدمی ہے؟"

وصیف نے جواب دیا "امیرالمومنین اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں' ویسے میری ذاتی رائے میں وہ اچھا آدمی نہیں۔"

خلیفہ نے یہی سوال بغا شرابی سے کیا "تیرے خیال میں باعز کس قسم کا آدمی ہے؟"

بغا شرابی سے جواب دیا "حضور والا' باعز تو بہت برا آدمی ہے؟"

ان باتوں کی خبریں باعز تک پہنچ گئیں۔ باعز نے چند ترکوں کو اپنا مصاحب بنایا اور خلیفہ' وصیف اور بغا شرابی کے خلاف ایک سازش تیار کی کہ ان تینوں کو اسی طرح قتل کردیا جائے جس طرح خلیفہ متوکل کو قتل کیا گیا تھا۔

باعز کے دو ہمزاد نہایت خفیہ طور پر خلیفہ مستعین کے پاس گئے اور اس سازش سے اس کو مطلع کردیا۔

خلیفہ نے نہایت خاموشی سے وصیف اور بغا شرابی کو طلب کیا اور انہیں اس سازش کے بارے میں بتایا۔ دونوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ خلیفہ اور اس کے امرا اور خود خلیفہ اس سے بے خبر ہیں۔ خلیفہ نے کہا "کیا تم لوگ باعز کی اس سازش میں شریک نہیں ہو؟"

دونوں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے "امیرالمومنین! ہم ایسا کس طرح کرسکتے ہیں' ہم نے تو آپ کو مسندِ خلافت پر بٹھایا اور اب ہم ہی آپ کے خلاف بغاوت کریں ایسا کیونکر ممکن ہے؟"

خلیفہ نے کہا "تب پھر' تم دونوں باعز کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ اور اس کو سزا دو۔" ان دونوں نے باہر نکل کے ترکوں کو باعز کے بارے میں بتایا۔ یہ ترک باعز کے خلاف ہوگئے اور ان لوگوں نے باعز کی تلاش شروع کردی اور باعز کے مکان کو گھیر لیا اور جب باعز نہیں ملا تو لوٹ مار شروع کردی۔ جب یہ خبریں باعز تک پہنچیں تو وہ حقیقتِ حال سے بے خبر اپنے گھر واپس آیا اور مزاحمت شروع کردی لیکن یہ مزاحمت بے اثر ثابت ہوئی اور وصیف اور بغا شرابی نے اس کا محاصرہ کرلیا اور تھوڑی دیر بعد باعز کو گرفتار کرلیا۔

باعز ان سے پوچھ رہا تھا "بھائیو! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟" وصیف نے اپنی تلوار کا وار باعز کی گردن پر کیا' یہ تلوار دوسری طرف نکل گئی۔ گردن اس کے قدموں پر گری۔ دونوں نے سر کو اپنے قبضے میں لیا اور خلیفہ کی خدمت میں پیش کردیا۔

وصیف' بغا اور خلیفہ مستعین چپ چاپ بغداد روانہ ہوگئے۔ ترکوں کو خبر ہوئی تو ان کا پیچھا کیا اور بغا اور وصیف کے مکانات کو لُوٹ لیا۔ ان لوگوں نے معتز اور موید کو قید خانے سے باہر نکالا اور معتز کو مستعین کی جگہ خلیفہ بنادیا' اب بیک وقت دو خلیفہ تھے۔

بغداد میں مستعین کو معتز کے خلیفہ بنائے جانے کی خبر ملی تو اس نے بیرون بغداد امراء کو خطوط لکھے کہ معتز کے مقابلے میں اس کی مدد کی جائے۔ معتز نے بھی خطوط لکھے اور خود کو حقیقی خلیفہ ثابت کیا' لکھا "میں اس لیے حقیقی خلیفہ ہوں کہ مجھے منتصر نے اپنا ولی عہد اور جانشین قرار دیا تھا جبکہ مستعین باللہ کا نام کہیں دور دور تک نہیں ملتا اور یہ ساری شرارت وصیف اور بغا شرابی کررہے ہیں۔"

اب دونوں میں کشمکش جاری تھی' ترکوں کی اکثریت معتز کے ساتھ تھی اور یہ لوگ بغداد کے محاصرے کی تیاریاں کررہے تھے۔ وصیف اور بغا شرابی تنہا ہوتے جارہے تھے۔ قصرِ خلافت کے عملے نے بھی معتز کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

اب خلیفہ مستعین بالکل بے بس ہوچکا تھا اور اسے وصیف اور بغا شرابی پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس کو سرگوشی کرنے والوں نے بتایا کہ وصیف اور بغا شرابی اس تاک میں ہیں کہ موقع پاتے ہی خلیفہ کو قتل کردیں' چنانچہ خلیفہ نے ان دونوں کو تخلیئے میں طلب کیا اور ان سے پوچھا "میں تم دونوں کے بارے میں کچھ سن رہا ہوں' معلوم نہیں کہ اس میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ۔"

بغا شرابی نے کہا "امیرالمومنین! میں زیادہ باتیں تو کرتا نہیں اور جھوٹ بھی نہیں بولتا۔ امیرالمومنین مجھے یہ بتائیں کہ ہم دونوں کے بارے میں کیا سنا ہے؟"

بغداد میں وصیف اور بغا شرابی کے حامی ترک سردار بھی خلیفہ مستعین کی بغداد آمد کو پسند نہیں کررہے تھے۔ وصیف اور بغا شرابی بھی سمجھ چکے تھے' ان دونوں نے ترک سرداروں کو سمجھایا کہ خلیفہ کے ساتھ کوئی ایسا رویّہ نہ اختیار کیا جائے جس سے خلیفہ ناراض ہوجائے لیکن ترک سرداروں کو خلیفہ کا بغداد چلا آنا بالکل پسند نہیں تھا۔ ترکوں کے سرداروں میں بایک باک نامی سردار پیش پیش تھا۔ جب اس کا خلیفہ سے معاملہ ہوا تو ترک سردار نے پوچھا "امیرالمومنین! آپ یہاں کیوں چلے آئے؟"

خلیفہ نے جواب دیا "مجھے بغداد میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور تم لوگ یاد کرو کہ میں نے تمہیں کس کس طرح نوازا ہے' کیا تم میرے ان احسانات کو ضائع کردوگے؟" خلیفہ مستعین نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی ترک سرداروں کو گراں گزرا۔ محمد بن عبداللہ نامی ایک عرب سردار ان دونوں کی باتیں غور اور نفرت سے سن رہا تھا' اس نے بایک باک کو منع کیا کہ وہ خلیفہ سے اس طرح بات نہ کرے۔ مگر ترک سرداروں پر اس معمولی دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ترک سردار بایک باک نے خلیفہ مستعین سے کہا "آپ نے ہم پر جو احسانات کیے ہیں' ہم ان کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں مگر یہ بھی تو سوچیں کہ ہماری جاں نثاریاں بھی ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہیں۔"

خلیفہ نے کہا "بولو تم لوگ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

بایک باک نے جواب دیا "صرف یہ کہ امیرالمومنین جس طرح سامرہ سے بغداد تشریف لائے ہیں اسی طرح بغداد سے سامرہ تشریف

لے جائیں۔"

اس کے بعد بایک باک نے بیٹھے ہوئے خلیفہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "بس اٹھئے کھڑے ہو جایئے اور اسی وقت سامرہ روانہ ہو جایئے۔"

محمد بن عبداللہ آگے بڑھا اور ترک سردار بایک باک کے دونوں رخساروں پر دو طمانچے رسید کردیے اور کہا "امیرالمومنین کا ہاتھ چھوڑ دے' بڑا آیا اٹھئے چلئے کہنے والا! کیا خلیفہ سے اسی طرح بات کی جاتی ہے؟"

خلیفہ نے محمد بن عبداللہ کو سمجھایا "یہ عجمی لوگ ہیں ان کو نہیں معلوم کہ کس کو کس سے کس لب ولہجے میں بات کرنی چاہیے۔ میں نے بایک باک کو معاف کیا' تو بھی معاف کردے۔"

بات ختم ہوگئی مگر ترک سردار بایک باک نے ایک دوسرا ہی طریقہ اختیار کیا' وہ خلیفہ مستعین اور محمد بن عبداللہ کے خلاف تشہیر کرنے لگا' جب بھی کسی ترک سے ملا محمد بن عبداللہ کے طمانچے کا ذکر کردیا۔ اس طرح مستعین اور عربوں کے خلاف ترکوں میں نفرت پیدا ہوتی چلی گئی اور بغا اور وصیف بھی ان کی نفرتوں کا شکار ہوگئے۔ معتز کی قسمت ندوروں پر تھی نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستعین اور معتز میں معرکہ آرائیاں شروع ہوگئیں۔ چونکہ ترکوں کی اکثریت معتز کے ساتھ تھی اس لیے معتز کامیاب ہوتا چلا گیا۔ آخر کار معتز کی خواہش اور حکم پر مستعین نے خلافت سے دستبرداری اختیار کی اور معتز کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور انتقال کرگیا۔ اب معتز باقاعدہ خلیفہ کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ بغا شرابی اور وصیف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ اب معتز کا بھائی موید مال ودولت کمانے میں مشغول ہوگیا۔

بغا اور وصیف معتز کے حکم سے قید کیے جاچکے تھے۔ وصیف نے ایک عورت کے ذریعے موید سے رشوت کی رقم طے کی اور درخواست کی کہ وہ معتز سے سفارش کرکے اس کو رہا کرادے۔

معتز کو پہلے ہی موید کے بارے میں شکایتیں موصول ہوچکی تھیں کہ موید لوگوں سے رقم لے لے کر کام کروا رہا ہے۔ معتز نے بغا اور وصیف کو آزاد کردیا اور ان سے عہد لیا کہ دونوں اس کے وفادار رہیں گے اور ایک فرمان کے ذریعے اپنے بھائی موید کو قید خانے میں ڈلوادیا۔ موید کو جس قید خانے میں رکھا گیا تھا وہ ایک تنگ حجرہ تھا۔ اب معتز کو اپنے بھائی موید کے خطرے سے نجات مل گئی تھی۔ کئی دن بعد پہرے دار محمد بن راشد المغربی کے پاس ایک عورت آئی اور اسے بتایا کہ آج کل ترک کس قسم کی کوششیں کررہے ہیں۔

محمد بن راشد نے جواب دیا "میں موید کا پہرے دار ضرور ہوں مگر ہمارا سردار بغا کبیر کا بیٹا موسیٰ ہے جب تک موسیٰ کی مرضی شامل نہ ہو ترک موید کو آزاد نہیں کرا سکتے۔"

عورت نے کہا "میں یہ ساری تفصیلات نہیں جانتی' مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ تیرے گوش گزار کردیا۔"

محمد بن راشد' خلیفہ معتز کے پاس پہنچا اور عورت نے جو کچھ بتایا تھا اس کے گوش گزار کردیا۔

معتز نے بغا کبیر کے بیٹے موسیٰ کو طلب کیا اور اس سے پوچھا "کیا بات ہے لوگ بازاروں میں کس قسم کی باتیں میرے بھائی موید کے بارے میں کررہے ہیں؟"

موسیٰ نے پوچھا "امیرالمومنین! لوگ موید کے بارے میں کس قسم کی باتیں کررہے ہیں؟"

خلیفہ معتز نے جواب دیا "میرے بھائی موید کی رہائی کے بارے میں باتیں کررہے ہیں۔"

موسیٰ ہنسنے لگا اور جواب دیا "اس وقت ترک موید کے بارے میں اس لیے جذباتی ہیں کہ وہ پہلے ہی سے آپ کو اور آپ کے بھائی موید کو بہت چاہتے ہیں' اس لیے وہ موید کو رہا کراکے اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

معتز نے کہا "دو چار دن صبر کرو' اس کے بعد موید سے بازپرس ہوگی اور بے قصور نکلا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

کئی دن بعد معتز نے حکم دیا "موید کو حاضر کیا جائے۔"

بغا کبیر کا بیٹا موسیٰ تنگ وتاریک حجرہ نما قید خانے میں پہنچا تو موید کو یہ خوشخبری سنائی "آپ کے بھائی امیرالمومنین نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا' اس نے پھر آواز دی مگر پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے دور سے دیکھا' موید لیٹا ہوا تھا' وہ قریب گیا اور شانہ پکڑ کے ہلایا "آپ کو آپ کے بھائی امیرالمومنین یاد فرمارہے ہیں۔"

دوسری طرف سے جواب ندارد تھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا' موید کا انتقال ہوچکا ہے۔ موسیٰ نے خوب الٹ پلٹ کے دیکھا۔ چوٹ کا کوئی نشان بھی نہ تھا' وہ روتا ہوا خلیفہ معتز کے پاس پہنچا اور موید کی موت کی خبر سنادی۔ خلیفہ معتز نے اناللہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

موید کی موت کی خبر کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہر ایک کا شبہ معتز کی طرف جاتا تھا کیونکہ معتز ہی نے اس کو قید کردیا تھا۔

اس کا اثر دوسرے امراء پر بھی پڑا۔ وہ امراء جن کی معتز سے مخالفت چلی آرہی تھی۔ وصیف اور بغا شرابی کے کان کھڑے ہوئے' دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے لیکن بگڑے ہوئے حالات میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔

اب وصیف اور بغا شرابی کی چڑھی کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ دوسری طرف خلیفہ معتز بھی ان دونوں سے پریشان رہتا تھا۔

وہ لوگ جو وصیف اور بغا شرابی سے خوش نہیں تھے اور معتز ان لوگوں سے اچھی طرح واقف تھا انہیں مقصد براری کے لیے استعمال کیا گیا۔ خلیفہ معتز وصیف اور بغا شرابی سے مطمئن نہیں تھا اور اسے یقین تھا کہ اگر ان دونوں کو وقت دیا گیا اور موقع ملا تو وہ دوبارہ معتز

کے خلاف سازشیں شروع کردیں گے چنانچہ معتز نے ترکی فوج کے ان جوانوں کو استعمال کیا جو بغا شرابی اور وصیف سے خوش نہیں تھے۔ فوجیوں کو تنخواہیں دینا وصیف اور بغا شرابی کے ذمّے تھا۔ جب یہ دونوں فوج کے مخالف سپاہیوں کے پاس سے گزرے تو ان لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور اپنے کئی مطالبات ان کے سامنے پیش کیے۔ مطالبات میں زیادہ سخت مطالبہ یہ تھا کہ ان سب کو چار چار ماہ کی تنخواہ خلیفہ معتز کے برسراقتدار آنے کی خوشی میں دی جائے۔ وصیف اور بغا شرابی نے ان کا یہ مطالبہ نہیں مانا اور کہا "خزانے میں اتنی رقم نہیں ہے۔"

مطالبہ کرنے والے بلوائی ترک ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے' ان سب نے شور و غل شروع کردیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگے "ہم سب چار چار ماہ کی تنخواہ لے کے رہیں گے۔" بغا شرابی نے جب یہ دیکھا کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے تو اس نے وصیف سے کہا "تو یہیں ان کے درمیان کھڑا رہ' میں ابھی رقم کا بندوبست کرکے واپس آتا ہوں تو اُس وقت تک یہیں ان کے درمیان کھڑا رہ۔"

بغا شرابی چلا گیا۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے باوجود جب بغا شرابی واپس نہیں آیا تو ترکوں نے وصیف کی پٹائی شروع کردی اور یہاں تک پٹائی کی کہ وصیف کا انتقال ہوگیا۔ جب یہ خبر خلیفہ کو پہنچی تو وہ مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

یہی خبر جب بغا کو پہنچائی گئی تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ یہ سب کیوں اور کس کے ایما پر ہوا ہے۔"

اس کے بعد وہ چھپتا چھپاتا وصیف کے بیٹے صالح کے گھر پہنچا۔ دونوں گلے لگ کے خوب روئے اور بغا شرابی نے بھتیجے سے وعدہ کیا۔ "مجھے بھی قسم ہے جو میں چین سے بیٹھوں' میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جو شخص تیرے باپ کے قتل کا ذمے دار ہے اسے میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔" اس نے کئی دن منصوبہ بندی میں گزار دیے اور خفیہ طور پر کئی ہزار ترکوں کی خوفناک فوج تیار کرلی' ان سب سے عہد و پیمان لیے گئے کہ وہ بغا شرابی کی ہر بات بے چون و چرا مان لیں گے۔ اب وہ خلیفہ معتز کے پاس پہنچا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے معتز سے کہا "امیرالمومنین! میرے دوست اور بھائی وصیف کے قتل نے میرے وجود کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ وصیف کو کس نے اور کیوں قتل کیا یہ راز ہمیشہ نہیں رہے گا آخر کار کھل جائے گا اور میں اس شخص کو ٹھکانے لگادوں گا۔"

خلیفہ معتز نے کہا "وصیف کے قتل میں کئی سو ترکوں کا ہاتھ ہے تُو کس کس ترک سے بدلہ لے گا۔"

بغا نے خلیفہ کو ایک رائے دی "حضور والا۔ جب تک آپ سامرہ میں تشریف فرما ہیں اور میری ناقص رائے میں سامرہ آپ کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے۔ آپ بغداد چلیں' میں سفر کی تیاریاں کرتا ہوں۔" لیکن خلیفہ نے صاف انکار کردیا اور کہا "میں بغداد کو اس لیے ناپسند کرتا ہوں کہ بغداد میں میرے حامیوں کی تعداد بہت کم ہے اور سامرہ میں میرے حامی بہت زیادہ ہیں اسی لیے میں سامرہ کو پسند کرتا ہوں۔"

بغا شرابی کو خلیفہ کا جواب بالکل پسند نہ آیا اور وہ خلیفہ کی طرف سے فکرمند رہنے لگا۔ بغا شرابی نے اپنے حامیوں کی تعداد بڑھانا شروع کی اور یہ طے کیا کہ وہ خود اپنے حامیوں کے ساتھ بغداد بھاگ جانے کی کوشش کرے گا۔ خلیفہ معتز کو اب ہر وقت چوکس اور چوکنا رہنا پڑتا۔ وہ شاہی محل میں کسی مخصوص کمرے میں رہنے سے گریز کررہا تھا۔ وہ کبھی ایک کمرے میں رات بسر کرتا تو دوسری رات کسی اور کمرے میں ہوتا۔ وہ بغا شرابی کی سازشوں سے خوب واقف تھا۔ متوکل کے قتل میں بغا شرابی پیش پیش تھا۔ مشہور ترکی فوجی سردار بایک باک بھی خلیفہ معتز کا حامی تھا اور بغا شرابی سے یہ بھی خوف زدہ تھا۔ کچھ دنوں کے لیے خلیفہ معتز اپنے حامیوں کے ساتھ القرخ پہنچا۔ وہاں بایک باک بھی موجود تھا اور اس کے حامی بھی اس کے ساتھ تھے۔ بایک باک خلیفہ معتز سے ملا اور دونوں میں طے پایا کہ سامرہ کے شاہی محل میں واپس چلے جائیں۔

بغا کو ان کی حرکات و سکنات کا علم تھا۔ وہ بھی اپنے پانچ سو جاں نثاروں کے ساتھ نہایت ہوشیاری سے خلیفہ معتز کا پیچھا کررہا تھا اور اس تاک میں بھی تھا کہ موقع ملے تو بغداد فرار ہوجائے' خلیفہ معتز کے حکم پر دریا کے کنارے اور خشکی کے راستوں کی سخت نگرانی کی جارہی تھی۔ بغا شرابی نے کئی ہزار ترکوں کی موجودگی میں یہ منصوبہ تیار کیا کہ خلیفہ معتز جس کسی مذہبی تقریب میں حاضر ہو تو بغا شرابی کے حامی نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے اس کو اپنے حصار میں لے لیں اور پھر اس کو قتل کردیں لیکن بغا شرابی کی بدقسمتی کہ یہ خبر اسی کے کسی آدمی نے خلیفہ معتز تک پہنچادی اور تنبیہہ کی اور کسی مذہبی اجتماع یا تقریب میں شرکت سے منع کردیا۔

بغا شرابی نے اپنے حامیوں کو بھی اپنے دوسرے منصوبے سے لاعلم رکھا اور رات کی تاریکی میں گنے چُنے حامیوں کے ساتھ گھاٹ پر پہنچ گیا' وہاں جو سرکاری پہرے دار کھڑے کیے گئے تھے ان میں سے کسی نے بہ آواز بلند پوچھا "کون ہے جو دریا پار کرنا چاہتا ہے؟"

بغا شرابی کی طرف سے جواب ملا "ہم خلیفہ کے غلام بغا شرابی کے تعاقب میں دریا کے اس پار جارہے ہیں۔"

لیکن اب بغا شرابی کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ ذرا سی بھی غفلت اور بے احتیاطی اختیار کرنے پر گرفتار کرلیا جائے گا۔

گھاٹ کے سپاہیوں نے مشعل کی روشنی میں ان کی شناخت کرنا چاہی تو بغا شرابی ان کے آنے سے پہلے ہی فرار ہوگیا۔ اب اس کے سامنے وصیف کے بیٹے صالح کا گھر تھا' وہ بچتا بچاتا چھپتا چھپاتا صالح کے گھر پہنچا۔ صالح نے اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔

صالح نے کہا "میں آپ کی اس وقت تک حمایت اور حفاظت کروں گا جب تک خلیفہ معتز سے انتقام نہیں لے لیا جاتا۔" اب خلیفہ معتز کے خلاف جو کچھ بھی ہو رہا تھا' صالح کے گھر میں ہو رہا تھا۔

لیکن بغا کو اندازہ تھا کہ یہ کام بہت مشکل ہے اس لیے اس نے چوری چوری ایک کشتی کا انتظام کیا اور رات کی تاریکی میں اس کشتی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ اس کشتی میں ایک ملاح تھا اور دو اس کے معاون و مددگار۔ بغا شرابی نے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ نہ ہتھیار نہ دولت۔ جب یہ کشتی ایک پُل کے قریب پہنچی تو پل پر موجود پہرے داروں نے اسے روک لیا اور حکم دیا "تلاشی دو، تم کون ہو؟"

پہرے داروں میں سے کسی نے بغا شرابی کو پہچان لیا اور ایک نے ادب سے سلام کیا، پوچھا "قبلۂ محترم بغا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

بغا نے جواب دیا "پناہ کی تلاش میں، کیا تو میرا ہمدرد ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "ہاں، میں ولید مغربی ہوں اور آپ کا سچا خیر خواہ، آپ اس وقت چوری چوری کہاں جا رہے ہیں؟"

بغا شرابی نے جواب دیا "اگر تو میرا ہمدرد ہے تو مجھ کو جانے دے۔"

ولید مغربی نے کہا "آپ اپنی جان کو خواہ مخواہ ہلاکت میں نہ ڈالیں۔"

بغا شرابی نے پوچھا "پھر میں کہاں جاؤں؟"

ولید مغربی نے جواب دیا "آپ جہاں بھی جانا چاہیں گے میں پہنچا دوں گا، میرے پاس جاں نثاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔"

بغا شرابی نے کہا "تب پھر تو یا تو تُو مجھ کو میرے گھر پہنچا دے یا پھر امیر وصیف کے گھر۔"

ولید مغربی اس کو اپنی حفاظت میں لے کر ایک محل میں پہنچا اور بغا شرابی سے کہا "آپ کچھ دیر یہاں قیام کریں کیونکہ شہر کی سڑکوں پر سرکاری آدمی آپ کی تلاش میں گھوم پھر رہے ہیں۔"

بغا شرابی نے ولید مغربی کو لالچ دیا "اگر تُو نے مجھے صالح کے گھر پہنچا دیا تو میں تجھے مالا مال کر دوں گا۔"

ولید مغربی حالات کا جائزہ لینے چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ چند آدمی اور تھے۔

بغا شرابی نے دیکھا ان چند آدمیوں کے ساتھ ایک شخص چادر میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ بغا شرابی نے اس کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "یہ کون ہے؟"

ولید مغربی نے جواب دیا "یہ امیرالمومنین معتز ہیں جو تیری آمد کی خبر سن کر یہاں آ گئے ہیں۔"

اب ولید مغربی، معتز سے مخاطب ہوا "امیرالمومنین! یہ بغا شرابی ہے، آپ کو اس کی بڑی تلاش تھی۔"

بغا شرابی نے کہا "ولید مغربی تُو نے مجھ کو دھوکا دیا۔"

ولید مغربی نے جواب دیا "میں نے تجھ کو دھوکا دیا کہ مجھ پر تیرا کوئی احسان نہیں تھا اور تُو نے خلیفہ متوکل کو دھوکا دیا تھا۔ ذرا وہ وقت یاد کر کہ جس دربار نے تجھ کو یہاں تک پہنچایا تُو نے اس دربار کے خلاف سازشیں کیں۔"

بغا شرابی کو پہرے داروں کے حوالے کر دیا گیا اور خلیفہ معتز محل کے اندر چلا گیا۔ وہاں ولید مغربی کو دوبارہ طلب کیا اور کہا "تُو بغا شرابی کے خلاف کیا قدم اٹھائے گا؟"

ولید مغربی نے جواب دیا "میں تو امیرالمومنین کے حکم کا تابع ہوں جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کروں گا۔"

خلیفہ معتز نے حکم دیا "تب پھر سن، مجھ کو بغا شرابی کا سر درکار ہے۔"

اب ولید مغربی دوبارہ بغا شرابی کے پاس پہنچا اور پہرے داروں سے کہا "تم لوگ ذرا ایک طرف ہو جاؤ تو میں بغا شرابی سے چند باتیں کر لوں گا۔" وہ لوگ کنارے ہو گئے۔ ولید مغربی اندر داخل ہوا اور اچانک بغا کے چہرے اور سر پر شدید ضربیں لگائیں۔ جب وہ زخمی ہو کر منہ کے بل گرا تو ولید مغربی نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ جب بغا شرابی بالکل بے بس ہو گیا تو اس کا سر کاٹ کے ولید مغربی نے اپنی قبا کے دامن میں رکھ لیا اور خلیفہ معتز کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خلیفہ معتز نے اسے بطور انعام دس ہزار دینار دیے اور بغا شرابی کا سر سامرہ کے چوک میں نصب کر دیا۔ اس کے بعد سر کو بغداد بھیج دیا گیا جسے عبرت کے لیے شاہراہ عام پر نصب کر دیا گیا، بغا کے دھڑ پر ولید کے سپاہی ٹوٹ پڑے اور اسے جلا دیا۔ اب معتز خلیفہ تھا اور ترک اس کی حمایت کر رہے تھے۔

کسی نے معتز کو مشورہ دیا کہ نجومیوں کو بلوایا جائے اور ان سے معلوم کیا جائے کہ آپ کی مدتِ خلافت کتنی ہے؟

ایک شخص نے جواب دیا "اس معمولی کام کے لیے نجومیوں کو بلوانا بے کار ہے، یہ بات تو میں خود بتا سکتا ہوں۔"

معتز نے پوچھا "تو کیا بتا سکتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "جب تک ترک چاہیں گے، آپ خلیفہ رہیں گے اور جب وہ ناراض ہو جائیں گے تو کسی اور کو خلیفہ بنا دیں گے۔" یہ بات تو ہنسی میں اُڑا دی گئی اور معتز خلافت کے فرائض انجام دینے لگا۔

اگر معتز عقلمند اور تجربے کار ہوتا تو وصیف اور بغا شرابی کو قتل کرا دینے کے بعد ان کی نسلوں کو بھی صاف کرا دیتا مگر اس نے سانپ تو مروا دیے مگر سنپولیوں کو زندہ رکھا اور یہ سنپولیے چار سال تک معتز کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بُنتے رہے۔ وصیف کا بیٹا صالح ترکوں میں غیر معمولی سردار بن گیا۔ بغا شرابی کا بیٹا محمد بھی صاحبِ اثر امیر تھا۔ یہ دونوں معتز کو معزول کر دینے کی کوششوں میں مشغول تھے۔ معتز کے حامی عہدے دار لوٹ کھسوٹ میں مشغول تھے۔ آخر صالح نے وہی ترکیب معتز کے خلاف استعمال کی جو معتز نے چار سال

پہلے صالح کے باپ وصیف کے خلاف استعمال کی تھی، ترکوں نے کئی کئی ماہ کی تنخواہوں کا مطالبہ کردیا تھا۔ صالح ان کا سرغنہ تھا۔ معتز کے روبرو ترکوں کی تنخواہ کا مسئلہ رکھا گیا اس نے جواب میں کہلوایا کہ فی الحال ایسا نہیں ہو سکتا۔ صالح نے محل کا گھیراؤ کرلیا۔ ترکوں نے محل کے اندر جانے اور باہر نکلنے کے راستے بند کردیئے گویا اب محل پر صالح اور ترکوں کا قبضہ تھا۔ بغا شرابی کا بیٹا محمد بھی صالح کے ساتھ تھا۔

ان لوگوں نے چوبیس سالہ خلیفہ معتز کو پیغام بھیجا "آپ ترکوں کی تنخواہوں کے مسئلے پر ہم سے براہ راست بات کریں۔"

خلیفہ نے جواب میں کہلوایا "میں نے مسہل لیا ہے اور اب تک آٹھ نو اجابتیں ہو چکی ہیں اور میں اتنی کمزوری محسوس کر رہا ہوں کہ بات نہیں ہو سکے گی۔" صالح نے قصرِ خلافت کی حرمت کا خیال کیے بغیر اندر کا رخ کیا اور ترکوں کے ساتھ خلیفہ کے قریب پہنچ گیا۔

صالح کو ایک عجیب مرض لاحق تھا۔ وہ جب بھی جذباتی دباؤ کا شکار ہوتا تو غش کھا کے گر جاتا چنانچہ جب اس کو خلیفہ کے پاس جانے سے روکا گیا اور دروازے بند کردیے گئے تو غصے سے صالح کا بہت برا حال ہو گیا اور اس پر غشی طاری ہو گئی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور بمشکل اسے ہوش میں لے آئے۔

جب خلیفہ کو ان باتوں کی خبر کی گئی تو اس کو بھی رحم آگیا اور اس نے اپنے معتمد خاص کو حکم دیا "صرف صالح کو اندر لایا جائے۔"

معتمد نے صالح کو اندر بلا لیا اور دروازہ بند کردیا۔ خلیفہ نے صالح سے پوچھا "یہ ہنگامے آخر تو کیوں کروا رہا ہے؟"

صالح نے جواب دیا "ہنگامے میں نہیں کروا رہا ہوں بلکہ جن غریب سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں مل رہی ہیں وہ فاقے کر رہے ہیں اس لیے ان کی برہمی بجا ہے۔"

معتمد نے کہا "اے صالح! تُو نے امیرالمومنین کے خلاف ترکوں کی تنخواہوں کا بہانہ تلاش کیا ہے ورنہ کوئی اور عذر بھی تلاش کر سکتا تھا۔" صالح کے دل و دماغ پر پھر جذباتی دباؤ چڑھا اور وہ غش کھا کے زمین پر گر گیا۔ معتمد نے چھینٹے دیے اور بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔

یہ خبر کسی طرح ترکوں میں پہنچ گئی۔ وہ لوگ مشتعل ہو کر قصرِ خلافت کے دروازے اور کھڑکیاں توڑتے ہوئے اندر پہنچ گئے اور محمد بن بغا شرابی نے خلیفہ کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا، صالح بن وصیف نے طمانچے لگائے اور دوسری ٹانگ پکڑ کے گھسیٹا۔ خلیفہ کے منہ سے خون جاری ہو گیا اور اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ باہر ترک خلیفہ کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ عجیب تماشا دیکھا کہ صالح اور محمد بن بغا کسی شخص کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ان کی طرف لا رہے ہیں جب اس شخص کو ترکوں کے سامنے ڈالا گیا تو سپاہیوں نے اسے پہچان لیا کہ وہ ان کا خلیفہ معتز باللہ ہے۔

صالح نے خلیفہ کو ترکوں کے سامنے دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور کہا "امیرالمومنین! ترک اپنی تنخواہیں مانگ رہے ہیں، خزانے کھلوایئے اور تنخواہیں تقسیم کروایئے۔"

معتز نے جواب دیا "خزانے میں اتنی رقم نہیں ہے کہ سب کو تنخواہیں دی جائیں اس لیے ان کا یہ مطالبہ ابھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔"

کسی ترک نے معتز کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا اور کہا "مگر ہمیں ابھی تنخواہ درکار ہے۔"

خلیفہ نے جواب دیا "مگر ابھی تنخواہیں نہیں دی جا سکتیں۔"

ترکوں نے خلیفہ کو دھوپ میں فرش پر کھڑا کردیا۔ فرش گرمی سے تپ رہا تھا۔ خلیفہ کے لیے اس پر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ جب ایک پاؤں جلنے لگتا تو اسے اٹھا لیتا اور دوسرے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور جب بھی ایک پاؤں اٹھاتا تو کوئی ترک آگے بڑھ کے طمانچہ رسید کر دیتا، خلیفہ گال کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کرتا یہاں تک کہ خلیفہ کے دونوں رخسار سرخ ہو گئے اور کہیں کہیں سے خون رسنے لگا۔

آخر صالح اور بغا شرابی کے بیٹے محمد نے یہ فیصلہ کیا کہ خلیفہ کو قید کردیا جائے۔

صالح نے محل کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اسی عالم میں چند معماروں کو طلب کیا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ جہاں خلیفہ کھڑا ہے اس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کردی جائیں اور اوپری حصے کو مضبوط چھت ڈال کر بند کردیا جائے۔

خلیفہ کئی گھنٹوں کی کشمکش کے بعد نڈھال ہو کے گر گیا۔ اجابتوں نے پہلے ہی کمزور کردیا تھا۔ اب اس میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ معماروں کو دیواریں کھڑی کرنے سے روکتا۔ وہ بے سدھ نیم مدہوشی میں تپتے ہوئے فرش پر پڑا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کی جا رہی تھیں گویا اسے دیواروں میں چُن دیا گیا تھا۔ معمار اپنا کام ختم کرکے چلے گئے، ترکوں کا ایک دستہ وہیں موجود رہا اور قصرِ خلافت میں داخلے اور باہر نکلنے کے راستے بند کردیے گئے۔

دوسرے دن وصیف کا بیٹا صالح اور بغا شرابی کا بیٹا محمد دونوں اس جگہ پہنچے جہاں خلیفہ معتز کو زندہ دفن کردیا گیا تھا۔ دیواریں گرا کے معتز کو باہر نکالا گیا وہ مر چکا تھا۔ سامرہ کے امراء اور ترک سرداروں کے سامنے معتز کی لاش رکھ دی گئی اور یہ مشہور کیا گیا کہ خلیفہ کی موت طبعی واقع ہوئی ہے۔ لوگوں نے گواہیاں دیں اور معتز کو دفن کردیا گیا۔

اس کی جگہ محمد بن الواثق خلیفہ منتخب ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب معتز کو ستایا جا رہا تھا تو اس نے محمد بن الواثق کو بحیثیت خلیفہ قبول کرلیا تھا اور اس کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ اس کا لقب تھا مہتدی باللہ۔ یہ خلیفہ پچھلے کئی خلیفاؤں سے بہتر، عقلمند اور دبدبے والا

تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں علی بن محمد خارجی اپنی تحریک چلا رہا تھا۔ بغداد اور سامرہ سے اس کے روابط قائم تھے اس کو یہ جان کر بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ترک عباسی خلفا پر حاوی تھے۔ مسلمانوں کی مرکزی قوت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ ان کے آپس کے جھگڑے، سازشیں، ریشہ دوانیاں، انتشار اور خلفشار علی بن محمد کو ترغیب بغاوت اور تبلیغ کذب و افترا دے رہے تھے۔ وہ ہر عباسی خلیفہ کی موت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ اپنے پیچھے چلنے والے عقیدت مندوں کی ایک فوج تیار کر چکا تھا، یہ فوج ایک اندھی فوج تھی اور جس کا قول تھا کہ احکام کی تعمیل کرو یا اپنی جان دے دو۔ مہتدی باللہ کی معلومات غیر معمولی تھیں اس کے باوجود اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی اطراف و جوانب میں ہرکارے دوڑا دیے اور ہر عامل اور رئیس کو لکھ دیا کہ زنگیوں کے بارے میں جو کچھ انہیں معلوم ہو وہ بابِ خلافت کو لکھ بھیجیں۔ وہ مسلمانوں کی شکست کو اپنے لیے باعثِ شرم سمجھتا تھا۔ جب علی بن محمد کو یہ بتایا گیا کہ اب معتز کے بعد محمد بن الواثق مہتدی باللہ کو خلیفہ مقرر کیا گیا ہے تو اس کو ہنسی آگئی، کہنے لگا "دیکھیے ترک کب تک اس کی خلافت پر قائم رہتے ہیں۔ وہ مہتدی کو بھی کمزور اور نااہل سمجھ رہا تھا مگر مہتدی پچھلے تینوں خلفا سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے سب سے پہلے ترکوں کا انتظام کیا پھر وزرا اور رؤسا کو خود سے دور رکھا۔ اس نے نہایت سنجیدگی اور غور و فکر سے ان تمام مسائل پر توجہ دی جو خلافتِ عباسیہ کی ذلت اور تباہی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ مہتدی کو آدمیوں کی پہچان تھی۔ اس نے شری، مفسد اور موقع پرست ترکوں کو نظر میں رکھا اور جنہیں مخلص، ہمدرد اور دانا اور بینا سمجھتا تھا ان کو ذمے داریاں سونپ دیں۔

مہتدی نے اپنے مشیروں سے علی بن محمد کے بارے میں معلوماتی اطلاعات یکجا کیں۔ خارجیوں کے خلاف معلومات اکٹھا کیں اور ان کی بیخ کنی کے لیے منصوبے تیار کرنے لگا۔ دوسری طرف علی بن محمد خارجی نے اپنے مشیروں اور حملہ آوروں سے صلاح مشورے شروع کر دیے۔ ایک بات پر سبھی کو اتفاق تھا اس نے اپنے مخبروں سے تفصیلی حالات جو اب تک جمع کیے تھے ان کی روشنی میں عباسی خلیفہ میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ خارجیوں کے حملوں کی تاب لا سکتا۔ خلیفہ مہتدی نے حکم دیا تھا کہ علی بن محمد خارجی جہاں ہے اس کو وہاں سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ خلیفہ کا چار ہزاری لشکر علی بن محمد خارجی کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ المحمدیہ میں خارجیوں کو داخلے سے روکا جائے لیکن زنگی نہایت بلند حوصلہ رکھتے تھے۔ علی بن محمد نے اپنے فوجی سپہ سالار علی بن ابان کو حکم دیا کہ وہ المحمدیہ میں داخل ہو جائے۔ ابھی اس حکم پر عمل نہیں ہوا تھا کہ خلیفہ کی فوج زنگیوں پر حملہ آور ہو گئی۔ زنگی اپنے سردار علی بن ابان کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے اسی عالم میں ان پر حملہ ہوا تو وہ ہتھیار ہتھیار کہتے اور چیختے ہوئے اپنے اسلحہ خانوں کی طرف دوڑے۔ فتح نامی زنگی سردار نے اپنی بھاری بھرکم طشتری جو کسی قاب سے کم نہ تھی، ہاتھ میں لے لی اور میدانِ جنگ میں اتر گیا۔

ابوہلال ترکی مسلمانوں کا سپہ سالار تھا۔ فتح زنگی نے اپنی طشتری ابوہلال ترکی کے منہ پر کھینچ ماری۔ طشتری کی دھار نے ابوہلال ترک کو بدحواس کر دیا۔ معلوم نہیں اس پر اس حملے کا کیا اثر ہوا کہ وہ میدان چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس دوران زنگی بھی مسلمانوں پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ مسلمانوں نے اپنے سپہ سالار ابوہلال ترکی کو راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھا تو خود بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ زنگیوں نے ان کا پیچھا کیا اور جو بھی قابو میں آیا اس کا سر اتار لیا۔

اب المحمدیہ پر زنگیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یہاں علی بن محمد خارجی کا شاندار خیمہ نصب کیا گیا جس میں علی بن محمد خارجی منتقل ہو گیا۔

میدانِ جنگ میں جو مسلمان قتل کیے گئے تھے ان کے سر کاٹ کاٹ کے جمع کر لیے، جو گرفتار کیے گئے انہیں علی بن محمد خارجی کے سامنے پیش کیا گیا اور بعد میں انہیں بھی قتل کر دیا گیا اور ان کے سر کاٹ کے دوسرے سروں میں شامل کر دیا گیا۔ بعد میں ان سروں کو الگنی کی شکل میں رسّیاں باندھ کے میدان میں لٹکا دیا گیا۔

ایک دن قیام کے بعد وہ قادسیہ پہنچا۔ قادسیہ میں بھی مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور مقتولوں کے سر اتار کے آگے بڑھ گیا، اب وہ کرخ کی طرف جا رہا تھا۔ کرخ پہنچ کے مسجد میں قیام کیا، اپنے ایک ساتھی کو اذان دینے کا حکم دیا۔ اذان کی آواز سن کے لوگ نماز کے لیے جمع ہونے لگے۔ شہریوں نے یہاں یہ عجیب و غریب اور دہشت ناک منظر دیکھا کہ مسجد کے چاروں طرف انسانی سر لٹک رہے تھے۔

شہر والوں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص کو امیرالمومنین کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں، انہیں حیرت تھی کہ امیرالمومنین مہتدی یہاں کس طرح آ گئے اور یہ کیسے امیرالمومنین ہیں کہ ان کے چاروں طرف سیاہ فام لوگوں کا ہجوم ہے۔

علی بن محمد خارجی نے امامت کی۔ لوگوں نے اس کے پیچھے نماز ادا کی، اس کے بعد اس نے لوگوں کے سامنے اپنا دین پیش کیا لیکن یہ قید بھی لگا دی کہ وہ صرف کالوں پر مبعوث ہوا ہے اور انہی کو غیر کالوں کے ظلم و ستم سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ دوسرے شہر والوں کو حکم دیا کہ وہ اس کی دعوت کریں، ہزاروں آدمیوں کی دعوت۔ شہر والوں کے لیے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دعوت کی گئی اور زنگیوں نے خوب ڈٹ کے کھانا کھایا، کچھ کھایا کچھ گرایا۔ وہ طاقت کے نشے میں شرابیوں کے جیسی حرکتیں کر رہے تھے، شہری یہ منظر دیکھ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ یہاں کئی دن قیام کرنے کے بعد اس نے شہر والوں سے اپنے لیے ایک گھوڑا مانگا۔ شہریوں نے گھوڑا فراہم کر دیا۔ گھوڑا مشکی تھا، اس گھوڑے پر نہ تو زین تھی نہ لگام۔ رسّی باندھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور پر کھجور کی چھال رکھوا دی۔

اس لشکر نے یہاں سے کوچ کیا اور سفر کرتا ہوا العباسی العتیق نامی جگہ پر قیام کیا۔ آبادی کے لوگ کالوں کی اتنی بڑی فوج دیکھ کر آبادی چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

اس کے ساتھی پوری آبادی میں پھیل گئے۔ یہاں
جعفر بن سلیمان نامی امیر کا گھر سربازار تھا۔ علی بن محمد خارجی اسی مکان میں ٹھہرا۔
ن کے ہتے ایک شخص چڑھ گیا۔ اس شخص کو گرفتار کر کے علی بن محمد خارجی کے پاس لایا گیا۔
علی بن محمد نے اس سے پوچھا "یہاں مال و دولت والے کتنے لوگ ہیں اور وہ کہاں کہاں رہتے ہیں۔"
اس شخص نے جواب دیا "میں خود پردیسی ہوں اس لیے میں یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"
علی بن محمد خارجی نے ہنس کے کہا "تو یہ تو پردیسی نکلا' اب تم لوگ کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو یہاں کے ایک ایک شخص اور ایک ایک گھر سے واقف ہو اور اس شخص کو قتل کردو کہ یہ شخص پردیسی ہے اور ہمارے لیے بالکل بے کار ہے' ہم بیکار چیزیں رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔"

اس شخص نے جب یہ دیکھا کہ میری جان جارہی ہے تو چیختے ہوئے کہا "لوگو! میں بے کار شخص نہیں ہوں' میں یہاں کے ایک ایک امیر اور دولت مند کے گھر سے واقف ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہاں کتنے کاروباری ہیں' کتنے سپاہی ہیں' کتنے ہنرمند ہیں اور کتنے غلام ہیں؟ میں ان گھروں سے بھی واقف ہوں جہاں اسلحہ کے ذخائر موجود ہیں۔"

علی بن محمد خارجی ہنس کر کہنے لگا "یہ پردیسی تو بڑے کام کا آدمی نکلا' کہاں تو یہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور قتل کا نام سنتے ہی سب کچھ جان گیا۔"

اس شخص نے زنگیوں کے ساتھ جا کے مال و دولت والے گھروں کو دکھادیا اور زنگی تالے توڑ توڑ کر گھروں سے مال و دولت نکالنے لگے۔ اس کے بعد یہ سب کالے غلاموں کی جستجو کرنے لگے۔ جو بھی زنگی ملتا اس کو راضی کر کے اپنے ساتھ لے آتے اور سبزباغ دکھا کے علی بن محمد خارجی کی نبوت کا اقرار کراتے۔

اب علی بن محمد خارجی اور زنگیوں کا یہ حال تھا کہ جدھر سے بھی گزرتے مسلمانوں کا قتل عام کرتے اور ان کے سروں کو کاٹ کر اپنے ساتھ رکھتے اور جہاں قیام کرتے مسلمانوں کے سروں کی نمائش کرتے۔ یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ مدینے کے قریب یہودیوں کی مشہور بستی خیبر میں آباد یہودیوں نے یہ خبریں سنیں تو انہیں بڑی خوشی ہوئی اور آپس میں مشورے کیے کہ علی بن محمد خارجی سے کس طرح فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ آخر کار آپس میں یہ طے پایا کہ علی بن محمد خارجی کی مدد کی جائے اور اسے یہ یقین دلایا جائے کہ وہ حق پر ہے اور مسلمانوں کے خلاف وہ جو جنگیں لڑرہا ہے وہ ایک قسم کا جہاد ہے اور یہ کہ توریت میں علی بن محمد خارجی کی تشریف آوری کا ذکر موجود ہے۔

اس کام کے لیے ماندویہ نامی یہودی کا انتخاب عمل میں آیا۔ ماندویہ' یہودیوں میں بہت پڑھا لکھا' عالم فاضل شخص تھا۔ یہ خیبر سے چلا اور جہاں علی بن محمد خارجی زنگیوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا قریب ہی ماندویہ بھی ٹھہر گیا۔ اب اس کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ علی بن محمد خارجی کے بارے میں ملاقات سے پہلے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرے۔ اس کام کے لیے اس نے بالواسطہ طور پر زنگیوں سے کام لیا۔ اس نے دوسروں سے زنگیوں کو خفیہ طور پر یہ پیغام دیا کہ میں علی بن محمد خارجی کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں اس کے لیے مجھے معلومات درکار ہیں۔

جن سے یہ بات کی گئی تھی ان میں مال و زر تقسیم کیا گیا۔ لوگوں نے زنگیوں سے علی بن محمد خارجی کے بارے میں بڑی معلومات حاصل کرلیں' ان معلومات کو حافظے میں بٹھا کے ماندویہ علی بن محمد خارجی کے لشکر میں پہنچ گیا اور زنگیوں سے کہا "تم اپنے نبی سے کہو کہ خیبر سے ایک یہودی عالم آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے اور وہ آپ کی نبوت کے بارے میں چند عام باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

جب یہ خبر علی بن محمد خارجی کو پہنچائی گئی تو اس نے بڑے اشتیاق سے ماندویہ کو طلب کیا۔ دو زنگی ماندویہ کو لے کر علی بن محمد خارجی کے پاس پہنچے۔ ماندویہ کچھ دیر کھڑا حیرت اور اشتیاق سے علی بن محمد کو دیکھتا رہا اس کے بعد آگے بڑھا اور حاضرین کی پروا کیے بغیر علی بن محمد کے ہاتھوں کو نہایت عقیدت مندی سے بوسہ دیا۔

علی بن محمد نے پوچھا "اے شخص! تو کون ہے' میرے پاس کیوں آیا ہے' میرے ہاتھوں کو کیوں چوم رہا ہے؟"

ماندویہ نے جواب دیا "میں نے آپ میں کئی ایسی علامتیں دیکھی ہیں' جس سے آپ کی نبوت کی تصدیق ہوجاتی ہے اور میں اسی تصدیق کے لیے خیبر سے چل کر یہاں آیا ہوں۔"

علی بن محمد خارجی کو ماندویہ کی آمد سے بڑی تقویت حاصل ہوئی' اس کو ایسا لگا گویا اللہ نے اس کی مدد کے لیے ایک فرشتہ بھیج دیا ہے۔

کچھ دن پہلے علی بن محمد خارجی کو یہ بتایا گیا تھا کہ زنگیوں میں کچھ اختلاف پیدا ہورہا ہے اور وہ اپنے مالکوں سے خوف زدہ ہیں کہ جس دن بھی ان کے مالک فوجیں لے کر ان کے مقابلے پر آگئے اسی روز ان زنگیوں کا زوال شروع ہوجائے گا۔ اب ماندویہ کی آمد سے زنگیوں کے شبہات کو دور کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک زنگی کو حکم دیا "اپنی قوم میں جاؤ اور ان سے کہو کہ میری نبوت کی تصدیق کے لیے اللہ نے ایک عالم بھیج دیا ہے' میں چاہتا ہوں کہ اس عالم سے میرے بارے میں جو بات بھی ہو سب کے سامنے ہو' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے پیروکار وہاں پہنچ جائیں تاکہ میرے بارے میں وہ جو کچھ بتائے وہ سب کے سامنے بتائے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے سارے زنگی میدان میں جمع ہوگئے اور علی بن محمد خارجی سے درخواست کی گئی کہ وہ ماندویہ کے ساتھ اونچے ٹیلے پر چڑھ

جائے اور جو باتیں ہوں وہ بہ آوازِ بلند ہوں تاکہ پیروکار زنگی دونوں کی باتیں سن سکیں۔ علی بن محمد خارجی ماندویہ کے ساتھ بلند و بالا ٹیلے پر پہنچ گیا اور فوراً ہی ماندویہ سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آمد کی وجہ بتائے اور اس طرح وجہ بتائے کہ اسے سب سن بھی سکیں۔

جب تمام زنگی ٹیلے کے نیچے بیٹھ گئے تو ایک زنگی نے جو ٹیلے پر خارجی نبی کے ساتھ بیٹھا تھا اس نے کھڑے ہو کر بولنا شروع کردیا۔

"اے لوگو! جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم زنگیوں پر ہمارے غیر زنگی آقا کیسے ظلم ڈھا رہے تھے اور ہمیں انسانی حقوق سے محروم کرچکے تھے، ہماری مظلومیت پر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے ہم میں ایک نبی بھیج دیا، اس نبی نے ہمیں ہمارے ظالم آقاؤں سے نجات دلائی۔ ہم جو پہلے بے گھر تھے، ہمیں مکانات اور محلات کا مالک بنا دیا، ہم جو بھوکے رہتے تھے ہمیں آسودہ حال کیا اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے نواز دیا، ہم ننگے تھے، ہمیں بہترین لباس عطا کیے، ان آسائشوں کی بہم رسانی کے بعد بھی ہم میں ایسے کم زور ایمان والے شکی موجود ہیں جو اپنے پرانے آقاؤں سے خوف زدہ رہتے ہیں، شاید انہیں اپنے نبی کی نبوت پر شبہ ہے۔ اللہ نے جو انسانوں کی نیتوں سے واقف ہے اور چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے، اس نے ہم میں ایک شخص بھیج دیا ہے جو ہمارے نبی کی از روئے توریت تصدیق کرے گا۔ یہ عالم و فاضل شخص ہمیں یہ بتائے گا کہ ہمارے نبی کی توریت گواہی دے رہی ہے، یہ شخص جس کا نام ماندویہ ہے اور مدینے کی ایک بستی خیبر کا رہنے والا ہے، وہ خیبر جہاں یہودیوں کے عالم و فاضل خاندان رہتے ہیں اور احبار کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی۔ آج وہ لمبی مسافت طے کرکے ہمارے پاس صرف اس لیے آیا ہے کہ وہ ہمارے نبی کی تصدیق کرے۔"

اس کے بعد ماندویہ کھڑا ہوا اور زنگیوں سے کہا "تم لوگ خوش قسمت ہو کہ یہ نبی تم میں موجود ہے اور تم اس پر ایمان لائے، میں جو یہاں سے بہت دور خیبر میں تھا، جب میں نے نبی کا ذکر لوگوں سے سنا تو بہت حیران ہوا اور اس پر ایمان لانے کے لیے میں خیبر سے چل کے یہاں تک آیا۔"

اس کے بعد ماندویہ نے خارجی نبی کا ہاتھ چوما اور اس کے سامنے سجدے میں گر گیا، جب کچھ دیر بعد ماندویہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو علی بن محمد خارجی نے پوچھا "اے شخص! جبکہ تو خود میری نبوت کا اقرار کر رہا ہے تو مجھ کو سجدہ کیوں کر رہا ہے؟ سجدہ تو صرف اللہ کے لیے ہے، تو اس شرک کا مرتکب کیوں ہوا؟"

ماندویہ نے جواب دیا "میں نے یہ سجدہ آپ کو نہیں کیا تھا، میرا یہ سجدہ بطور شکرانہ دیدار ہے۔"

خارجی نبی نے پوچھا "توریت میں میرا ذکر کس طرح آیا ہے؟"

ماندویہ نے جواب دیا "جب اس وقت کے غالب دین والے کالوں پر ظلم ڈھائیں گے، انہیں رزق، مکان اور لباس سے محروم کردیں گے اور اس بات کو تقریباً ڈھائی صدیاں گزر جائیں گی تو ان میں ایک نبی ایک ناجی پیدا ہوگا، یہ ناجی جس کے نام کا پہلا حرف ع ہوگا اور یہ خود بھی کالا ہوگا۔ جب یہ نبی پیدا ہو جائے اور اس میں یہ ساری علامتیں موجود ہوں تو اس عہد کے لوگوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بغیر شک و شبہ اس پر ایمان لے آئیں۔"

خارجی جھوٹے نبی نے پوچھا "میرے بارے میں اور کیا علامتیں بیان ہوئی ہیں؟"

ماندویہ نے جواب دیا "یہ کہ وہ مسلمانوں سے جہاد کرے گا اور مسلسل فتوحات حاصل کرے گا۔ وہ شاعر بھی ہوگا اور اسی شاعری کی وجہ سے اس کو اوّل اوّل پہچانا جائے گا۔"

علی بن محمد خارجی بے حد خوش تھا اور زنگی جوش و خروش میں نعرے لگا رہے تھے۔

کسی زنگی نے ماندویہ سے پوچھا "جسمانی علامتیں توریت میں کیا بیان ہوئی ہیں؟"

ماندویہ نے جواب دیا "اول نشانی یہ کہ زنگیوں کا نبی بھی سیاہ فام ہوگا، دوسری نشانی یہ کہ اس کی پشت پر ریڑھ کی ہڈی کے درمیان مسّا ہوگا۔" اسی وقت خارجی جھوٹے نبی کی پشت سے لباس ہٹایا گیا تو وہاں مسّا موجود تھا، ایک بار پھر نعرۂ تحسین اور مبارک باد بلند ہوا۔

ماندویہ نے دوسری جسمانی علامت بیان کی "نبی کی داہنی پنڈلی پر مثلث کی شکل میں تین تل ہوں گے اور بائیں پنڈلی پر ابھرا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا جیسے یہ گوشت اوپر سے پنڈلی پر چپکا دیا گیا ہو۔

دونوں پنڈلیاں عریاں کی گئیں اور دونوں پر مذکورہ نشانیاں موجود تھیں۔

ماندویہ نے مزید نشانی بیان کی "نبی کی انگلیاں پانچ کے بجائے چھ چھ ہوں گی، داہنے ہاتھ میں چار انگلیاں دو انگوٹھے اور بائیں ہاتھ میں ایک انگوٹھا تین بڑی انگلیاں اور دو چھنگلیاں۔"

دونوں ہاتھ لوگوں کے سامنے کردیے گئے اور دیکھنے والوں نے خوش دلی سے نعرے لگانے شروع کردیے۔

ماندویہ نے آخری علامت یہ بتائی کہ نبی کی داہنی آنکھ ہلکی سی آسمانی رنگ کی ہوگی اور بائیں آنکھ تقریباً بلی جیسی۔

یہ دونوں علامتیں بھی صریحاً موجود تھیں۔ اب زنگیوں نے خوشی میں رقص کرنا شروع کردیا۔

اب علی بن محمد خارجی زنگیوں کی نظر میں سچا نبی تھا جو زنگیوں کے لیے مبعوث ہوا تھا۔

ماندویہ کے اعزاز میں دعوتیں ہوئیں اور بڑے جشن منائے گئے۔ جھوٹے نبی علی بن محمد خارجی کا دماغ چوتھے آسمان پر پہنچ گیا تھا، اس

نے زنگیوں کو بتایا کہ رات میرے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ایک فرشتہ آیا تھا' اس نے مجھ سے کہا کہ اب مسلمانوں کا زمانہ ختم ہوا اور تیرا دَور شروع ہو رہا ہے اور تو اپنے دشمنوں پر حاوی آئے گا۔

علی بن محمد خارجی کا راستہ روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے حاکم اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے جھوٹے نبی نے اپنے ساتھیوں کو شراب نوشی سے منع کیا تھا مگر جب سے اس کی شان میں گواہیاں ملی تھیں اور توریت نے اسے سچا نبی قرار دے دیا تھا تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو گئی تھی' وہ کہتا تھا کہ زمین و آسمان سات دن میں بنائے گئے ہیں اس لیے اس کے ساتھی بھی سات ہوں گے چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کی گنتی ...کی تو اس کے ساتھی چھ نکلے' اس سے پوچھا گیا "یہ تو صرف چھ ہیں یہ ساتواں کہاں چلا گیا؟"

علی بن محمد نے جواب دیا "ساتواں محمد بن مسلم ہے جو اس وقت بھی ہماری حفاظت میں پہرے داری کر رہا ہے۔"

اس رات زنگیوں نے نبیذ پینے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی۔ اس رات بڑا ہنگامہ رہا اور زنگی نبیذ کے مٹکے کے مٹکے چڑھا گئے اور اِدھر اُدھر گرتے پڑتے ہنگاموں میں مشغول تھے۔ اس رات انہیں اجازت تھی کہ خوب پئیں اور رنگ رلیاں منائیں چنانچہ اس پر حرف بہ حرف عمل ہوا اور وہ رنگ رلیاں منا کر آرام کرنے چلے گئے۔

رات کے پچھلے پہر علی بن محمد خارجی نے صبح ہوتے ہوتے زنگیوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ فجر سے پہلے میرے پاس اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ آیا تھا اس نے مجھے بتایا ہے "اب ساری فتوحات میں حاصل کروں گا۔ فرشتے نے مجھے بتایا کہ اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مسلمان میرے ہاتھوں خوار ہوں گے۔"

وہ ہر روز زنگیوں سے اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا اور اِدھر اُدھر زنگیوں کو لوٹ مار کے لیے بھیج رہا تھا' کہیں سے ہتھیار منگواتا' کہیں سے مویشی' کہیں سے مال و دولت۔ اب زنگیوں کو آسودگی میسر آگئی تھی' وہ گاؤں گاؤں' قصبہ قصبہ خون خرابہ کرتا ہوا بام داد نامی نہر تک پہنچا۔ کچھ دیر قیام کیا' کٹے ہوئے سروں کی نمائش کی آبادی کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے' اس نے چند آدمیوں کو پکڑ لیا اور انہیں حکم دیا۔ "آبادیوں میں جاؤ اور مال دار لوگوں سے کہو کہ تم نے اب تک جو کچھ جمع کیا ہے اسے میرے پاس لے آؤ۔ سب نہیں تو آدھا' آدھا نہیں تو چوتھائی۔ جو صاحبِ ثروت مال دینے سے انکار کرے اسے میرے پاس لے آؤ۔

سامنے کئی قطاروں میں انسانی سر لٹک رہے تھے' ان سروں کی دہشت نے بڑا کام کیا۔

یہاں سے آگے ایک جنگل تھا۔ علی بن محمد خارجی اپنے چند ساتھیوں کو لے کر اُس جنگل میں داخل ہو گیا۔ قرب و جوار کے لوگ چھپ چھپ کر اُس کی حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کو ایک ٹیلہ نظر آیا' اس نے ایک مقامی شخص سے پوچھا "یہ جو سامنے ٹیلہ نظر آرہا ہے اس کا کیا نام ہے؟"

مقامی شخص نے جواب دیا "آپ اگر اس پر قیام کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس پر قیام کریں اور اس کے بعد سوال جواب کریں۔"

علی بن محمد خارجی نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا "ٹیلے پر خیمے لگوائے جائیں' میں یہاں قیام کروں گا۔"

آناً فاناً خیمے نصب کر دیے گئے اور علی بن محمد خارجی نے یہاں قیام کیا اور حکم دیا "اس مقامی شخص کو میرے سامنے پیش کیا جائے' جس نے مجھ کو اس جگہ کا نام نہیں بتایا تھا۔"

وہ شخص اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے علی بن محمد خارجی کے سامنے پہنچا اور کہا "میں اس ٹیلے کا صحیح نام بتا دوں مگر مجھ کو یہ یقین ہے کہ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے اور مجھے قتل کرا دیں گے۔"

علی بن محمد نے یقین دلایا "میں تجھ کو اتنی معمولی بات پر قتل نہیں کروں گا تو اطمینان رکھ۔"

مقامی شخص نے جواب دیا "اس ٹیلے کا نام ہے جبل الشیاطین۔ اس ٹیلے پر کوئی شریف اور معقول انسان قیام نہیں کرتا ہمیشہ کوئی ایسا ہی انسان یہاں ٹھہرتا ہے جس کا تعلق ذریاتِ شیاطین سے ہوتا ہے۔"

علی بن محمد خارجی کو اس شخص کی بات بری تو بہت لگی مگر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا اور کہا "اس کو جانے دیا جائے کیونکہ میں نے اس کو امان دی تھی لیکن اے شخص تو نے جس خباثت کا اظہار کیا ہے وہ تیری جان لینے کے لیے کافی تھا۔"

مقامی شخص گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا لیکن زنگیوں پر برا اثر ڈال گیا' اسے مقامی شخص بھری محفل میں شیطان کہہ کر چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اِدھر اُدھر تاخت اور تاراج کرنے کا حکم دیا ایک یار اس کو یہ بتایا گیا کہ اگر وہ نبی ہے تو نبی کو امت درکار ہوتی ہے اور یہ خون خرابہ کسی بھی نبی کو زیب نہیں دیتا۔

علی بن محمد خارجی نے جواب دیا "تعمیر سے پہلے تخریب بہت ضروری ہے جس طرح ایک کسان بیج ڈالنے سے پہلے زمین کا سینہ چیر کے اسے برباد کر دیتا ہے اسی طرح میں انسانوں کو قتل کر کے دہشت پھیلاتا ہوں اس کے پیچھے میرا تخریبی جذبہ نہیں کارفرما ہوتا ہے بلکہ یہ جذبہ پیشِ نظر ہوتا ہے کہ انسانوں کو صحیح راستے پر لانا ہے۔"

اس جگہ علی بن محمد خارجی نے شبل نامی ایک شخص کو بحیثیت مخبر کھڑا کیا اور حکم دیا کہ وہ جو غیر معمولی بات دیکھے یا محسوس کرے اس

کی اطلاع علی بن محمد خارجی کو ضرور دے۔

یہاں رمیس نامی حاکم متعین تھا اور بہادری میں بڑی شہرت رکھتا تھا، زنگی بھی اس سے اچھی طرح واقف تھے اور علی بن محمد بھی رمیس کی ہوشیاری اور چالاکی کو خوب سمجھتا تھا۔ یہاں رمیس نے شبل کے ذریعے علی بن محمد خارجی کو یہ پیغام بھیجا کہ تونے زنگیوں کو دم دلاسا دے کے یکجا کرلیا ہے اور اس سے تیرا جو مقصد ہے مجھے معلوم ہوچکا ہے، اگر تو ہمیں چند ہفتوں کی مہلت دے تو ہم تیرے قدموں میں قارون کا خزانہ لاکے ڈھیر کردیں گے، اس کے بعد مجھے امید ہے کہ تو زنگیوں کا پیچھا چھوڑ دے گا اور ان کو ان کے مالکوں کے حوالے کیا جاسکے گا، میں تیرے جواب کا انتظار کررہا ہوں۔

رمیس کی یہ پیش کش جب پڑھی جارہی تھی تو وہاں چند زنگی بھی موجود تھے، ان لوگوں نے بھی یہ باتیں سنیں اور اس سے انہیں بڑی تکلیف پہنچی۔ علی بن محمد خارجی کو اس خط نے غضب ناک کردیا اور اس نے قسم کھائی کہ میں رمیس کو تباہ و برباد کردوں گا اور جب میں اس پر یا اس کے بیوی بچوں پر قابو پالوں گا تو سب کے سامنے ان کے پیٹ چاک کروں گا اور رمیس کو یہ بتاؤں گا کہ میں دھوکا دینے والوں کے لیے کتنا خطرناک انسان ہوں۔

رمیس نے جس سازش سے علی بن محمد کو نقصان پہنچانا چاہا تھا وہ بتا بر پہنچ چکا تھا اور زنگیوں میں نااتفاقی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے کہ ہم لوگ اچھے بے وقوف بنے، اگر علی بن محمد خارجی کا یہی ارادہ تھا تو ہم سب کو اتنا اندھیرے میں کیوں رکھا؟ زنگی ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے "ہو بھی تو بہت دنوں بعد انکشاف ہوا کہ ہم سب برائے فروخت ہیں، ہمارا نبی ہم سب کو ہمارے آقاؤں کے حوالے کرکے دولت کا ذخیرہ اکٹھا کرلے گا اس طرح ہم تو کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔"

انہوں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ وہ فرار ہوکے کہیں روپوش ہوجانا چاہتے تھے کیوں کہ ان سب کو یہ یقین تھا کہ اگر انہیں ان کے آقاؤں کے حوالے کردیا گیا اور اگر ان کی اجتماعی قوت ختم کردی گئی تو وہ کہیں کے بھی نہ رہ جائیں گے، آقا ان کو قتل کردیں گے اور ان کی نسل کو بدترین غلامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

علی بن محمد خارجی کو خبر کی گئی کہ زنگیوں میں بددلی پھیل گئی ہے اور اب وہ اس کا ساتھ نہیں دیں گے کیونکہ انہیں یقین ہوگیا ہے کہ اسے دولت کی ضرورت تھی تو اس قسم کا کھیل شروع کردیا۔

علی بن محمد خارجی نے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کو کھسکتے دیکھا تو بہت گھبرایا اور یہ حکم دیا "کسی زنگی کو بھی جانے نہ دیا جائے، رمیس نے جو دغا فریب کا خط اس کو لکھا ہے میں اس کا سخت ظالمانہ جواب دوں گا۔"

زنگی دس دس پانچ پانچ ٹکڑیوں میں بیٹھے آپس میں صلح مشورے کررہے تھے اسی عالم میں اس نے حکم دے دیا "سب ایک جگہ جمع ہوجائیں، میں ان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ لوگ جمع ہوگئے۔ علی بن محمد خارجی نے ان سے نہایت خوشامدانہ لہجے میں گفتگو شروع کردی اور اپنی دھواں دار تقریر میں کہا "اگر تمہیں یہ شبہ ہے کہ میں تم سب کو یکجا رکھنے میں اپنا کوئی مقصد رکھتا ہوں اور تمہارے ذریعے قارون کا خزانہ حاصل کرنا چاہتا ہوں تو یہ غلط ہے، میں تم کو تمہارے مالکوں کے حوالے کبھی بھی نہیں کروں گا، میں نبی ہوں جو تم پر مبعوث کیا گیا ہوں اور نبی حریص یا لالچی نہیں ہوتا۔ مجھ کو مال و زر کی کوئی پروا نہیں، تم خود کو مطمئن رکھنے کے لیے یہ کرسکتے ہو کہ مجھے ہمیشہ اپنے درمیان رکھو۔ درمیان سے میری مراد یہ ہے کہ مجھے اپنے بیچ میں اس طرح رکھو جس طرح کوئی قیدی رکھا جاسکتا ہے اور جب بھی تمہیں یہ واضح ثبوت مل جائے کہ میں لالچی ہوں اور تم سب کو دولت کمانے کا ذریعہ بنایا ہے تو مجھے اسی وقت قتل کردو اور یہ سمجھو کہ میں جہنم واصل ہوا۔"

اس کی تقریر جاری تھی کہ زنگیوں نے رونا شروع کردیا، انہیں شرمندگی تھی کہ انہوں نے اپنے نبی کی شان میں گستاخیاں کی تھیں، ان کے دلوں میں درد ہونے لگا اور ان سب نے عہد کیا کہ جس شخص نے ان کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا کرائی ہیں وہ اس کو نیست و نابود کردیں گے۔ علی بن محمد نے پوچھا "کیا تم اب بھی مجھ پر شبہ رکھتے ہو؟"

ہجوم نے جواب دیا "نہیں، بالکل نہیں۔"

علی بن محمد خارجی نے کہا "تو تم سب مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ تم آئندہ بے وقوف نہیں بنوگے اور اپنے نبی کی ذات کو شک و شبے سے بالاتر رکھوگے۔"

کسی نے علی بن محمد خارجی کو مطلع کیا کہ زنگیوں کا دلبرداشتہ گروہ ہم سب سے الگ ہوکے نبیذ پینے میں مشغول ہے گویا وہ اس طرح اپنا غم دور کررہا ہے، اس سلسلے میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

علی بن محمد خارجی نے حکم دیا "انہیں اسی حالت میں میرے پاس لے آؤ تاکہ میں انہیں بتاؤں کہ شراب حرام تھی اور حرام رہے گی۔ نبیذ بھی شراب ہے، میں علمائے عراق کی طرح اس کو حلال نہیں قرار دے سکتا۔"

چند زنگی گئے اور نبیذ کے نشے میں مست لوگوں کو علی بن محمد کے پاس لے آئے۔ وہ سب سر جھکا کے بیٹھ گئے۔

علی بن محمد نے درشت لہجے میں حکم دیا "تم سب میری طرف دیکھو، اپنے سروں کو اونچا رکھو کیوں کہ میں تمہیں سر اٹھا کے چلنا سکھاؤں

گا۔ تم نے جو کچھ کیا اس پر شرمندہ مت ہو کیونکہ تمہیں آج سے پہلے نبیذ پینے سے منع نہیں کیا گیا تھا‘ میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ تم اس وقت بھی اس بچے کی طرح پاک وصاف ہو جس نے ابھی ابھی دنیا میں قدم رکھا ہو اور آنکھیں کھولی ہوں‘ تم سب معصوم ہو فرشتوں کی طرح جن سے ابھی گناہ سرزد نہیں ہوا‘ اس لیے کہ میں نے تمہیں نبیذ پینے سے روکا نہیں تھا‘ تم کو یہ بتایا نہیں تھا کہ نبیذ تم پر حرام کی گئی ہے۔“ نشے میں ڈوبے ہوئے زنگی سر اٹھا کے اپنے نبی کو دیکھ رہے تھے۔ علی بن محمد اٹھا اور انہیں باری باری سینے سے لگانے لگا‘ وہ ہر کسی کے کان میں ایک ہی بات کہہ رہا تھا ”میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے‘ میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے۔“

علی بن محمد کی اس حکمتِ عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ رونے لگے اور جو غلط فہمیاں پیدا کروائی گئی تھیں وہ دور ہو گئیں‘ اب وہ پہلے سے زیادہ خوف ناک اور خطرناک ہو چکے تھے اور رمیس کے بارے میں ان کے احساسات اور جذبات منتقمانہ تھے‘ وہ آپس میں کہہ رہے تھے کہ جب بھی وہ رمیس پر قابو پائیں گے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے‘ ان میں اکثر ایسے تھے جو رمیس کو اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتے تھے‘ وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھ رہے تھے۔

وہ رات انہوں نے بڑے سکون سے گزاری۔ صبح ہوئی تو ایک حبشی فاقویہ‘ علی بن محمد خارجی کے خیمے میں داخل ہوا۔ یہ اس کا بہت معتمد تھا۔ خارجی جھوٹے نبی نے پوچھا ”کیا خبر لایا ہے؟“

فاقویہ حبشی نے جواب دیا ”رمیس کے ساتھی دجیل کے مشرقی کنارے پر موجود ہیں اور کنارے کنارے حرکت کررہے ہیں۔“

خارجی جھوٹے نبی نے اسی وقت اپنے مشہور سپہ سالار علی بن ابان کو بلوایا اور حکم دیا ”تو اسی وقت فاقویہ کی بتائی ہوئی سمت میں چلا جا‘ اپنے ساتھ زنگیوں کی فوج لے جا اور رمیس کا مقابلہ کر۔“

علی بن ابان نے اصطرلاب طلب کیا۔ آفتاب کا اندازہ کیا‘ وقت پر نظر کی اور سعد اور نحس ساعتوں کا اندازہ لگایا اور رمیس کے تعاقب میں چل پڑا۔ کچھ دیر بعد علی بن ابان بردالخیال نامی پل پر پہنچ گیا۔ دریا کی مشرقی سمت پہنچا تو وہاں زنگیوں کی بڑی تعداد کو منتظر پایا‘ ان لوگوں نے ذرا فاصلے پر رمیس کی فوج کو کشتیوں پر سوار دیکھا‘ رمیس کے سپاہی زنگیوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر چکے تھے۔ علی بن ابان نے بھی تیراندازی کا حکم دیا اور خود بھی رمیس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت گردوغبار کا طوفان نمودار ہوا‘ ہوا کی رفتار اتنی طوفانی تھی کہ کشتی پر سوار مسلمان علی بن ابان کو نقصان پہنچانے سے قاصر رہے۔ اب رمیس کے سپاہی زنگیوں سے جنگ کرنے کے بجائے طوفان کا مقابلہ کررہے تھے۔ کشتیاں‘ ہوا کے تھپیڑوں سے اٹھ اٹھ کر کنارے پہنچ گئیں۔ زنگیوں نے جب ان کشتیوں کو اپنے قریب دیکھا تو دوڑ دوڑ کر ان پر سوار ہو گئے اور مار کاٹ شروع کردی۔ اب رمیس کے لیے فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

لوگوں نے رمیس کو مشورہ دیا ”جناب‘ اب جتنی جلد ممکن ہو نکل جاؤ اور اپنی جان بچاؤ۔“

رمیس نے بھی یہی مناسب سمجھا‘ اس نے اپنی کشتیوں کو اس طرح پانی کی سطح پر رہنے دیا جیسے اس میں سوار موجود ہوں۔ رمیس اور اس کے ساتھی عقیل اور ابن ابی عون بے تحاشا اس طرح بھاگ رہے تھے کہ دائیں بائیں اور پیچھے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کررہے تھے۔

اب مسلسل جنگیں ہورہی تھیں اور چند کامیابیوں نے زنگیوں کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ علی بن ابان اور محمد بن مسلم خارجی جھوٹے نبی کے کامیاب سپہ سالار تھے۔ یہ دونوں جہاں بھی روانہ کیے جاتے کامیاب اور سرخرو واپس آتے۔ ایک سپہ سالار ریحان بھی تھا۔ زنگیوں کو اپنے نبی سے ایک شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جن لوگوں کو فوجی عہدے اور مراتب دے رہا تھا اس سے بہت سے زنگیوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی اور جب گندمی رنگ والے ریحان کو ملازمت دی گئی تو بہت سے زنگیوں کو اس پر اعتراض ہوا‘ وہ اپنے نبی سے ملے اور اس کی خوشامد میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک زنگی نے پوچھا ”ہم لوگ کئی دن سے یہ محسوس کررہے ہیں کہ آپ نے ہم زنگیوں پر بھی گندمی رنگ والوں کو فوقیت دی۔ اب جبکہ ریحان کو ہمارا سردار بنادیا ہے ہم خود کو کمتر سمجھنے لگے ہیں۔“

دوسرے زنگی نے کہا ”اے ہمارے نبی! آج آپ واضح طور پر ہمیں یہ بتائیں گے کہ آپ کو کن لوگوں پر نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ کالوں پر گوروں یا گندمی رنگ والوں پر؟“

خارجی جھوٹے نبی نے جواب دیا ”میں زنگیوں پر بحیثیت نبی مبعوث ہوا ہوں‘ لیکن نبی کسی خاص طبقے اور قوم پر مبعوث نہیں ہوتا۔“

ایک حبشی نے کہا ”لیکن جناب! آپ تو ہمیشہ ہم زنگیوں کی تائید اور حمایت کرتے رہے ہیں‘ اب جبکہ ہم ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑتے چلے آرہے ہیں‘ آپ نے گندمی رنگ والے ریحان کو سپہ سالار بنادیا ہے۔ اس سے ہم زنگیوں میں بڑی بے چینی ہے اور جنگوں میں جوش و خروش بھی کم ہوتا جارہا ہے۔“

جھوٹے خارجی نبی نے زنگیوں کو سمجھایا ”تم لوگ اگر رنگ و نسل کی بات کرو گے تو پریشان ہو جاؤ گے اور دنیا بھر سے کٹ کے بازاروں میں خاک اڑاتے پھرو گے۔“ جب یہ زنگی باتیں کرکے باہر نکلے اور اپنے اپنے خیموں کی طرف جانے لگے تو راستے میں ریحان بھی مل گیا‘ زنگیوں نے ریحان کو روکا اور اس سے باتیں کرنے لگے‘ ان باتوں میں بھی تلخی پائی جاتی تھی۔ ریحان بھی یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہیں۔

جب زنگیوں نے ریحان سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا لینے آیا ہے ۔ تو ریحان کی طرف سے جواب ملا ”یہ سوال مجھ سے نہیں اپنے نبی

سے کرو' وہ نبی جو میرا بھی نبی ہے' ہم سب کا نبی ہے' میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

زنگیوں نے غصے میں کہا "ہم ان گندم گوں لوگوں کو اپنی جماعت میں نہیں دیکھ سکتے' یہ لوگ سازشی ہوتے ہیں۔"

جب ریحان جھوٹے نبی کے خیمے کے قریب پہنچا تو کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ ریحان بچ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا "کون ہے؟" لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا اور جیسے ہی اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ پھر آگے بڑھا تو دوسرا زناٹے دار پتھر آکر اس کی داہنی پنڈلی پر لگا اور وہ لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا۔ اس نے کھڑے ہو کر ایک بار پھر سوال کیا "کون ہو بھئی' مجھے کیوں مار رہے ہو؟" اس بار بھی مارنے والا نظر نہ آیا' وہ پیچھے مڑ کے جائزہ لے رہا تھا کہ پتھر کدھر سے آسکتا ہے کہ تیسرا پتھر بھی آیا اور ران زخمی کر گیا۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا اور جھوٹے نبی کے خیمے کے سامنے رک گیا۔ غلام سے اندر اطلاع کروائی اور اجازت ملتے ہی خیمے میں داخل ہو گیا۔

اس کے سامنے خیمے کے آخری سرے پر خارجی نبی علی بن محمد چند زنگیوں سے باتوں میں مشغول تھا' سامنے ریحان کو دیکھا' فوراً اپنے قریب بلایا' وہ جھوٹے نبی کے لیے کچھ قیمتی پتھر بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ ریحان کی ران زخمی تھی اور پنڈلی سے خون جاری تھا اور اس کا زیریں لباس خون میں لت پت ہو رہا تھا۔

علی بن محمد نے پوچھا "یہ تجھ کو کیا ہو گیا' تجھ کو کس نے زخمی کردیا؟"

ریحان نے جواب دیا "یا نبی! یہ تو آپ ہی بتائیں گے کہ مجھ کو کس نے زخمی کردیا' ویسے میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ زنگی مجھ سے خوش نہیں ہیں۔" جھوٹے نبی کے پاس جو زنگی بیٹھے تھے' وہ ریحان کی اس بات سے چراغ پا ہو گئے۔

ایک نے کہا "تو ہم زنگیوں پر الزام لگا رہا ہے کیونکہ ہمیں اللہ نے جو عزت دی ہے گوری اور گندمی رنگ والے ہم سے حسد کرنے لگے ہیں۔"

ریحان نے کہا "ہمیں حسد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' حسد تو تم لوگ کرتے ہو اور برتر کمتر کے احساس میں مبتلا رہتے ہو۔"

جھوٹے نبی نے دونوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور ریحان کو سمجھایا "جو بات کرنی ہے نرمی اور سمجھداری سے کرو اور مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ ایسا کیونکر ہوا۔"

ریحان نے کہا "ابھی جب میں آپ کے پاس آرہا تھا تو مجھ سے چند زنگیوں نے الٹے سیدھے سوال جواب کئے' ان باتوں میں میرے خلاف تلخیاں موجود تھیں' اس کے بعد جب میں ادھر آنے لگا تو کسی طرف سے پتھر آئے اور میں زخمی ہو گیا۔"

علی بن محمد خارجی نے غصے میں کہا "کسی سیاہ فام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ گندمی رنگت والے اپنے بھائی کو حسد سے زخمی کردے۔"

وہاں جو زنگی موجود تھے انہیں اپنے نبی کی یہ بات بہت بری لگی' انہوں نے نفرت سے ریحان کی طرف دیکھا اور ایک نے کہا "اگر ہم میں سے کسی نے اس گندمی رنگت بھائی سے کوئی ایسی ویسی بات کہی بھی ہے تو اس کو صبر کرنا چاہیے کیونکہ ہم برسوں سے اس کی جس بدسلوکی کا شکار ہیں اس کا اظہار کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح ہوتا رہے گا۔ یہ باتیں فوراً تو جانے سے رہیں اس کے لیے وقت درکار ہو گا۔"

جھوٹے نبی نے زنگیوں کو حکم دیا "تم لوگ اپنے بھائیوں میں جاؤ اور معلوم کرو کہ اس غریب پر کس نے پتھر برسائے ہیں' اس کو میرے سامنے لاؤ' میں اس کو سزا دوں گا تاکہ آئندہ اس قسم کی زیادتیاں نہ ہوں۔"

زنگی نکلے گئے اور ریحان جھوٹے نبی سے باتیں کرنے لگا۔

جھوٹے نبی نے ریحان کو سمجھایا "تجھ کو بھی ذرا تحمل سے کام لینا چاہیے کیونکہ ہماری طرح تو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ صدیوں کے محروم لوگ مایوسی کے مریض رہ چکے ہیں' ان کو ذرا سی بات بہت بری لگ جاتی ہے۔ جب تک یہ اپنے آپ پر قابو پائیں دوسروں کا بہت کچھ بگاڑ چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ہماری رعایتوں اور مروتوں کے مستحق ہیں۔"

خارجی جھوٹا نبی اس کو تسلیاں دیتا رہا اور ریحان سنتا رہا' آخر میں جھوٹے نبی نے ریحان کو سمجھایا "دیکھ ریحان! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے زنگیوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کتنی محنت کی ہے' اب میں ان لوگوں کو بھی زنگیوں کے زمرے میں لینا چاہتا ہوں جو زنگیوں ہی کی طرح زمانے کے ستائے ہوئے ہیں اور ہمیں جو نظام رائج کرنا ہے اس کے لیے صرف زنگی ہونا کافی نہیں ہے۔ ہمارے ماحول' ہمارے معاشرے' ہمارے شہر اور ہمارے علاقے میں صرف زنگی ہی نہیں رہتے' یہاں جو بھی رہتا ہے وہ ہمارا اپنا ہے اور میں رنگ اور نسل کی پروا کیے بغیر ہر غم زدہ اور ستائے ہوئے انسانوں کی مدد کرنے آیا ہوں' انہیں دکھوں سے نجات دلانے آیا ہوں۔"

ریحان اس کی باتوں سے متاثر تھا مگر زنگی ان باتوں سے ناخوش ہوئے' وہ علی بن محمد خارجی کو صرف اپنی حد تک رکھنا چاہتے تھے اور اس میں حصے داری کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ جب ریحان اندر مصروفِ گفتگو تھا تو باہر زنگی اظہارِ ناراضگی کر رہے تھے۔ وہاں بھی آپس میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ وہ جو علی بن محمد خارجی کے حامی تھے اور اس کی ہر بات کو بصدقِ دل ماننے ہی میں اپنی دنیا اور آخرت کی نجات سمجھتے تھے اور دوسرے وہ تھے جو علی بن محمد کو نبی تو مانتے تھے مگر اس میں حصے داری کو ناپسند کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یہ نبی

صرف سیاہ فاموں کے لیے کام کرے، ان کے اس نبی کی ہر بات ہر سانس صرف زنگیوں کے لیے ہو۔ وہ اندر نبی کے پاس گندمی رنگ والے ریحان کی موجودگی کو حسد اور تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، وہ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ جو بھی غیر زنگی وہاں آئے اسے یا تو مار دیا جائے یا دہشت زدہ کرکے بھگا دیا جائے لیکن ان کے ان خیالوں کی مذمت اور برائی وہ لوگ کر رہے تھے جو اپنے اس جھوٹے نبی پر دل سے ایمان لے آئے تھے۔

پندرہ بیس زنگی چھپ کر اس تاک میں بیٹھ گئے کہ جیسے ہی ریحان باہر نکلے گا اس کا کام تمام کردیا جائے۔ جو مخلص اور نیک زنگی اپنے شری اور بدمعاش زنگیوں کے ارادے سے مطلع ہو چکے تھے وہ اپنے شری بھائیوں کی مخالفت کر رہے تھے اور وہ بھی چھپ کر بیٹھ گئے کہ جب ریحان پر یہ شری حملہ آور ہوں گے تو ان کی طرف سے ریحان کا بچاؤ کیا جائے گا، ان میں کا ایک شخص اندر اپنے جھوٹے نبی کے پاس پہنچ گیا اور باہر جو کچھ ہونے والا تھا اس سے اپنے نبی کو مطلع اور ریحان کو خبردار کیا۔

علی بن محمد خارجی نے ریحان کو اشارے سے حکم دیا "تو ہمارے خیمے کے عقبی حصے سے نکل جا، جانے سے پہلے اپنا لباس بدل دے اور اپنے چہرے پر ہلکی ہلکی سیاہی مل لے تاکہ باہر تجھ کو پہچانا نہ جا سکے۔"

ریحان واپسی سے پہلے اپنے جھوٹے نبی کے مشوروں پر جب عمل کر رہا تھا تو اس کے دل میں لمحہ بھر کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ جس کالک کے لگانے کا مشورہ اس کے نبی نے دیا تھا وہ کوئی معمولی مشورہ نہ تھا، یہ کالک جو چند لمحوں کے لیے چہرے پر ملی گئی تھی وہ جھوٹے نبی پر ایمان لانے کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل و دماغ پر لگ چکی تھی۔ وہ پچھلے دروازے سے کھسک گیا اور اس کو جاتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ریحان نے اپنے جھوٹے نبی کے اتباع اور مدد کے لیے نہایت زور و شور سے کام شروع کردیا، یہ کام دیہاتوں اور شہروں میں یکساں ہو رہا تھا۔

اسی دوران زنگیوں کو ایک مقابلہ پیش آگیا، یہ مقابلہ المطلی نامی جگہ پر پیش آیا۔ اب جھوٹے نبی کی طرف سے زنگی بھی لڑ رہے تھے اور گندمی رنگ والے بھی لیکن ان دونوں میں اتحاد نہیں تھا۔ علی بن محمد خارجی نے زنگیوں کو متحد کرکے جو کامیابی حاصل کی تھی وہ گندمی رنگ والوں کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ اس کے مقابلے پر مسلمان تھے، جہاں نسلی رنگ، قبیلوں اور علاقوں کا فرق اور امتیاز کا کوئی اثر نہ تھا۔ جب مسلمان اور زنگی آپس میں برسرپیکار ہوئے تو دونوں ہی ایک دوسرے کو شکست سے ہمکنار کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اس جنگ کو اس لیے بھی بڑی اہمیت حاصل ہو گئی کہ اس میں ان کا جھوٹا نبی بھی بہ نفس نفیس شامل تھا۔ اس نے زرہ بکتر پہن رکھی تھی، سر پر خود، چہرے پر کڑیاں، بازوؤں پر جوشن، ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھال۔ زنگیوں میں جوش کی فراوانی تھی، ان کا خیال تھا کہ جس جنگ میں وہ شریک ہوتا تھا، وہ یادگار اور قطعی جیت کی حامل ہوتی تھی۔ آج بھی وہی صورت حال تھی اس پر فتح اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا جذبہ طاری تھا۔ یہ جذبہ ریحان اور اس کے گندمی رنگ والے ساتھیوں پر بھی طاری تھا اور وہ زنگیوں پر سبقت لے جانا چاہتے تھے اور زنگی ان پر سبقت لے جانے کی فکر میں تھے، ایسا لگتا تھا کہ دونوں آپس ہی میں لڑ مریں گے۔

علی بن محمد خارجی دونوں کے عزائم بھانپ چکا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ دونوں گروہوں میں کسی قسم کا تصادم نہ ہو لیکن وہ کب تک اس صورت حال کو قائم رکھتا۔ میمنے اور میسرے پر زنگی اور قلب میں علی بن محمد کے ساتھ ریحان اور اس کے ساتھی تھے اور وہ ہر حال میں اس جنگ کو جیتنا چاہتے تھے۔

اچانک میمنے اور میسرے پر دباؤ بڑھا اور جنگی حکمت عملی کے پیش نظر دونوں نے پیچھے ہٹنا شروع کردیا اور اس طرح قلب مسلمانوں کی زد میں آگیا اور مخالف سمت سے مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ علی بن محمد خارجی کو گرفتار کرکے دم لیں گے۔

علی بن محمد بھی ان کے عزائم بھانپ چکا تھا اور اس نے مقابلے کے ساتھ ساتھ اپنی پناہ کی تدبیریں بھی کر رکھی تھیں چنانچہ جیسے ہی جنگ نے شدت اختیار کی، علی بن محمد نے بھی پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ ریحان نے جب یہ دیکھا کہ علی بن محمد کے پیچھے ہٹنے سے فوج میں بددلی پیدا ہوتی جا رہی ہے تو وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا "جناب والا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

علی بن محمد نے جواب دیا "ابھی ابھی دوران جنگ مجھے بتایا گیا ہے کہ آخری وقت میں جب ہم سب ہار رہے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی مدد آجائے گی اور ہم سرخرو اور کامیاب رہیں گے چنانچہ میں اس لیے پیچھے ہٹ رہا ہوں کہ فرشتوں کے لیے یہ جگہ خالی ہو جائے اور ہماری جگہ فرشتے لے لیں۔ اب میمنے اور میسرے کا یہ کام ہے کہ وہ جی جان سے مقابلہ کریں اور جب مسلمان قلب میں آجائیں تو میں اپنے قلب سے فرشتوں سمیت مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاؤں اور تم سب کامیابی حاصل کرلو۔"

اب جنگ فیصلہ کن لمحات میں داخل ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

مضمون کے مآخذ

تاریخ طبری	تاریخ ابن خلدون	تاریخ الخلفاء	تاریخ اسلام	آئمہ تلبیس
ابو جعفر جریر الطبری	علامہ ابن خلدون	علامہ جلال الدین سیوطی	شاہ معین الدین ندوی	ابوالقاسم رفیق دلاوری

فخرِ دین و دنیا

ضیا تسنیم بلگرامی

فخر ہمیشہ ایسی صلاحیتوں پر ہوتا ہے جو کسی کو ہزاروں انسانوں میں بھی نمایاں مقام پر لا کھڑا کریں... لیکن فخر میں بھی اس بات کا احساس لازم رکھنا چاہیے کہ اس سے وابستہ ہونے والے لوگ خود پر فخر کریں... ورنہ انسان اپنی ذات پر آپ ہی فخر کرے تو تکبر کہلاتا ہے۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ انسانوں میں ہوتا تھا جن سے وابستگی ہونے پر عام انسانوں کو خوشی ہوتی تھی۔



مشہور صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی بغداد میں روحانی تعلیم و تربیت کے معاملے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت میں دور دور سے طالبانِ حق آ کر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ آپ ان میں سے جوہرِ قابل کو الگ کر لیتے اور بقیہ کو نصیحتیں کر کے واپس کر دیتے۔ جنھیں الگ کرتے انھیں روحانی اور باطنی تعلیم دینے لگتے۔

سہ پہر کو عصر سے ذرا پہلے ایک سترہ سالہ نوجوان آپ سے ملاقات کو حاضر ہوا اور پیشِ خدمت مرید سے کہا۔ ”جاؤ

اپنے شیخ سے کہو آپ کا بھانجا ہمدان سے آیا ہے۔ شیخ فخرالدین۔''

مرید نے نوجوان کو اندر پہنچا دیا۔ ماموں نے کھڑے ہو کر نوجوان بھانجے کا استقبال کیا۔ انہوں نے اس کو گلے لگا کر اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ شیخ نے بھانجے سے گھر کے حالات پوچھے۔ بہن کی خیریت معلوم کی۔ بھانجا شیخ کے سوالات کے مختصر جوابات دیتا رہا۔ شیخ کو اس نوجوان میں کچھ غیر معمولی باتیں محسوس ہو رہی تھیں۔

شیخ نے پوچھا۔ ''فخرالدین تم نے کچھ پڑھا بھی ہے؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے قرآن پاک کم سنی میں ہی حفظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد ہمدان ہی میں منقولات اور معقولات پڑھ کر فارغ ہوا۔ اب آپ کی خدمت میں روحانی تعلیم و تربیت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

شیخ شہاب الدین نے دورانِ گفتگو اپنے بھانجے میں کئی خاص باتیں محسوس کیں، نوجوان بھانجے کی آواز میں ترنم تھا اور آنکھوں سے جذب و مستی ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ آپ نے بھانجے سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری آواز میں لحن پایا جاتا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میری خوش گلوئی ہمدان بھر میں مشہور ہے۔''

شیخ نے مزید کہا۔ ''تمہارا دل گداز اور آنکھوں میں کیف و مستی ہے۔'' نوجوان خاموش رہا۔

آپ نے ایک مرید کو آواز دی اور کہا۔ ''ذرا اپنی اس بچی کو تو لانا جس کا حسن اور معصومیت مشہور ہے۔''

مرید چلا گیا لیکن نوجوان فخرالدین کی حالت غیر ہونے لگی اور اچانک اٹھ کر باہر جانے لگا۔ شیخ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا۔ ''فخرالدین! کہاں چلے؟ میں تو تیرے گداختہ دل اور حسن پرستی کا امتحان لے رہا ہوں۔ شاید میں نے تیری بابت درست ہی خیال کیا ہے۔''

فخرالدین نے پوچھا۔ ''آپ نے میری بابت کیا خیال کیا ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ حسن پرستی تیری فطرت میں شامل ہے۔ حسن کہیں بھی اور کسی بھی شکل میں ہو تو دیکھ کر وارفتہ اور حواس باختہ ہو جائے گا۔''

فخرالدین نے سرد آہ بھری۔ ''قبلہ ماموں! کیا عرض کروں؟''

اتنی دیر میں مرید اپنی بچی کو لے کر آگیا۔ بچی کی مست و خمار آلود آنکھوں پر بڑی بڑی پلکیں، اعضا میں بلا کا تناسب اور رنگ سرخ و سفید، میدہ شہابی، غرضیکہ بچی کی ایک ایک چیز ایسی تھی کہ دیکھنے والا والہ و شیدا ہو جائے۔ فخرالدین نے اس ننھے سے میخانے کو جو دیکھا تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھے اور ایک لمبی آہ کھینچ کر نیم مدہوش ہو گئے۔

شیخ نے مرید سے کہا۔ ''اب اس بچی کو لے جاؤ، میں نے دیکھ لیا۔''

مرید بچی کو واپس لے گیا۔ آپ فخرالدین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فرمایا۔ ''فخرالدین! ہوش میں آؤ کیونکہ اتنی جذباتیت ٹھیک نہیں ہے۔''

فخرالدین ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں تھے پھر بھی باکمال ماموں کے حکم پر کسی حد تک ہوش و حواس میں آگئے۔ شیخ شہاب الدین نے ایک بار پھر آواز دی۔ ''فخرالدین! کیا پوری طرح ہوش میں آگئے ہو تم؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''ماموں! میں اپنے ہوش میں تھا کب نہیں لیکن اب میں بالکل ہوش میں ہوں۔''

شہاب الدین نے فرمایا۔ ''بھانجے! میں نے محسوس کیا ہے کہ تجھ میں کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور تجھ کو تیری یہ خوبیاں بڑی بلندیوں پر لے جائیں گی۔'' فخرالدین خاموش رہے۔

آپ نے پوچھا۔ ''فخرالدین! کیا تو شاعری بھی کرلیتا ہے؟''

''ہاں جناب! میں شاعری بھی کرلیتا ہوں۔''

شہاب الدین نے فرمایا۔ ''میں تیری باتوں ہی سے سمجھ چکا ہوں کہ تو شاعر بھی ہے لیکن میں تجھ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ شاعری مفید طلب چیزوں کی بابت کرنا، ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی سے محفوظ رہنا۔'' پھر پوچھا۔ ''اور تیرا تخلص کیا ہے؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''ابھی تک میں نے کوئی تخلص بھی نہیں رکھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو اس وقت سرزمین عراق میں ہے اور اب تجھ کو زیادہ تر اسی سرزمین میں رہنا ہے اس لیے میں نے تیرا تخلص عراقی تجویز کیا ہے۔ آج سے تو عراقی ہے۔ فخرالدین عراقی۔''

فخر الدین نے اس شخص کو شکریے اور عقیدت کے ساتھ قبول کرلیا اور اب وہ فخر الدین عراقی ہو چکے تھے۔ شہاب الدین سہروردی نے انہیں بیعت کیا اور عبادت و ریاضت میں مصروف کر دیا۔ برسوں کے بعد ان کی حالت ہی کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔ ایک دن ماموں نے پوچھا۔ ''فخر الدین! کیا تجھے گھر نہیں یاد آتا؟''

فخر الدین نے جواب دیا۔ ''جب سے میں نے اس سے لو لگائی ہے، ماسوا کو بھلا دیا ہے۔''

شہاب الدین نے حکم دیا۔ ''اچھا تم ہمدان واپس جاؤ اور وہاں تدریس کا کام اختیار کرو۔''

فخر الدین نے اپنے پیر و مرشد ماموں کے حکم کی تعمیل میں بغداد سے ہمدان کا سفر کیا۔ یہاں عزیز رشتے دار ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کامیاب واپسی پر مبارک بادیں دیں۔ عراقی نے ہمدان میں تعلیم دینا شروع کر دی اور ساتھ ہی شاعری بھی کرتے رہے۔ ہمدان میں درس و تدریس کے دوران بھی آپ پر اکثر کسی حسین شے کے دیکھنے سے وجدان اور غشی سی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ حسن کسی بھی شے میں ہوتا۔ شعر میں، شکل میں، مناظر فطرت میں، اچھے اشعار عراقی پر وجد طاری کر دیتے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہتے۔

ایک دن عراقی بڑے جوش و خروش سے پڑھا رہے تھے کہ مدرسے کے سامنے قلندروں کی ایک جماعت نے قیام کیا قلندروں نے عراقی کو پڑھاتے دیکھا تو خوب ہنسے۔ ایک قلندر نے پوچھا۔ ''عراقی کیا ہو رہا ہے؟''

عراقی نے جواب دیا۔ ''علم تقسیم کر رہا ہوں۔''

قلندر نے طنزاً کہا۔ ''عراقی تو کن کاموں میں الجھ گیا۔ تو نے خود کو پہچانا نہیں، پھر رب کو کس طرح پہچانے گا؟''

عراقی نے پوچھا۔ ''میں خود کو کس طرح پہچانوں؟''

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ''عراقی میں تیرے اندر سوئے ہوئے عراقی کو بیدار کرتا ہوں، سن۔'' اس کے بعد قلندر نے چند دل گداز اشعار پڑھے۔

''میں مسجد کا سامانِ خرابات لیے جاتا ہوں
اور زہد و کرامات کے صفحے پر خط کھینچتا ہوں
میں تو پیرِ مغاں کے کوچے میں عاشقوں کی صف میں بیٹھ گیا
اور رندانِ خرابات کے ہاتھوں سے شراب کا جام کھینچنے لگا
ہم زہد و مکافات سے بار بار گزر رہے ہیں
کیونکہ یہ بار بار گزرنے کی طاقت بھی ہمیں زہد و مکافات سے حاصل ہوتی ہے۔''

ان اشعار نے عراقی کو از خود رفتہ کر دیا۔ انہوں نے درس گاہ چھوڑ دی اور حالت وارفتگی میں قلندروں میں چلے گئے، بولے۔ ''دوستو! تم نے کیا کر دیا؟ میں اپنے دل میں ایک آگ سی محسوس کر رہا ہوں۔''

ایک انتہائی حسین قلندر آگے بڑھا اور کہا۔ ''عراقی! ادھر دیکھو۔''

عراقی نے ادھر دیکھا تو ہوش و حواس بالکل ہی جاتے رہے بے اختیار کہا۔

وہ چہ خوش باشد کہ دل دارم تو باشی...... ندیم و مونس و یارم تو باشی

(کیا ہی اچھا ہو کہ تو میری دلداری قبول کرے...... اور تو میری دوستی مونسی اور یاری قبول کرنے لگے)

حسین قلندر نے جواب دیا۔ ''عراقی! ہم تجھے مسجد و مدرسے سے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ تو یہاں سے ہمارے ساتھ چل اور سیاحت کر۔''

عراقی نے مدرسے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا قلندروں کے ساتھ ہو لیے اور سیاحت شروع کر دی۔ یہ ایک بار پھر بغداد گئے اور اپنے ماموں شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات کی۔ ماموں نے حکم دیا۔ ''عراقی! ہندوستان جاؤ۔''

عراقی نے قلندروں سے کہا۔ ''شیخ نے ہندوستان جانے کا حکم دیا ہے۔''

قلندروں نے جواب دیا۔ ''چلو، ہندوستان چلیں، ہمیں وہاں جانے سے کب انکار ہے۔''

اس کے بعد عراقی نے قلندروں کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا۔ مہینوں بعد یہ لوگ ہندوستان میں داخل ہو گئے اور پہلے برصغیر کے مشہور شہر ملتان میں قیام کیا۔ ان دنوں ملتان میں بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا طوطی بول رہا تھا۔ عراقی

قلندروں کے ساتھ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں پہنچے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی کشش محسوس کی۔

عراقی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''شیخ شناسا نظر آتے ہیں۔''

زکریا ملتانی نے پوچھا۔ ''میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''میں شیخ شہاب الدین سہروردی کا بھانجا ہوں۔''

پیر ملتانی نے فرمایا۔ ''اور میں ان کا مرید اور ادنیٰ خادم ہوں اور انہی کا بھیجا ہوا یہاں آیا ہوں۔'' دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔

قلندروں نے جو یہ منظر دیکھا تو تنہائی میں کہا۔ ''عراقی! ہمارا خیال ہے کہ اب تم سیاحت نہیں کرو گے؟''

عراقی نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

حسین قلندر نے جواب دیا۔ ''ملتان شیخ تمہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور یہ تمہیں روک لے گا۔''

عراقی نے کہا۔ ''بے شک، میں خود بھی ملتانی پیر میں زبردست کشش محسوس کررہا ہوں۔ میں یہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھاتا ہوں تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے دونوں پاؤں زمین سے پیوست ہوگئے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ انہیں اٹھاؤں اور تمہارا ساتھ دوں مگر زمین پاؤں پکڑے ہوئے ہے۔''

قلندر نے کہا۔ ''تو تم یہیں رہ جاؤ۔ ہم اپنی راہ لیں۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''نہیں! میں اپنی کوشش کروں گا کہ تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں لیکن میں ملتان میں بے بس اور مجبور ہورہا ہوں۔''

قلندروں نے کہا۔ ''عراقی! تمہیں جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کرلو۔ ہم ملتان میں زیادہ دن نہیں رک سکتے۔''

عراقی نے بہاء الدین زکریا سے اجازت چاہی۔ ''حضرت! اب اجازت دیجیے۔ میں دنیا کی سیاحت کو نکلا ہوں اور سیاحت جاری رکھنا چاہتا ہوں۔''

زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! میں نے تمہیں روکا تو نہیں ہے۔ تم جاسکتے ہو۔ جاؤ لیکن تمہیں ایک نہ ایک دن یہاں آنا پڑے گا۔''

عراقی نے کہا۔ ''حضرت! ملتان نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ میرے ساتھی قلندر مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں سخت کشاکش میں ہوں، بولیے اب میں کیا کروں؟''

زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ''عراقی! تم جاسکتے ہو لیکن میں نے تم سے جو کہہ دیا کہ تم کو یہاں واپس آنا ہے۔''

عراقی نے کہا۔ ''اگر آپ بلانا چاہیں گے اور بلائیں گے تو میں آجاؤں گا۔''

قلندر جلدی کررہے تھے۔ ''عراقی! یا تو ساتھ چلو ورنہ ساتھ چھوڑ دو! ہم چلتے ہیں۔''

عراقی نے محسوس کیا۔ ان کے پاؤں چھوڑ دیے گئے ہیں اور وہ آزاد ہیں۔ اب قلندروں کا رخ دہلی کا تھا۔ عراقی بھی ان کے ساتھ دہلی روانہ ہوگئے۔ دہلی میں چند دن رہ کر سومنات کا رخ کیا۔ اب قلندروں نے یہ بات صریح طور پر محسوس کرلی تھی کہ عراقی میں وہ پہلے جیسا جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ لیکن دل کی گداز یت میں زیادہ شدت آچکی تھی۔ عراقی قدم قدم پر یہی محسوس کرتے رہے کہ ملتان انہیں کھینچ رہا ہے۔

ابھی سومنات فاصلے پر تھا کہ مشرق سے اندھیرے کی چادر اٹھی اور ان کی طرف بڑھنے لگی۔ فضا میں پرند مغرب کی طرف بھاگے چلے جارہے تھے۔ مشرق سے اٹھنے والی یہ سیاہی سورج کی شعاعوں سے روشن ہوگئی اور اس میں اڑتے بھاگتے پرند بڑا دلچسپ منظر پیش کررہے تھے۔ عراقی نے قلندروں سے پوچھا۔ ''مشرقی فضا میں یہ کیا ہورہا ہے؟''

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ''یہ آندھی ہے کالی آندھی۔ ہمیں آندھی آنے سے پہلے ہی پناہ گاہ کا انتظام کرلینا چاہیے ورنہ کہاں بھاگے پھریں گے۔''

اب تیز ہوا کے جھونکے ان کے جسموں سے ٹکرارہے تھے جس سے ان کا توازن بگڑنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ جب آندھی نے ان کے وجودوں کو ہلا ڈالا اور تنکوں کی طرح انہیں اڑانا شروع کردیا تو وہ سب بہت پریشان ہوگئے اور خدا

سے حفظ و امان میں رکھنے کی دعائیں مانگیں۔ آندھی کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ ایک قلندر کو کہیں اڑا لے گیا۔ دوسرے جھونکے نے ان سب کو ایک دوسرے سے منتشر کر دیا۔ عراقی نے بڑی کوشش کی کہ خود کو قابو میں رکھیں لیکن وہ بے قابو ہی رہے اور مغرب کی طرف بھاگتے ہی چلے گئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا گویا بہت سارے ہاتھ انہیں دھکیل رہے ہیں۔ ہوا کی شدت نے ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ ہوا کپڑوں میں گھسی جا رہی تھی۔ عراقی نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ ''قلندرو...! تم سب کہاں ہو؟ آوازدو میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟''

لیکن اس کا جواب ہوا کے جھکڑوں نے یہ دیا کہ انہیں زمین پر گرا دیا۔ عراقی زمین پر لڑھکنے لگے۔ ہوا انہیں کسی روئے کی طرح دور تک لڑھکائے چلی گئی۔

کافی دیر بعد طوفان تھما تو عراقی نے اپنے آس پاس طوفان کے تباہ کن اثرات دیکھے۔ درختوں کا جال سا بکھرا ہوا تھا جو جڑوں سے اکھڑ کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مکانوں کے تختے، چھپر وغیرہ نے زمین کی پردہ پوشی کر رکھی تھی۔ جانوروں کی لاشیں اور نیم مردہ مویشی ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ انسانوں میں جوان، بوڑھے، بچے یا تو مر چکے تھے یا سسک رہے تھے۔ عراقی نے ان میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملے۔ آخر عراقی نے ان زخمیوں کی مدد کرنا شروع کر دی۔ ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے اور زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر گاؤں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ وہاں ان کا علاج کیا جانے لگا۔

اب عراقی نے ایک بار پھر اپنے قلندروں کی تلاش شروع کی لیکن ان میں سے ایک بھی نہ ملا۔ یہ بہت پریشان ہو گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ آخر دل نے مشورہ دیا کہ سومنات کی طرف چل وہیں تیرے ساتھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے سومنات کا رخ کیا اور قلندروں کی تلاش میں دور تک چلے گئے۔

آخر کسی نے کان میں کہا۔ ''عراقی! تو کس کی تلاش میں سرگرداں ہے؟ اب وہ تجھے نہیں ملیں گے۔ اب وہیں واپس جا جس سرزمین نے تیرے پاؤں چوم لیے تھے۔''

عراقی نے لوگوں سے پوچھا۔ ''بھائیو! ملتان جانا ہے، مجھے کس طرف سفر کرنا چاہیے؟''

ایک نے ایک مغربی راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''یہ سڑک پیچ و خم کے بعد تمہیں ملتان پہنچا دے گی۔''

عراقی تن تنہا اس سڑک پر چل پڑے۔ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟ بس بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کوئی انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور یہ کھنچے چلے جا رہے تھے۔ کافی دنوں بعد دور ہی سے ملتان کے آثار دکھائی دینے لگے۔

کسی راہگیر سے پوچھا۔ ''بھائی یہاں سے ملتان کتنی دور ہے؟''

راہگیر نے جواب دیا۔ ''اب ملتان دور کہاں رہا؟ وہ سامنے ہے ملتان۔''

عراقی بڑے شوق میں ملتان کی طرف بڑھے اور یہ سفر کس طرح کٹا انہیں کچھ ہوش نہ تھا۔

ہوش جو آیا تو خود کو بہاء الدین زکریا کے سامنے کھڑا پایا۔

بہاء الدین زکریا نے مسکرا کر پوچھا۔ ''عراقی! کہاں، آخر آ گئے نا...؟'' عراقی نے والہانہ انداز میں جواب دیا۔

''زمانہ اور زمانے کے ساتھ ہی میری زندگی میرا ساتھ چھوڑ دے یہ ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں تجھ سے منحرف ہو جاؤں اور تجھ سے گریز کروں۔ میں تیری مہربانیوں کا اسیر ہوں، تیری مہربانی کی نظر ہر تعریف سے بالا ہے۔ شیرِ مادر (ماں کا دودھ) کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو لیکن تیری مہربانی اور نظر اپنی وقعت اور قیمت میں سو گنا زیادہ ہیں۔''

پیر ملتانی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور تخلیے میں لے گئے۔ فرمایا۔ ''عراقی! تو بہت گھوم پھر لیا اب چلہ کشی کر۔''

عراقی تابعدار فرماں بردار بن کر چلے میں بیٹھ گئے۔ گیارھویں دن ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ اندر بے اختیار رو رو کر پرسوز لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''ساقی کا پہلا جام ہی ایسا تھا جس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا

اس کی آنکھوں کی مستی نے شراب میں کچھ زیادہ ہی اثر بھر دیا ہے

وہ جب کسی عیش و عشرت کے دلدادہ کو بے خود کرنا چاہتے ہیں تو

اس کی خوشی میں بے خودی کی شراب انڈیل دیتے ہیں

جب وہ کسی عاشق کی مرغ جاں کو قید کرنا چاہتے ہیں
تو وہ ان زلفوں کو کام میں لاتے ہیں جو ہمیشہ فتنوں کی تلاش میں رہتی ہیں
ساری دنیا کے آلام و مصائب کو جب یک جا کیا گیا
تو اس کا نام عشق قرار پایا
افسوس کہ تو اپنا راز خود ہی کھول دیتا ہے اور
عراقی کو خواہ مخواہ بدنام کرتا ہے۔''

عراقی حجرے میں لہک لہک کر اشعار سنا رہے تھے اور ان کی آواز باہر بیر ملتانی کے مریدوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ سہروردیہ سلسلے میں سماع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مریدوں نے حضرت زکریا ملتانی سے شکایتاً کہا۔ ''حضرت! ہمارے یہاں تو سماع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن عراقی حجرے میں یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہیں منع کیا جائے۔''

حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ''ہاں دوسروں کے لیے سماع ممنوع ہے لیکن عراقی کے لیے اجازت دی گئی ہے۔'' مرید خاموش ہوگئے۔

اب عراقی کی حالت کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔ چند دنوں بعد حضرت زکریا ملتانی کے ایک مرید خرابات کے پاس سے گزرے تو انہوں نے نشے میں بدمست رندوں کو وہ غزل گاتے سنا جو عراقی حجرے میں لہک لہک کر سنا چکے تھے۔

مرید نے یہ واقعہ پیر و مرشد کو سنا دیا کہا۔ ''حضرت! اب تو عراقی کا کلام رندوں تک پہنچ چکا ہے۔''

حضرت زکریا ملتانی نے فرمایا۔ ''عراقی کا کام تمام ہوا۔''

اس کے بعد عراقی کو طلب کیا اور خلوت میں لے جا کر پوچھا۔ ''عراقی وہ مناجات جو حجرے میں کی گئی تھی، وہ وہاں سے نکل کر خرابات تک کس طرح پہنچ گئی؟''

عراقی جواب دینے کے بجائے پیر و مرشد کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگے۔ حضرت زکریا ملتانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی دعائیں دیں۔ آپؒ نے اپنا خرقہ انہیں پہنا دیا اور اپنی بیٹی کا نکاح پڑھا دیا۔ عراقی اپنے پیر و مرشد اور خسر کے پاس رہنے لگے اور یہاں پچیس سال گزار دیے۔

☆☆☆

حضرت زکریا ملتانی نے وصال سے پہلے انہیں اپنا خلیفہ اور جانشین بنا دیا لیکن عراقی مغلوب الحال تھے۔ انہیں اپنے آپ پر اختیار نہیں تھا۔ وہ شعروں میں اپنی کیفیات کا برملا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کے مریدوں کو اس پر اعتراض ہوا اور انہوں نے عراقی پر زور دیا۔ ''عراقی! یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے، تم شاعری چھوڑ دو۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''مجھے میرے مرشد نے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لیے شاعری چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں شاعری نہیں چھوڑ سکتا۔''

مریدوں نے انہوں سے کہا۔ ''اگر تم مسلک سہروردیہ پر قائم نہیں رہ سکتے تو پھر تم خلیفہ بھی نہیں بن سکتے اس لیے یہ جگہ اس کے لیے خالی کر دو جس نے مسلک سہروردیہ کو جزو ایمان سمجھ رکھا ہے۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''ہاں میں سمجھتا ہوں اور ایسا کروں گا۔ میں عنقریب یہاں سے نکل اور چلا جاؤں گا۔''

آخر ایک دن آپ نے عدن کی راہ لی۔ عدن کا حکمران عراقی کا بے حد مداح تھا اور اس نے کئی بار ان کو بلوایا تھا چنانچہ جب عدن کے سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ عراقی اس کے پاس آ رہے ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے دربار کے علما اور صلحا کو جمع کیا اور انہیں عراقی کی تشریف آوری کا مژدہ سنایا۔ آخر میں کہا۔ ''عراقی آ رہا ہے تم سب کو اس کا استقبال کرنا ہے۔''

عراقی عدن پہنچے تو انہیں استقبال کرنے والوں کا عظیم الشان ہجوم نظر آیا۔ استقبال کرنے والوں میں سلطان خود بھی شامل تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر عراقی سے بغل گیر ہوا اور بوسہ دیا۔ استقبال کے بعد یہ لوگ شاہی قصر کی طرف چل پڑے۔ سلطان نے اپنے محل کے ایک حصے میں عراقی کو ٹھہرایا اور صبح شام ان کی خدمت میں حاضریاں دینے لگا۔ خاطر تواضع میں حد درجہ تکلف سے کام لیا۔ یہاں تک کہ عراقی کو شرم محسوس ہونے لگی۔ عراقی نے خانۂ کعبہ کی زیارت کا منصوبہ

بتایا۔ سلطان سے کہا۔ ''جناب والا! میں خانۂ کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہوں اگر آپ لوگ چند دنوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''واہ جناب! آپ کو تنہا کیوں چھوڑا جائے۔ ہم سب آپ کے عقیدت مندوں میں... داخل ہیں۔ آپ خانۂ کعبہ کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے ہم سب آپ کے گرد و پیش پروانوں کی طرح موجود رہیں گے۔''

عراقی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے خانۂ کعبہ کی زیارت کے لیے مجھ کو اکیلا ہی جانا چاہیے۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''نہیں حضرت! آپ تنہا نہیں جائیں گے۔ ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔''

عراقی نے مزید کچھ کہنا فضول جانا اور ایک دن سلطان کو بتائے بغیر کعبہ چلے گئے۔ سلطان کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے خود بھی خانۂ کعبہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ کچھ دور گیا بھی مگر پھر معلوم نہیں کیا سوچا کہ راستے سے واپس آگیا۔ اپنے آدمیوں کے ذریعے بے انتہا مال و زر آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور ہدایت کردی کہ پوری کوشش کی جائے کہ عراقی، سلطان کا یہ نذرانہ قبول کرلیں لیکن اگر وہ نہ لیں تب پھر اس مال و زر کو ان کے معتقدین میں تقسیم کردینا۔ واپس ہرگز مت لانا۔

خانۂ کعبہ میں داخل ہوتے ہی ان کا حال ہی کچھ سے کچھ ہوگیا۔ انہوں نے احرام باندھ کر ایک شاندار قصیدہ کہہ ڈالا۔ اس کے بعد جب خانۂ کعبہ پر نظر پڑی تو اس کے انوار اور تجلیات سے انہیں کچھ ایسا مسحور کیا کہ ایک دوسرا قصیدہ بھی کہہ ڈالا۔

سلطان کے آدمیوں نے انہیں وہ مال و زر پہنچایا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور سختی سے کہا۔ ''میں مال و زر سے دور بھاگتا ہوں اور مال و زر میرا پیچھا کرتے ہیں۔''

یہاں سے آپ نے مدینے کا سفر شروع کیا۔ مدینے میں داخل ہوتے ہی آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک رات میں پانچ قصیدے کہہ ڈالے۔ طبیعت کسی طرح قابو میں نہیں آتی تھی۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری دی اور شدتِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

مدینے سے نکل کر اقصائے روم (ترکی) کی سیاحت کو چل پڑے۔ قونیہ پہنچے اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے خلیفہ اور جانشین شیخ صدر الدینؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ یہاں عراقی کو بڑی دلچسپی محسوس ہوئی۔ یہیں انہوں نے تصوف کی مشہور کتاب خصوص الحکم کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی مشہور کتاب لمعات تصنیف کی۔ اس کتاب کو صدر الدین نے پڑھا تو بے اختیار جوش میں پکار اٹھے۔

''اے فخر الدین عراقی! تو نے تو اہلِ فتوت (جوان مردوں) کی باتیں سب پر کھول کر رکھ دیں۔''

اس کتاب نے اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل کی کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اشعۃ اللمعات اور مولانا صائن الدین علی ترکہ اصفہانی نے ضوء اللمعات کے ناموں سے اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کتاب کی اس طرح تعریف کی گئی۔

''اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ لمعات فیض کا ایک قطرۂ سحاب ہے جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے دریائے معرفت سے فخر الدین عراقی کی زبان پر ٹپکا۔''

☆☆☆

قونیہ کا امیر معین الدین، عراقی کا بے حد معتقد ہوچکا تھا۔ وہ ہر وقت آپ کی دل جوئی کی فکر میں رہتا۔ اس نے بارہا آپ پر زور دیا کہ... ''عراقی! اپنے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرکے خانقاہ بنالیجیے۔''

کچھ عرصے تو آپ انکار کرتے رہے لیکن پھر توقات نامی جگہ میں خانقاہ بنوالی۔

ایک دن امیر معین الدین ان کی خدمت میں کچھ نقد رقم لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے یہ رقم نہیں لی، انکار کردیا۔ امیر معین الدین کو بڑا دکھ پہنچا اور افسوس سے کہا۔ ''حضرت! آپ نہ تو مجھ سے کوئی خدمت لیتے ہیں اور نہ ہی میری طرف التفات فرماتے ہیں؟''

عراقی نے ہنس کر امیر معین الدین کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اے امیر! میرے لیے زحمت نہ کیا کر۔ التفات کا وقت

آنے دے تو خود دیکھ لے گا کہ میں تیرے لیے کیا کروں گا۔"

ایک دن امیر ان کی ملاقات کو آیا تو انہیں نہ پا کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ باہر کچھ شور وغل ہو رہا تھا۔ امیر ادھر گیا تو دیکھا کہ چند لڑکوں نے ان کے گلے میں رسی ڈال رکھی ہے اور انہیں ادھر ادھر دوڑا بھگا رہے ہیں۔ تماشائیوں نے عراقی پر طنز کیا مگر امیر نے انہیں ڈانٹ دیا اور کہا۔ "تم لوگ عراقی کو نہیں سمجھ سکتے۔"

امیر نے عراقی کو لڑکوں سے رہائی دلائی اور خانقاہ میں واپس لایا۔ یہاں لا کر پوچھا۔ "حضرت! یہ سب کیا تھا؟"

آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ "وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے ان کی خوشی کا سامان کر دیا۔"

امیر نے کہا۔ "حضرت! لوگ آپ پر ہنستے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "گویا میں نے انہیں بھی خوش کر دیا۔" امیر خاموش ہو گیا۔

کئی دن بعد امیر دوبارہ خانقاہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ عراقی دو دن سے غائب ہیں، کچھ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔ امیر نے ہر طرف اپنے آدمی دوڑا دیے لیکن اکثر مایوس واپس آ گئے کہ ان کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ چوتھے دن چند آدمیوں نے خبر دی کہ ایک پہاڑ کے دامن میں موجود ہیں۔ امیر معین الدین اپنے آدمیوں کے ساتھ مذکورہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔ انہوں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ عراقی ننگے پاؤں، ننگے سر پسینے میں شرابور برف کے تودوں پر رقص کر رہے تھے۔ امیر نے عاجزی سے عرض کیا۔ "عراقی! میں آپ کو واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

عراقی نے پوچھا۔ "کہاں...... کہاں واپس لے جائے گا؟"

امیر نے جواب دیا۔ "آپ کی خانقاہ میں۔ تو قات...... واپس چلیے۔"

آپ نے اپنے شرابور جسم کی طرف اشارہ کیا۔ "اے امیر! تو میرا حال دیکھ رہا ہے۔ میں جس آگ میں پھنک رہا ہوں اس کو یہ برف بھی سرد نہیں کر سکتی۔"

امیر نے عرض کیا۔ "میں آپ کو واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ آپ خانقاہ واپس چلیے۔"

عراقی نے جواب دیا۔ "امیر! مجھے یہیں رہنے دے، میں تیرا شکر گزار رہوں گا۔"

امیر نے اصرار کیا۔ "حضرت! میں آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ خانقاہ واپس لے جاؤں گا۔"

عراقی امیر کے اصرار کے آگے مجبور ہو گئے اور خانقاہ واپس چلے گئے۔ اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ امیر معین الدین پر شاہی عتاب نازل ہوا اور حکومت کی طرف سے ضبطی املاک کے احکام صادر ہو گئے۔ ان احکام پر اتنی جلدی عمل درآمد ہوا کہ لوگوں کو بڑی عبرت ہوئی۔ امیر معین الدین وقتی طور پر کسی شناسا کے گھر چلا گیا لیکن وہ ایک دن بعد اس شناسا نے بھی معذرت کر لی اور کہا۔ "جناب! آپ کہیں اور چلے جائیں کیونکہ آپ حکومت کے معتوب ہیں، میں بھی حکومت کی نظر میں آ جاؤں گا۔"

امیر نے جواب دیا۔ "بہتر ہے آج شام کو میں چلا جاؤں گا تو فکر مند نہ ہو۔"

رات کی تاریکی میں امیر نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور خانقاہ میں چلا گیا۔ آپ نے اس کی بڑی دلجوئی کی اور فرمایا۔ "تو یہیں میرے ساتھ رہ۔"

امیر نے جواب دیا۔ "نہیں شیخ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ میں کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

عراقی کو بڑا دکھ ہوا۔ پوچھا۔ "میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

امیر نے اپنے سامان میں سے جواہرات کا ذخیرہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کہا۔ "شیخ! اسے آپ اپنے پاس رکھ لیں اور جس طرح چاہیں کام میں لائیں اور اگر موقع ملے تو میرا ایک کام کر دیجیے۔"

آپ نے پوچھا۔ "اپنا کام بتا، کون سا کام ہے؟"

امیر نے جواب دیا۔ "شیخ! میرا ایک بیٹا مصر میں قید ہے۔ آپ اس کی رہائی کی کوشش کیجیے۔ اگر وہ رہا ہو جائے تو اس کو اپنے پاس رکھیے اور اس کو نظروں سے اوجھل تک نہ ہونے دیجیے۔ اس کو اپنا پرانا خرقہ پہنا دیجیے اور اس کو موقع نہ

دیجیے کہ وہ اس خزانے کو ضائع کرے۔ یہ دنیا کچھ بھی نہیں۔ میں دنیا سے مایوس ہو چکا ہوں اور اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ میرا اثاثہ دنیا میں ضائع ہو جائے۔''

امیر پر گریہ طاری ہو گیا۔ وہ زاروقطار رو رہا تھا۔ آپ بھی رونے لگے اور گلوگرفتہ آواز میں اس کو تسلیاں دیتے رہے۔ امیر چلا گیا۔ آپ نے جواہرات کا ذخیرہ احتیاط سے رکھ لیا۔ امیر محسن الدین کے بعد اس علاقے کا امیر خواجہ شمس الدین کو مقرر کیا گیا۔ اسی عہد کے ایک دوسرے بزرگ مولانا امین الدینؒ عراقی سے بڑی محبت کرتے تھے اور نیا امیر خواجہ شمس الدین، مولانا امین الدین کا عقیدت مند تھا۔ خواجہ شمس الدین جب اپنا عہدہ سنبھالنے تو قات آیا تو اس کے ساتھ مولانا امین الدین بھی آ گئے اور تو قات میں داخل ہوتے ہی عراقی سے ملنے چلے گئے۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے اور کچھ دیر بعد سیر و سلوک پر گفتگو شروع ہو گئی۔ دن گزرا رات آئی اور رات سے پچھلی رات ہوئی مگر دونوں باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ اس طرح مولانا امین الدین عراقی کے پاس تین دن تک مقیم رہے۔ چوتھے دن امیر خواجہ شمس الدین کے پاس واپس پہنچے۔

امیر نے شکایتاً کہا۔ ''حضرت! آپ نے بڑا انتظار کروایا۔''

مولانا امین الدین نے جواب دیا۔ ''خواجہ! افسوس تم عراقی سے نہیں ملے۔ میں نے اس جیسا شخص زندگی بھر نہیں دیکھا وہ جس موضوع پر بھی زبان کھولتا ہے سمندر کی طرح اپنا علم بہا دیتا ہے۔ میں تین دن عراقی کے پاس رہا اور اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اگر میں ان کے پاس تین سال بھی رہتا تو یوں ہی تشنگی محسوس کرتا اور یہ تین سال بھی کچھ نہیں، شاید پوری زندگی گزارنے کے بعد بھی میں یوں ہی تشنہ رہتا۔ وہ تو عجیب و غریب آدمی ہے۔ میں اس کی تعریف تک نہیں کر سکتا۔''

خواجہ شمس الدین نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو مجھ کو بھی ان بزرگ سے ملوا دیجیے۔''

امین الدین نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو عراقی کے پاس ضرور لے جاؤں گا۔''

خواجہ شمس الدین نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرے بھی کچھ جذبات ہیں، کسی وقت بھی عراقی کے پاس چل سکتا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ میں عراقی کی دعوت کروں اور وہ اپنے پاک قدم سے میرے غریب خانے کو زینت بخشیں۔''

مولانا امین الدین نے کہا۔ ''عراقی سے آپ کی طرف سے درخواست تو کر سکتا ہوں لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ اس دعوت کو قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔''

خواجہ نے کہا۔ ''آپ ان سے درخواست تو کیجیے ممکن ہے قبول کر لیں۔''

مولانا امین الدین عراقی کے پاس چلے گئے اور صاف صاف عرض کیا۔ ''عراقی! میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ امید ہے آپ میری درخواست ٹھکرائیں گے نہیں۔''

عراقی نے ہنس کر جواب دیا۔ ''مولانا! آپ درخواست کیوں کرتے ہیں حکم دیجیے، میں آپ کی بات کس طرح ٹال سکتا ہوں۔''

مولانا امین الدین نے فرمایا۔ ''خواجہ شمس الدین غائبانہ ہی آپ کا مداح اور عقیدت مند ہو چکا ہے۔ اس نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر بعد میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی دعوت کر کے آپ کو مدعو کیا جائے چنانچہ اس نے آپ کی دعوت کر دی ہے اور میں نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ آپ کو دعوت میں لے چلنے کے لیے رضامند کر لوں گا۔ اب آپ چاہیں گے تو میں سرخروئی حاصل کر لوں گا اور نہیں چاہیں گے تو میں شرمندگی اٹھانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ آپ جس میں خوشی محسوس کریں مجھے بتا دیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''عراقی دوسروں کی خوشی کی خاطر زندہ ہے۔'' عراقی نے کہا۔

مولانا نے جواب دیا۔ ''میری خوشی تو اس میں ہے کہ آپ اس کی دعوت پر تشریف لے چلیں۔''

عراقی نے کہا۔ ''میں ضرور چلوں گا۔''

مولانا امین الدین نے خواجہ شمس الدین کو خوش خبری سنائی کہ عراقی نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے چنانچہ خواجہ نے عراقی کے لیے ایک خلعت اور اونٹ روانہ کیا اور اس اونٹ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنہیں عراقی کے آس پاس ادب سے چلنا

تھا۔

دوسری طرف خواجہ شمس الدین نے معززین اور مولانا امین الدین کو ساتھ لیا اور آپ کے استقبال کو آگے بڑھا۔ جب دور سے شیخ عراقی کی سواری نظر آئی تو خواجہ شمس الدین اپنے ہمراہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور نہایت احترام سے عراقی کا استقبال کیا۔ عراقی کی نظر جوں ہی مولانا پر پڑی بے اختیار فرمایا۔ ”مولانا! مجھ کو یہاں تک لانے میں تمہارا ہی فتنہ کارفرما ہے۔“

مولانا نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ جس چیز کو فتنہ کہہ رہے ہیں وہ ہمارے لیے سعادت ہے۔“

خواجہ شمس الدین آپ کے قریب پہنچا اور عرض کیا۔ ”زہے نصیب کہ آپ تشریف لائے۔ یہ آپ کا ایک ایسا کرم ہے جس کا میں شکریہ کسی طرح بھی ادا نہیں کرسکتا۔“

یہ لوگ امیر کے محل میں گئے۔ عراقی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور سلوک پر گفتگو شروع ہوگئی۔ شیخ عراقی نے بولنا شروع کیا تو ہر کوئی گونگا ہوگیا۔ گفتگو کی تاثیر اور گرمی نے سامعین کے دلوں کو پگھلا دیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ خواجہ شمس الدین کا بہت برا حال تھا۔ حاسد بھی موجود تھے۔ کچھ عرصے بعد ان حاسدوں نے حکومت کو مطلع کیا کہ سابق امیر معین الدین کی دولت خانقاہ میں شیخ عراقی کے پاس موجود ہے۔ حکومت نے خواجہ شمس الدین کو حکم دیا کہ شیخ عراقی سے امیر معین الدین کی دولت زبردستی واپس لے لی جائے۔

خواجہ شمس الدین کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کہ وہ اس پر عمل درآمد کس طرح کرے گا۔ وہ خانقاہ میں تلاشی کی نیت سے داخل ہونے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ خواجہ بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کیا کرے۔ آخر وہ تنہا خانقاہ پہنچا اور شیخ عراقی سے کہا۔ ”شیخ اس وقت میں انتہائی نازک اور اہم مقصد سے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”میں تیری مشکل سے واقف ہوں۔ حاسد تیرا ابھی پیچھا کر رہے ہیں۔“

خواجہ نے عاجزی سے پوچھا۔ ”حضرت! بتائیے میں کیا کروں؟ میری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی کہ میں حکومت کے حکم کا آپ سے ذکر کرسکوں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”امیر! تو نے جو سنا ہے وہ بات درست ہے۔ امیر معین الدین کے جواہرات امانتاً میرے پاس موجود ہیں۔ امیر کا بیٹا مصر میں قید ہے۔ میں اسے رہا کرواؤں گا اور امیر کے جواہرات اس کے حوالے کر دوں گا۔“

خواجہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس پر حکومت کے بدباطن آپ کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی زبان بند رکھیے۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”خواجہ! حکومت کے آدمی مجھے گرفتار کر سکتے ہیں، کرلیں گرفتار لیکن میں امیر معین الدین کی امانت حکومت کے حوالے نہیں کرسکتا، یہ جس کی ہے اسی کو دی جائے گی۔“

خواجہ نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! مجھ پر رحم فرمائیں کچھ کریں ورنہ اس خانقاہ میں جو کچھ ہوگا بہت برا ہوگا۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”خواجہ! تو کیوں فکر کرتا ہے۔ میں عنقریب اس خانقاہ سے چلا جاؤں گا اور مصر جا کر امیر معین الدین کے بیٹے کی رہائی کی کوشش کروں گا۔ حکومت کا میرے خلاف حکم آیا ہی اس لیے ہے کہ میں توقات چھوڑ کر مصر چلا جاؤں۔ یہی مشیتِ ایزدی ہے اور یہی حکم الٰہی۔“

خواجہ شمس الدین کی آنکھیں بھر آئیں، بولا۔ ”میں یہ بات اپنی زبان سے نہیں ادا کرسکتا تھا۔ میں آپ کی بے حرمتی بھی گوارا نہیں کرسکتا اس لیے بصد ادب آپ سے درخواست ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

عراقی نے جواب دیا۔ ”میں آج ہی توقات کو چھوڑ رہا ہوں اور مصر جا رہا ہوں۔“

خواجہ مطمئن ہو کر اپنے محل واپس چلا گیا اور آپ نے اسی وقت سامانِ سفر باندھا اور امیر معین الدین کی امانت لے کر مصر کا رخ کیا۔ دو مرید آپ کے ساتھ تھے۔ مصر کی خانقاہ صالحیہ میں قیام کیا۔ انہوں نے سلطان مصر سے ملنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ ملاقات کی کوئی صورت نکل ہی نہیں رہی تھی۔ آخر عاجز آ کر سلطان کے محل کے دروازے پر پہنچے اور دربان سے اندر جانے کی اجازت طلب کی۔ دربانوں نے روک لیا اور پوچھا۔ ”تو ہے کون؟ سلطان سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس ایک شخص کی امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطان کے ذریعے اس شخص تک پہنچا دی جائے۔“

درباتوں نے سلطان کے حاجب کو مطلع کیا کہ ایک مست قلندر سلطان سے ملنا چاہتا ہے اور تقریب ملاقات میں جو کچھ کہہ رہا ہے، دربان نہیں سمجھ سکتے۔

حاجب نے جواب دیا۔ ”اسے حاضر کیا جائے۔“

دربان نے عراقی کو حاجب کے سامنے پہنچا دیا۔ حاجب نے پوچھا۔ ”ہاں تو اب بتا، تو سلطان سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”میرا نام فخر الدین عراقی ہے۔ میں ایک بے ضرر انسان ہوں۔ بادشاہ کو میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“

حاجب نے حیرت سے کہا۔ ”عراقی! یعنی تو فخر الدین عراقی ہے؟ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا بھانجا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں عراقی ہوں شیخ کا بھانجا۔“

حاجب احتراماً کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ”حضرت! معاف کیجیے گا دربان آپ کو کیا پہچانیں گے۔ میں ابھی سلطان سے ملواتا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے، آپ کو کون نہیں جانتا۔“ عراقی خاموش رہے۔

حاجب نے سلطان کو مطلع کیا کہ ”مشہور صوفی اور باکمال شاعر فخر الدین عراقی ہم سب کی خوش قسمتی سے ملاقات کو حاضر ہوا ہے۔ باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“

سلطان نے حکم دیا۔ ”فوراً حاضر کیا جائے۔“

حاجب عراقی کو اپنے ساتھ لے کر سلطان کے پاس پہنچ گیا۔ سلطان آپ کے مرتبے سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ پوچھا۔ ”تیرا مجھ سے کیا کام ہے؟“

عراقی نے جواہرات کی پوٹلی بادشاہ کے سامنے رکھ دی اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے پوٹلی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”امانت...... ایک شخص کی امانت ہے جو سلطان کے ذریعے ہی پہنچائی جا سکتی ہے۔“

سلطان نے حاجب کو حکم دیا۔ ”پوٹلی کھولی جائے۔“

حاجب نے پوٹلی کھولی تو اس میں سے بیش قیمت جواہرات کی چمک نے آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ سلطان حیرت سے دیکھتا رہا۔ بولا۔ ”حضرت! یہ جواہرات کس کے ہیں اور میرے پاس کیوں لائے گئے؟“

عراقی نے پوری روداد سنا دی اور کہا۔ ”میں اس امانت کی وجہ سے بہت پریشان تھا لیکن اب میں خوش ہوں کہ آپ سے ملاقات ہوئی اور صحیح شخص تک پہنچ گیا۔“

سلطان نے حیرت سے کہا۔ ”عراقی! میں آپ کی ایمان داری پر حیرت زدہ ہوں۔ جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی مجھے بتایا۔ قیدی کے باپ نے یہ جواہرات آپ کو دیے تھے۔ آپ انہیں اپنے تصرف میں لا سکتے تھے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ آپ نے کس طرح جانا کہ امیر معین الدین نے یہ جواہرات اپنے بیٹے کے لیے دیے تھے؟“

عراقی نے جواب دیا۔ ”سلطان! میں دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتا ہوں۔ مال و متاع انسان کو کہیں کا بھی نہیں رکھتا۔ یہ جواہرات میرے کس کام کے، ان سے ایک امیر زادہ ہی مطمئن ہو سکتا ہے۔ ایک درویش کا اپنا خرچ ہی کتنا۔ متاعِ دنیا جتنی کم ہو گی فقیر کو اتنی ہی آسودگی ملے گی۔“

سلطان آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے پاس ادب سے بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”یہ گستاخی ہے کہ میں آپ سے دور اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں۔“

آپ بڑی دیر تک سلطان کے سامنے تقریر کرتے رہے۔ سلطان دنیا و مافیہا سے غافل آپ کی باتیں سنتا رہا۔ آخر سلطان نے فرمان جاری کر دیا۔ ”امیر معین الدین کے بیٹے کو رہا کر دیا جائے۔“

لڑکے کو رہا کر کے سلطان کے پاس حاضر کر دیا گیا۔ بادشاہ اس سے بڑی مہربانی سے پیش آیا اور انعام و اکرام سے

نواز دیا۔

ترک سلطان نے عراقی کو محل میں ٹھہرالیا اور مؤدبانہ گزارش کی۔" حضرت! میں آپ کو اپنی سلطنت کا شیخ الشیوخ بنانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔" کیا یہ بہت ضروری ہے؟"

سلطان نے جواب دیا۔" ہاں میں بہت ضروری سمجھتا ہوں' آپ کی موجودگی سے میری حکومت کو چار چاند لگ جائیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔" اگر یہ بات ہے تو میں سلطان کی خوشی کے لیے شیخ الشیوخ کا منصب قبول کرلوں گا۔"

سلطان نے کہا۔" تو میں اس تقریب میں شرکت کے لیے سب کو دعوت دے دوں؟"

آپ نے جواب دیا۔" جیسی سلطان کی مرضی۔"

سلطان نے اسی وقت تقریباً چھ ہزار علما اور صوفیا کو شیخ الشیوخ کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے دی۔

سلطان نے موعودہ دن ایک خاص اہتمام کیا۔ عراقی کو بڑے اعزاز کے ساتھ خلعت اور طیلسان پہنایا گیا اور ایک جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ سلطان نے اعلان کردیا۔" اس جلوس میں عراقی کے سوا ہر شخص پیدل چلے گا۔ فخرالدین عراقی گھوڑے پر سوار ہوں گے، تمام صوفیا، علما اور امرا ان کے ہم رکاب پیدل چلیں گے۔"

عراقی نے سلطان سے کہا۔" سلطان! دوسروں کو بھی گھوڑوں پر سوار ہونے کی اجازت دی جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح موجودہ صورت حال میں، میں آزمائش میں مبتلا ہوجاؤں گا۔"

سلطان نے جواب دیا۔" شیخ! یہ عزت منجانب اللہ ہے اور جو چیز اللہ کی طرف سے ہو اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔" شیخ عراقی خاموش ہوگئے۔

عراقی خلعت وطیلسان پہن کر گھوڑے پر سوار ہوگئے اور شریک جلوس صوفیا، علما اور امرا سلطان کے حکم سے عراقی کے ہم رکاب پا پیادہ چلے۔ عراقی نے اپنے آس پاس معززین کو پیدل چلتے دیکھا تو اپنی عظمت اور توقیر کی وجہ سے نفس میں غرور کا غلبہ محسوس کیا۔ انہوں نے اضطراری حالت میں دستار اور طیلسان کو اتار کر زین کے آگے رکھ لیا، گھوڑے سے اتر کر زمین پر کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر بعد دستار کو دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا۔

حاضرین نے ان کا مذاق اڑایا۔" تعجب ہے سلطان نے اس دیوانے کو شیخ الشیوخ بنادیا۔ آخر اس میں خاص بات کیا ہے؟"

ایک عالم نے کہا۔" مجھے تو اس میں علم بھی نظر نہیں آتا۔ سلطان نے اس میں ایسی کیا چیز دیکھ لی جو ان کا اتنا والہ وشیدا ہو رہا ہے۔ میری تو عقل کام کرہی نہیں رہی ہے۔"

سلطان نے اپنے وزیر سے کہا۔" ذرا شیخ سے معلوم تو کرو کہ انہوں نے دستار اور طیلسان کو اتار کر زین کے پاس کیوں رکھ دیا تھا اور خود گھوڑے سے کیوں اتر پڑے؟"

وزیر نے جب یہی سوال عراقی سے کیا تو انہوں نے جواب دیا۔" تم سلطان کو بتادو کہ اس نے جو عزت اور احترام بخشا ہے اس نے میرے نفس میں تکبر اور غرور پیدا کردیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس تکبر اور غرور کو شرمندہ اور خوار کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کے بغیر سرکش نفس قابو میں نہ آتا۔"

وزیر نے آپ کے جواب سے سلطان کو مطلع کیا تو بادشاہ نے حکم دیا۔" جلوس چلتا رہے۔"

جلوس اسی شان سے رواں دواں رہا۔ آخر جب تقریب اختتام کو پہنچی تو خلیے میں سلطان نے خود سوال کیا۔" اے شیخ! آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

آپ نے جواب دیا۔" سلطان! افسوس کہ تجھ کو حال کی خبر نہیں۔"

سلطان نے کہا۔" پھر بھی میں آپ کی زبان سے اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔" سلطان! اس وقت میں اپنے نفس کا غلبہ محسوس کررہا تھا اور نفس کو اس طرح قابو میں لایا جاسکتا تھا کہ لوگ اس پر ہنسیں اس کا مذاق اڑائیں اور اس کو شرمندہ کریں۔"

سلطان نے فرطِ عقیدت سے کہا۔ ''شیخ! آپ نے میرا دل اپنی مٹھی میں کرلیا ہے۔ بلاشبہ آپ نہایت عظیم انسان ہیں۔''

سلطان نے ان کے وظیفے میں اضافہ کر دیا۔

آپ کے مزاج کی آشفتگی اور بے قراری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ شیخ الشیوخ ہوجانے کے باوجود آزادانہ بازاروں، گلیوں، سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے اور اب بھی یہ حال تھا کہ حسن انہیں بے قابو کر دیتا۔ آپ اگر کسی حسین چیز کو دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے اور یہاں تک کہ اپنے آپ میں نہ رہتے۔ دوسرے لوگ آپ کا مذاق اڑاتے۔ جب یہ کسی بازار سے عامیانہ گزرتے تو حاسد انہیں دیکھ کر فقرا کستے۔ ''دیکھنا تو بے چارہ شیخ الشیوخ کیسا رواں دواں ہے۔''

ایک حاسد عالم نے کہا۔ ''میاں زمانے کی ناقدری اسی کو کہتے ہیں کہ ایک دیوانہ شیخ الشیوخ بن گیا اور فرزانہ دور کھڑا حسرت و عبرت سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔''

کسی معتقد نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ لوگ جو چاہیں کہیں لیکن میں اس شخص کو دیوانہ نہیں کہہ سکتا۔ سلطان کچھ دیکھ کر ہی اس شخص کو اتنی قدر و منزلت پر مجبور ہیں۔ میں تو بھی اس میں ایک عجیب سی کشش اور شان محسوس کرتا رہتا ہوں۔''

عالم نے اسے جھڑک دیا۔ ''تو خود جاہل ہے تجھ کو کیا پتا کہ علم کیا ہے اور جہل کسے کہتے ہیں؟ کچھ بھی ہوجائے عالم اور دانا اس شیخ الشیوخ کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے۔''

معتقد نے جواب دیا۔ ''ان کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ ہاں جب خدا نے یہ عظمت اور شان ان کو عطا کر دی ہے تو اب کون ہے جو ان سے چھین لے۔''

ایک دن سلطان کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی کہ عراقی شیخ الشیوخ ہونے کے باوجود عامیوں کی طرح گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

سلطان نے جواب دیا۔ ''شیخ اتنے بڑے اور عظیم انسان ہیں کہ ہم میں ایک بھی ایسا نہیں جو ان پر تنقید کرے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہیں اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ شیخ کا کوئی بھی قدم غلط نہیں ہوتا۔''

اس کے بعد شیخ کو بلا کر عاجزی سے عرض کیا۔ ''شیخ! آج سے میں نے آپ کو یہ اختیار دیا کہ آپ میرے پاس جس وقت اور جہاں بھی آنا چاہیں، بے تکلف آزادی سے چلے آئیں۔ آپ کو کوئی بھی نہیں روکے گا حتیٰ کہ میری حرم سرا اور خواب گاہ میں بھی آپ بروقت آ جا سکتے ہیں۔''

چنانچہ اس اجازتِ خاص کے بعد سلطان کو جب بھی شیخ کی آمد کی اطلاع ملی، وہ ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آپ کے پاس آجاتا تھا۔ اس کے ادب و احترام میں حد درجے غلو شامل ہوگیا تھا اور اس کی عقیدت خلوص اور اعتماد کا مثالی نمونہ بن گئی تھی۔ لوگوں کو اس خبر نے اور زیادہ انگاروں پر لٹا دیا۔ آپ کی طبیعت مصر سے اکتا گئی اور سلطان سے کہا۔ ''میں شام جانا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''شیخ! میں آپ کی مفارقت نہیں برداشت کر سکوں گا۔''

آپ اپنی بات پر قائم رہے اور پھر کہا۔ ''سلطان! میں شام جانا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے پھر وہی جواب دیا۔ ''حضرت! میں نے عرض کیا نا کہ میں آپ کی مفارقت نہیں برداشت کر سکوں گا۔''

عراقی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''سلطان! میں شام جانا چاہتا ہوں۔''

سلطان لاجواب ہوگیا پوچھا۔ ''حضرت کتنے عرصے کے لیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شام کی طرف سے بوئے موانست آرہی ہے۔ میں شام ضرور جاؤں گا۔''

سلطان نے عرض کیا۔ ''حضرت! مجھ میں اتنی ہمت و مجال کہاں کہ آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف روک لوں۔ آپ شام تشریف لے جائیں میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ واپس کب تک آئیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''واپسی کا علم خدا کو ہے میں نہیں جانتا، میں جو جانتا تھا بتا چکا کہ شام سے مجھے بوئے موانست

آ رہی ہے اور میں اس طرف کھنچا جا رہا ہوں۔"

سلطان نے کہا۔ "آپ شام تشریف لے جائیں، وہ میرے ہی زیرِ نگیں ہے۔"

اس کے بعد سلطان نے شام کے ملک الامراء کے نام فرمان جاری کیا کہ "شیخ الشیوخ شیخ فخرالدین عراقی تشریف لا رہے ہیں۔ ان کا شاندار استقبال کیا جائے اور انہیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے کیونکہ یہ نادرۂ روزگار ہستی ہم سب کی عزت و احترام کی مستحق ہے۔"

عراقی نے مصر چھوڑ دیا اور شام روانہ ہو گئے۔ شام کے امیر الامراء نے ان کا شاندار استقبال کیا اور ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ آپ کا بیٹا کبیرالدین ملتان سے شام ملاقات کی غرض سے پہنچ گیا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور بیٹا سینے میں منہ چھپائے زار و قطار روتا رہا۔ آپ بھی رو دیے۔

بیٹے کو اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا۔ "میں تیری وجہ سے شام چلا آیا ورنہ ابھی مصر ہی میں ہوتا۔"

بیٹے نے کہا۔ "بابا جان! ملتان تشریف لے چلیے۔"

باپ نے جواب دیا۔ "بیٹے! شام کی مٹی میں انس و محبت کی بو پائی جاتی ہے۔ یہاں سے اور کہیں نہیں جا سکتا۔"

بیٹے نے عاجزی سے کہا۔ "آپ پھر واپس آ جائیے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اب اتنا وقت کہاں؟ جام عمر چھلکنے ہی والا ہے۔ زندگی کے ماہ و سال سے یہ لبریز ہو چکا ہے۔"

بیٹے نے عرض کیا۔ "میں نے تو اسی لیے حاضری دی تھی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اور میں نے تجھے اسی لیے بلایا تھا کہ آخری بار تجھے دیکھ لوں۔" بیٹا ایک بار پھر زار و قطار رونے لگا۔

چند دنوں بعد شیخ کے چہرے پر ورم نمودار ہوا اور آپ تنفس میں تکلیف محسوس کرنے لگے۔ علاج شروع ہوا لیکن آپ نے اپنے بیٹے کو بتا دیا۔ "بیٹے! یہ تو مرض الموت ہے۔ کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ شام کی زمین سے انس و محبت کی بو محسوس ہو رہی ہے؟"

بیٹے کو ملال تھا کہ باپ سے ملاقات ہوئی بھی تو کس وقت۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں۔ ورم اور تنفس کی اذیت نے شیخ کو پانچ دن تک سونے نہیں دیا۔ آخری لمحوں میں بیٹے سے کہا۔ "کبیرالدین! یہ آیت تو نظر سے گزری ہوگی؟"

بیٹے نے پوچھا۔ "بابا جان کون سی؟ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے آیت پڑھی۔ ترجمہ "جس روز ایسا آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا اور ان میں کا ہر شخص ایسے مشغلے میں ہوگا کہ وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے گا۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ "بیٹے! خدا حافظ!"

آپ نے کلمۂ طیبہ پڑھا اور سفرِ آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کے وقت آپ کی عمر اٹھاسی سال تھی۔ انہیں مشہور صوفی شیخ محی الدین عربی کے مزار کے برابر دفن کیا گیا اور یہ دونوں مزار محلہ صالحیہ میں واقع ہیں۔ محی الدین عربی کے مزار پر لکھا ہے "بحر العرب" اور شیخ فخرالدین عراقی کے مزار پر "بحر العجم" کندہ کر دیا گیا۔ گویا عرب اور عجم کے دو عظیم علمی اور روحانی سمندر دو دو گز زمین میں سما گئے اور ان دونوں سمندروں کا فیض آج بھی جاری و ساری ہے۔

ماخذات

ذکارِ ابرار۔ محمد غوثی شطاری۔ ... اکبری، مولانا محمد حسین آزاد۔
انوار الصفا۔ محمد خصلت حسین صابری۔ صوفیائے نقشبند، سید امین الدین۔
انوار الاصفیا۔ غلام علی اینڈ سنز۔ سکینۃ الاولیا، داراشکوہ

خندقوں والے

ضیاء تسنیم بلگرامی

قرآن پاک کی سورۂ بروج میں اصحاب الاخدود کا ذکر اجمالاً کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ کون تھے اور یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔ آج بھی ایسے ہی ایمان کی ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ماہرینِ اثریات نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ نجران ہی میں بعد میں وہ کلیسا تعمیر ہوا جس کو کعبہ کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی۔ ابرہہ نے اس سلسلے میں ہاتھیوں کے لشکر سے مکہ پر حملہ بھی کیا تھا۔ اس وقت تک صاحبِ ایمان مسلمان ہونے والے تھے اور عیسائیوں میں شرک نے گھر کر لیا تھا۔ آج بھی اسی ایمان کی ضرورت ہے۔

دلچسپ اور عبرت و بصیرت کا یہ واقعہ ایمان و ایقان کا درس دیتا ہے

حق و باطل کے معرکے نامعلوم مدت سے جاری ہیں۔ کہیں کہیں تنہا فردِ واحد حق پرست کسی ظالم و جابر اور کافر حکمران سے معرکۂ کارزار میں سرگرم نظر آئے گا تو کہیں حق پرستوں کی کوئی مختصر جماعت اپنے وقت کی سب سے بڑی طاغوتی قوت کا مقابلہ کرتی نظر آئے گی۔

بظاہر دونوں میں ایک ہی جذبہ کار فرما نظر آئے گا۔ باطل میں بھی وہی جوش و خروش دکھائی دے گا جو حق پرستوں کی ثابت قدمی میں نظر آتا ہوگا مگر ان معرکوں کی روداد پڑھنے والا یا ان معرکوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا متاثر حق پرستوں سے ہی ہوگا۔

ایک بے وسیلہ حق پرست جب اپنے عہد کی بہت بڑی شیطانی طاقت سے ٹکراتا ہے تو ہر دیکھنے والا اس سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ان حق پرستوں کو نہ تو اپنے مال و اسباب سے محبت ہوتی ہے اور نہ جان کی پروا۔ عشق آتشِ نمرود میں بے خطر کود جاتا ہے اور عقل تماشا دیکھتی رہ جاتی ہے۔

قرآن پاک میں جو چھوٹے چھوٹے قصے عبرت کے لیے بیان ہوئے ہیں ان میں خندقوں والوں کا واقعہ بھی اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اور جس سورہ میں اس واقعے کا ذکر ہے اس کا نام ہے سورۂ بروج۔

یہ آیت اس طرح شروع ہوتی ہے "قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس دن کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ مارے گئے کھائیاں کھودنے والے' آگ ہے بہت ایندھن والی' جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ کرتے تھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان سے بدلہ نہیں لیتے تھے مگر صرف اس بات کا کہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے' تعریفوں کا مستحق ہے۔ اس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز۔"

کھائیوں والوں کا اس میں سرسری ذکر ہے۔ یہ خندقوں والے کون تھے؟ اور اس واقعے کی تفصیل کیا تھی؟ عام لوگ تو کیا خاص بھی نہیں جانتے۔

عربوں میں یہ واقعہ تین طرح سے بیان ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ سبا کے قریب نجران نامی جو علاقہ تھا یہاں بادشاہت ایک عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ یہ بادشاہ بہت طاقتور تھا۔ اس کے دربار میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ درباریوں میں جادوگر بھی تھے' بالکل اسی طرح جس طرح فرعون کے دربار میں جادوگر پائے جاتے تھے۔ ہر صاحبِ کمال کی طرح جادوگر بھی اپنے علم کو عام نہیں ہونے دیتے تھے۔ اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے اور اپنی اولاد میں منتقل کر کے مرجاتے تھے۔ اس وقت البتہ بہت مشکل پیش آتی تھی جب کوئی جادوگر لاولد ہوتا تھا اور اس لاولد جادوگر کو کسی ایسے بچے کی تلاش ہوتی تھی جو اس کے سحری علوم کا امین بن سکے۔ خوبصورت ہو' ذہین ہو اور بردبار بھی۔

ایک ایسا ہی جادوگر نجران کے دربار میں بھی موجود تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اور بڑھاپے نے موت کی دہلیز پہ لا کھڑا کیا تھا۔ نجران کے بچوں کو دیکھتا تو اسے اپنے لیے ایک ذہین بچے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی۔

بادشاہ بھی ساحر کی پریشانی سے واقف تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ساحر سے پوچھتا رہتا تھا "تجھ کو اپنے مطلب کا کوئی بچہ ملا یا نہیں؟"

جادوگر جواب دیتا "بچے تو بہت ہیں مگر ان میں کوئی ایسا بچہ آج تک نظر نہ آیا جو میرے سحری علوم کی امانت سنبھال سکے۔"

بادشاہ نے اس کو تسلی دی اور کہا "مت گھبرا۔ میں نے اپنے وزیر سے کہہ رکھا ہے کہ وہ ایک ایسے ذہین اور فطین بچے کو تلاش کرے جس میں بزرگوں جیسی عقل و بردباری ہو۔"

ساحر نے مایوسی سے کہا "اگر کوئی بچہ جلدی نہیں ملتا تو میں سارے علوم یوں ہی سینے میں لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر مجھے میرے مطلب کا بچہ مل بھی جائے تو میری عمر اتنی تو ہونی چاہیے کہ میں اسے سارے علوم منتقل کردوں۔ اگر جلدی مرگیا تو کچھ علوم بچے کو مل جائیں گے اور بقیہ کو میں اپنے سینے میں لے جاؤں گا۔"

بادشاہ کو بھی تشویش ہوئی اور آخر کار اس نے ایک بچہ حاصل کر ہی لیا۔ اس بچے کو محل میں رہنے کی جگہ دینے کے ساتھ پابند کیا گیا کہ ہر روز صبح جادوگر کے گھر جائے اور شام تک سحری علوم حاصل کرتا رہے اور پھر جادوگر کے پاس سے سیدھا بادشاہ کے پاس واپس آئے۔

بچے نے ساحر سے سحری علوم حاصل کرنا شروع کردیے۔

اس کی اکتسابی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ ساحر بھی اس سے بہت خوش تھا اور بادشاہ بھی۔ بادشاہ کو یہ زعم تھا کہ وہ غیر معمولی ہے اور اس میں خدا حلول کر گیا ہے اس لیے ہر کوئی اسے خدا تسلیم کرے۔

جادوگر اور دوسرے درباری اسے خدا تسلیم کرتے تھے۔ شاہی خدام اور معاشرے کے سارے ہی لوگ بادشاہ کو رب تسلیم کرتے تھے۔ اس لڑکے نے بھی اس روایت کی پابندی کی۔ دربار میں آتا تو بادشاہ کو سجدہ کرتا۔ بادشاہ اس کا امتحان لیتا' اس سے سوالات کرتا اور جوابات سے بہت خوش ہوتا۔

کافی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ایک دن صبح صبح جب یہ لڑکا جادوگر کے پاس جارہا تھا تو راستے میں اسے ایک کٹیا نظر آئی۔ حالاں کہ وہ ہر روز ہی ادھر سے گزرتا تھا مگر یہ کٹیا اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکے کو جستجو ہوئی اور وہ کٹیا کے دروازے پر جا کے کھڑا ہو گیا۔ اندر جھانک کے کچھ دیر دیکھتا رہا مگر اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔

اسی کوشش میں یہاں کافی وقت گزر گیا اور اس کو ساحر کے پاس پہنچنے میں دیر ہو گئی لیکن اس وقت اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہو' وہ اس کٹیا میں ضرور جائے گا اور معلوم کرے گا اس میں کون رہتا ہے۔

وہ کٹیا کے اندر گیا۔ وہاں ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکے نے اس بوڑھے سے پوچھا "جناب! آپ یہاں کب سے رہتے ہیں؟"

بوڑھے نے جواب دیا "بچے! میں تارک الدنیا درویش ہوں۔ خود گناہوں سے بچتا ہوں اور دنیا کو بچانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اکثر و بیشتر مایوس بھی ہو جاتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کے اپنی جان دے دوں۔"

لڑکے کو راہب کی باتیں کچھ عجیب لگیں۔ اس نے پوچھا "یہ آپ دنیا سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں؟"

راہب نے جواب دیا "دنیا میں کچھ بھی نہیں' سب کچھ فضول ہے۔ بادشاہت' درباری داری اور جادوگری یہ سب بیکار چیزیں ہیں۔ تُو کن چکروں میں پڑا ہوا ہے؟"

لڑکے نے کہا "جناب! میں سحری علوم سیکھ رہا ہوں اور جب میں یہ سب کچھ سیکھ جاؤں گا تو بادشاہ کے دربار میں جادوگر کی جگہ لے لوں گا۔"

راہب نے کہا "یہی سہی۔ میں نے مانا کہ تُو دربار کا سب سے بڑا جادوگر ہو جائے گا پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟"

لڑکے نے جواب دیا "جناب! آپ اس لذت کا اندازہ نہیں کرسکتے جو شاہی دربار میں ایک معزز جادوگر کی حیثیت سے مجھے حاصل ہوگی۔"

راہب نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں تجھ سے پھر یہی پوچھوں گا کہ اگر تُو نے جملہ علوم بھی حاصل کرلیے تو اس علم اور درباری عزت افزائی سے تجھے کیا ملے گا۔ ذرا سی خوشی جو نہ تو کھانے کے کام آسکتی ہے اور نہ پینے کے۔ دربار کے کتنے ہی لوگ اس قسم کی خوشیاں حاصل کرچکے ہوں گے۔ ان کا کیا حال ہے؟ کیا وہ بے حد خوش ہیں؟ انہیں کوئی غم نہیں ہے؟"

راہب کی باتیں بڑی دل آزاری کی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس راہب کو بھی پکڑ کے دربار میں لے جائے اور دکھائے کہ دربار کیا چیز ہے؟ بادشاہ کیا ہوتا ہے؟ جادوگر کسے کہتے ہیں؟

راہب نے لڑکے کو سمجھایا "بیٹے! اپنی قیمتی عمر اور زندگی فضول باتوں اور کاموں میں مت ضائع کر۔ میں تجھ کو کام کا آدمی بنا دوں گا۔ جس شخص کو بھوک لگتی ہو' جو کپڑے پہنتا ہو' سوتا ہو' جاگتا ہو' بیمار پڑتا ہو' خوشی اور غم کا احساس رکھتا ہو' وہ خدا کس طرح ہو سکتا ہے؟"

لڑکے کو پہلی بار کچھ عجیب باتیں سننے کو ملیں' کہنے لگا "جادوگر بھی اس کو رب کہتا ہے تو کیا یہ سب احمق لوگ ہیں؟"

راہب نے سمجھایا "معصوم لڑکے! افسوس کہ تُو نہیں جانتا کہ شرک کتنا بڑا گناہ ہے اور تم سب مرضِ شرک کے مریض ہو۔ پہلے اس مرض سے نجات حاصل کرو کیوں کہ یہ گناہ تمہاری روح کو کھا جائے گا اور اللہ کے ہاں اس کی بڑی پکڑ ہو گی۔"

لڑکے نے راہب کے پاس بہت زیادہ وقت خرچ کیا۔ اس نے سوچا کہ جب وہ یہاں سے ساحر کے پاس جائے گا تو وہ ضرور پوچھے گا کہ آج اسے اتنی دیر کہاں لگی؟

راہب نے پوچھا "اب تو کیا سوچ رہا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا "مجھ کو آپ کے پاس خاصی دیر ہو گئی۔ ساحر مجھ سے پوچھے گا کہ مجھے اتنی دیر کہاں لگی تو میں اس کو کیا جواب دوں گا؟"

راہب نے کہا "اب تو تجھے میرے پاس کافی وقت گزارنا ہو گا۔ صبح بھی اور شام کو بھی۔ تجھ سے بادشاہ بھی یہی پوچھے گا کہ تجھے کہاں دیر ہو گئی اور ساحر بھی پوچھے گا کہ تجھے دیر کہاں لگ گئی تو بادشاہ سے تجھے یہ کہنا ہو گا کہ جادوگر نے روک لیا تھا اور جادوگر سے یہ کہنا کہ بادشاہ نے روک رکھا تھا۔"

لڑکا مطمئن ہو گیا مگر اسے اعتراض ہوا کہ راہب اس سے جھوٹ بلوا رہا ہے۔ اس نے پوچھا "اب ذرا یہ بتائیں کہ آپ جو تعلیم دیتے ہیں اس میں جھوٹ کی کیا حیثیت ہے؟"

راہب نے کہا "جھوٹ بری چیز ہے مگر جس جھوٹ سے فتنہ دبانا مقصود ہو اور کسی کو نقصان بھی نہ پہنچے تو کبھی کبھی یہ جائز ہوتا ہے۔"

اس حق پرست راہب کی باتیں اسے بہت اچھی لگیں اور ابھی تک دل میں بادشاہ کے لیے جو...عزت واحترام تھا وہ دور ہو گیا۔ اب بادشاہ محض ایک معمولی آدمی تھا۔ سحری علوم بھی حقیر نظر آنے لگے اور خدا کا صحیح تصور اور صحیح عقیدہ اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوا۔

یہاں سے جب وہ ساحر کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا "تجھے اتنی دیر کہاں لگ گئی؟"

لڑکے نے جواب دیا "بادشاہ کی دربار داری میں۔"

جادوگر چپ ہو گیا اور پھر وہ لڑکے کو سحری علوم کا درس دینے لگا۔

لیکن جادوگر یہ محسوس کرتا رہا کہ اب لڑکے میں کچھ تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔

کئی گھنٹے جادوگر کے پاس گزار کے وہ پھر راہب کی کٹیا میں پہنچ گیا اور راہب اسے وحدانیت کا درس دیتا رہا۔ یہاں سے جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے بھی دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔

لڑکے نے جواب دیا "جادوگر کو اپنی زندگی کا اعتبار نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے سارے علوم جلد از جلد میرے سینے میں منتقل کر دے۔"

بادشاہ نے پوچھا "کچھ پتا ہے کہ ابھی اس میں کتنا وقت اور لگے گا؟"

لڑکے نے جواب دیا "جادوگر کہتا ہے کہ میں اسے زیادہ سے زیادہ وقت دیا کروں۔"

بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ تو وہ سارے علوم حاصل کر لے جن سے جادوگر نے دربار میں بلند پایہ مقام حاصل کیا ہے۔"

لڑکا ڈرتا بھی تھا کہ کہیں کٹیا میں آنے جانے کا راز جادوگر یا بادشاہ کو معلوم نہ ہو جائے۔

راہب نے لڑکے کو اللہ کے ناموں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کے صفاتی ناموں کے بارے میں راہب کا کہنا تھا کہ ان میں جادو سے زیادہ اثر ہے۔

لڑکے نے راہب سے چوری چوری بہت کچھ حاصل کر لیا۔ راہب نے اس کے یقین اور ایمان میں اتنا اثر پیدا کر دیا کہ وہ اللہ کے ناموں سے لوگوں کے امراض دور کر دیتا تھا۔

لوگوں کا یہ خیال تھا کہ لڑکے کے جادوئی علوم ان کے امراض دور کر دیتے ہیں۔ جادوگر بھی بہت خوش تھا کہ جو کچھ وہ نہیں کر سکا تھا' اس کا یہ شاگرد لڑکا انجام دے رہا ہے۔

بادشاہ کو بھی بتایا گیا کہ یہ لڑکا مجذوم اور مبروص کو جادو سے درست کر دیتا ہے۔

ابھی تک اس کے پاس جتنے مریض آئے تھے وہ سب شہری اور دیہی تھے۔ ان کا دربار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان سب کو اللہ کے ناموں کی تلقین کی گئی تھی اور یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ ناموں کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے کیوں کہ بادشاہ خود خدا بن بیٹھا ہے۔

دربار میں ایک نابینا کی بھی آمد و رفت تھی۔ اسے بھی جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکا حیرت انگیز جادوئی علاج کرتا ہے تو وہ بھی دربار کے باہر ملاقات کے منصوبے بنانے لگا کیوں کہ نابینا کو معلوم تھا کہ بادشاہ کبھی بھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کے درباری اس نو آموز جادوگر کو گھیرے رہیں اور آہستہ آہستہ لوگ اس لڑکے کو اپنا مرجع بنا لیں۔

ایک دن اس نابینا نے کہیں راستے میں اس لڑکے کو روک لیا اور کہا "تو نے بہتوں کو ٹھیک کر دیا ہے اب میری بینائی بھی بحال کر۔"

لڑکے نے کہا "میں تجھے جو عمل بتاؤں گا وہ عام اور مروجّہ نہیں ہے۔ جب تو بینا ہو جائے گا تو دوسرے درباری لوگوں کو یہی بتائے گا کہ میں نے تجھ کو جادو سے ٹھیک کر دیا ہے حالاں کہ جادو کی اللہ کے ناموں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔"

نابینا نے کہا "اگر جادو کے علاوہ کوئی ہنر تیرے پاس ہے اور تو اس سے لوگوں کو ٹھیک کر دیتا ہے تو تیرے اس دوسرے طریقۂ علاج سے بھی لوگوں کو واقف ہونا چاہیے اور بادشاہ کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تو جادوگر سے بھی بڑا صاحب کمال ہے۔"

لڑکے نے اللہ کے چند ناموں کا ورد اسے بتا دیا اور کہا "پانی کے چند قطروں پر اس کا ورد کر کے اس پانی کو آنکھوں سے لگا لیا کر۔ اللہ نے چاہا تو تیری بینائی بحال ہو جائے گی۔"

اس نابینا نے ان ناموں کا ورد شروع کردیا اور پانی آنکھوں سے لگانے لگا۔ کچھ عرصے بعد اسے ہلکی ہلکی روشنی محسوس ہونے لگی اور پھر دونوں آنکھوں کی بینائی بحال ہوگئی۔

اب اس شخص کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ اس لڑکے کے گن گاتا پھرتا تھا۔

بادشاہ کو بھی حیرت ہوئی کہ اس کا نابینا درباری آنکھوں والا کس طرح ہوگیا؟

یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور لڑکے کی شہرت دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ ایک روز یہ لڑکا راہب کے پاس سے اٹھ کے بادشاہ کے پاس جانے لگا تو راستے میں ایک عجیب و غریب بلا نمودار ہوئی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ یہ بلا ایک آزمائش تھی۔ اس نے سوچا "کیا یہ بلا جادو سے دفع ہو سکتی ہے یا اللہ کے ناموں کی برکت سے؟"

اس نے زیر لب کئی جادوئی عمل کیے مگر بلا نے راستہ نہ چھوڑا اور حائل رہی۔

آخر کار اس نے ایک پتھر اٹھایا اور اس پر اللہ کے ناموں کا ورد کرتا رہا اس کے بعد دم کرکے پتھر کھینچ کر بلا کو رسید کیا تو وہ غائب ہوگئی۔

اس نے اس عجیب و غریب واقعے کا ذکر راہب سے کیا تو راہب نے اس کو سمجھایا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اللہ تجھے آزمائش میں ڈالنے والا ہے۔ اگر میری بات سچ ہو جائے تو مجھ پر یہ مہربانی کرنا کہ بادشاہ کے سامنے میرا نام نہ لے لینا کیوں کہ میں نہ تو بادشاہ کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ درباری چکروں میں پڑنا چاہتا ہوں۔"

لڑکے نے جواب دیا "نہیں تو اب اتنا نڈر اور بے خوف ہوگیا ہوں کہ بادشاہ سے بالکل نہیں ڈرتا اور وہ دن دور نہیں جب میں... علی الاعلان کہہ دوں گا کہ جادو کوئی چیز نہیں۔ بادشاہ عاجز اور مجبور ایک بندہ ہے۔"

بینا ہو جانے والے درباری نے لڑکے کے اس ٹھکانے سے واقفیت حاصل کرلی تھی۔ وہ تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا اور حیرت سے کہا۔ "مجھے اندازہ تھا کہ تجھے یہ فیضان کہاں سے حاصل ہو رہا ہے۔ تو یہ ہے وہ جگہ جہاں سے تجھے وحدانیت کی تعلیم دی گئی اور تو اپنے عہد کا ایک باکمال لڑکا بن گیا۔"

راہب نے ان دونوں سے کہا "اگر تم لوگ نہیں مانتے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

درباری نے پوچھا "اگر اللہ کو آپ کا یہاں سے چلا جانا منظور نہ ہوا تو آپ کیا کریں گے؟"

راہب نے عذر پیش کیا "ہم تارک الدنیا لوگ دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔"

کچھ دن بعد بادشاہ نے اس بینا درباری کو بلوایا اور پوچھا "تیری دونوں آنکھوں کی بینائی کس طرح بحال ہوئی؟"

درباری نے صاف صاف کہہ دیا "اللہ کے ناموں کی برکت سے۔"

بادشاہ نے پوچھا "کیا مطلب؟ یہ اللہ کے نام کیا ہوتے ہیں؟ میں نے تو یہ سنا تھا کہ لڑکے نے تجھ کو جادو سے اچھا کردیا اور تو کسی کے ناموں کی برکت کا ذکر کر رہا ہے۔"

درباری نے جواب دیا "کسی کے ناموں کی برکت کا نہیں، میں اللہ کے ناموں کی برکت کا ذکر کر رہا ہوں یعنی خدا کے ناموں کی برکت۔"

بادشاہ نے پوچھا "کس خدا کے ناموں کی برکت؟ کیا یہاں میرے علاوہ بھی کوئی خدا ہے۔ میرے کتنے نام ہیں؟ ایک نام کے سوا یعنی... ذونواس۔ میں ہوں تم سب کا خدا۔"

درباری نے حقارت سے کہا "تجھے کس نے خدا بنا دیا۔ کم از کم میں تو دباؤ میں آنے کے بعد بھی تجھ کو خدا نہیں کہوں گا۔"

بادشاہ نے غصے میں کہا "کیا بکواس کرتا ہے۔ میں تجھ کو آگ میں ڈلوا دوں گا۔ کدھر ہے وہ لڑکا جس نے جادوئی علوم سیکھے ہیں؟"

اس لڑکے کو تلاش کرکے بادشاہ کے سامنے پہنچایا گیا۔

بادشاہ نے لڑکے سے پوچھا "میں کون ہوں؟"

لڑکے نے جواب دیا "بادشاہ ذونواس۔ نجران کا بادشاہ ذونواس۔"

بادشاہ نے غصے میں کہا "میں خدا ہوں، تم سب کا رب۔ تُو نے مجھے بادشاہ کہہ کے میرا مرتبہ گھٹا دیا۔ جانتا ہے خدا کا ایک جہنم بھی ہے اور تجھے نافرمان بندے کی طرح اس جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔"

لڑکے نے جواب دیا "تیرا جہنم عارضی ہوگا اور میرے خدا کا جہنم دائمی ہے۔ اگر مجھے اس جہنم میں ڈالنے کے بجائے تیرے جہنم میں ڈال دیا جائے گا تو خدا ہمیں اس مستقل جہنم سے بچائے گا۔"

بادشاہ نے نئے بینا درباری سے پوچھا "جو تم دونوں کا عقیدہ ہے اس عقیدے پر اور کتنے لوگ چل رہے ہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا "وہ تمام صحت یاب لوگ جو اللہ کے ناموں کی برکت سے شفایاب ہوچکے ہیں۔"

بادشاہ نے غصے میں چیخ کر کہا "ان سب کو گرفتار کیا جائے۔"

اور اس حکم پر آناً فاناً عمل درآمد ہوا اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ان سب کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا۔

جادوگر بھی حیران تھا کہ لڑکے کو یہ کون سے دوسرے جادوئی علوم حاصل ہوگئے؟ اس راہب کو تلاش کیا گیا جس نے بادشاہ کی تحقیقات کے مطابق نجران میں فتنے کا بیج بویا تھا۔

بادشاہ نے لڑکے کو بہلانا پھسلانا چاہا۔ اسے تخلیے میں بلوایا اور اس سے کہا "تو نے بزرگ ساحر سے کتنے عجیب و غریب جادو حاصل کرلیے کہ مجذوم اور مبروص تک تیرے جادو سے صحت یاب ہوگئے اور نابینا آنکھوں والا ہوگیا جب کہ بزرگ ساحر نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی ایسا کمال نہیں دکھایا۔"

لڑکے نے جواب دیا "جادوگر کے پاس ایسے علوم کہاں جو نابینا کو بینا کردے اور مجذوم اور مبروص صحتیاب ہوجائیں' ان کا جادوئی علوم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا "تب پھر تو کس طرح یہ کمالات دکھا رہا ہے کہ بڑا ساحر حیران اور پریشان ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا "اے بادشاہ! پہلے تو وعدہ کر کہ میں جو کچھ بتاؤں گا اس سے مجھے تیری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

بادشاہ نے وعدہ کیا "پورا ملک جانتا ہے کہ میرے دربار میں جو بھی ہے' مجھ سے فیض اٹھاتا ہے۔ یہاں ساحروں کو بھی نوازا گیا اور دوسرے خدمت گزاروں کو بھی۔ تیرے اس عجیب و غریب جادوئی علم کی وجہ سے تجھ کو بھی نوازا جائے گا۔ بس سچ سچ بتادے کہ تجھ کو یہ علم کس سے' کب اور کس طرح حاصل ہوا؟"

لڑکے نے جواب دیا "اے بادشاہ! پہلے تو تجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے ایسا کوئی جادو نہیں آتا جس سے خطرناک امراض کا علاج کیا جائے اور نابیناؤں کو بینائی بخشی جائے کیوں کہ بوڑھے ساحر کو بھی کوئی اس قسم کا جادو معلوم نہیں ہے۔"

بادشاہ نے تنگ آکے درشت لہجے میں کہا "لڑکے! میں تجھ سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا صحیح جواب دے۔ ہمیں تو جادوئی علوم کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ ان سے محیر العقول کام لیے جاسکتے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جادوئی علوم پر بھی سبقت رکھنے والے وہ کون سے علوم ہیں جن سے ہمارا بزرگ ساحر واقف نہیں اور تو اپنی کم عمری کے باوجود ان سے واقف ہوگیا ہے۔"

لڑکے نے محسوس کیا کہ اب وہ حق کو مزید نہیں چھپا سکتا اور بادشاہ کو مسلسل مغالطے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اس نے جواب دیا "اے بادشاہ! یہ جو کچھ میرے ذریعے سے سرزد ہورہا ہے اس کا میری ذات اور میرے کسی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میرے رب کی طرف سے ہے۔ میرے رب کو میرے ایمان کا شہرہ مقصود ہے۔ وہ مجھ سے کام لے رہا ہے اور میں بہ تائید ایزدی وہ سب کررہا ہوں جس پر میری عقل بھی حیران ہے۔ یہ میرے رب کا فیضان ہے جس پر تو حیران ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا "تو کس رب کی بات کررہا ہے کیا میرے علاوہ بھی تیرا کوئی رب ہے؟"

لڑکے نے دلیری سے جواب دیا "تو صرف بادشاہ ہے' کسی کا رب نہیں۔ میرا رب تو سارے جہاں کا رب ہے۔ اسی نے یہ دنیا اور کائنات بنائی۔ سورج' چاند اور ستارے بنائے۔ وہی بارشیں برساتا ہے' وہی فصلیں اگاتا ہے۔ اسی نے چیزوں میں خواص پیدا کیے ہیں اور اسی کے حکم سے دوائیں کام کرتی ہیں اور مریض صحت یاب ہوجاتا ہے۔"

بادشاہ آگ بگولا ہوگیا "لڑکے! معلوم نہیں تو کس رب کی باتیں کررہا ہے جب کہ تم سب کا رب میں ہوں۔ تجھ کو یہ فضول باتیں کس نے سکھائیں۔ میرے دربار میں ایک بھی شخص ایسا نہیں جو اس قسم کی باتیں کرتا ہو اور رہ گیا بوڑھا جادوگر تو اس نے آج تک ایسی کوئی بات نہیں کی۔ تو خود ابھی کمسن لڑکا ہے اور تیری عقل خام ہے۔ سچ سچ بتا کہ تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟"

لڑکے نے جواب دیا "جب میں جادوگر سے جادوئی علم حاصل کرنے جاتا تھا تو ایک دن مجھے ویرانے میں ایک کٹیا نظر آئی۔ مجھے جستجو ہوئی کہ آبادی سے دور' اس ویرانے میں کون کٹیا بنا کے رہتا ہے۔ میں نے کٹیا میں جھانک کے ادھر اُدھر دیکھا اور جب وہاں کوئی نظر نہ آیا تو میں کٹیا کے اندر داخل ہوگیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا 'لڑکے' کس کی تلاش ہے؟'

"میں نے دیکھا۔ میرے سامنے ایک بزرگ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی اور اس کی باتوں میں مٹھاس تھی۔ میں نے اس سے پوچھا 'آپ یہاں اس ویرانے میں کیوں رہتے ہیں؟'

"اس بزرگ نے جواب دیا 'اس کفرستان میں اپنے رب کا نام لینے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔'

"اسی روز مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ بادشاہ رب نہیں ہوتا۔ حقیقی رب کوئی اور ہی ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آتا مگر وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے مظاہر اور جلوے ہر شے میں موجود ہیں۔

"اے بادشاہ! رب کا یہ عجیب و غریب علم مجھے اسی بوڑھے سے حاصل ہوا اور میں پابندی سے اس کی صحبت میں رہنے لگا۔ جادوگر کے پاس جاتے ہوئے اور شام کو واپس آتے ہوئے میں راہب کی کٹیا میں ضرور جاتا ہوں۔ میں اس سے علم وحدانیت حاصل کرتا ہوں اور میرا ایمان مضبوط ہے۔ میرے رب نے میری زبان میں تاثیر دے دی۔ میری دعائیں قبول ہونے لگیں۔ میرے پاس بیمار آنے لگے اور میں اپنے رب کے صفاتی ناموں سے آنے والے بیماروں کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ اللہ نے میری دعائیں قبول کیں اور مریض اچھے ہونے لگے یہاں تک کہ اسی طرح درباری نابینا کو بینائی مل گئی۔"

بادشاہ نے پوچھا "کیا وہ سب جو تیری دعاؤں سے صحت یاب ہوئے اسی رب پر ایمان رکھتے ہیں جسے انہوں نے دیکھا تک نہیں ہے؟"
لڑکے نے جواب دیا "بیشک! وہ سب ایمان والے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو تیری جھوٹی ربوبیت کا قائل ہو۔"
بادشاہ نے نئی نئی بینائی پانے والے درباری کو بھی تخلیے میں طلب کرلیا۔ جب وہ آگیا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا "تجھ کو بینائی کس سے ملی تھی؟"
درباری نے جواب دیا "اپنے اس رب سے جو کہیں نظر نہیں آتا اور وہ تیرا بھی رب ہے۔"
بادشاہ نے لڑکے کو برا بھلا کہا "یہ سب تیرا پھیلایا ہوا فتنہ ہے اور رہ گیا وہ راہب جس نے تجھے خراب کیا تو کچھ دیر بعد وہ بھی آجائے گا اور پھر میں دیکھوں گا کہ اسے تمہارا رب۔ ۔ ۔ کس طرح بچاتا ہے۔"
اس کے بعد بادشاہ نے اپنا دربار منعقد کیا اور اسی دربار میں راہب کو رسیوں سے جکڑ کر پیش کردیا گیا۔
اب بادشاہ نے اعلان کیا "لوگو! یہ راہب کہتا ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے اور اس نے اس لڑکے کو بھی گمراہ کردیا۔ اس لڑکے نے بہت سے بیماروں کو اپنے جادوئی علوم سے صحت یاب کردیا اور ان سب نے میری ربوبیت سے انکار کیا اور نامعلوم اَن دیکھے رب کی عبادت کرنے لگے۔ اس طرح یہ سب گمراہی میں مبتلا ہوگئے۔ آج میں اس راہب سے کہوں گا کہ یہ خود کو میرے عذاب سے بچا سکے تو بچالے۔"
راہب نے کہا "اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تیرا کوئی عذاب مجھے گمراہ کرسکتا ہے تو آزما کے دیکھ لے۔ میں نے اس لڑکے سے کہہ دیا تھا کہ عنقریب تو آزمائش میں ڈالا جائے گا سو وہ گھڑی آن پہنچی اور مجھے بھی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں اس آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔"
بادشاہ نے حکم دیا "راہب کو آرے سے چیر دیا جائے۔"
راہب نے لڑکے کو منع کیا "بیٹے خبردار! میرے لیے کوئی دعا نہ کرنا۔ میں آزمائش میں ڈالا گیا ہوں بس یہ دعا کر کہ میں اس آزمائش میں پورا اتروں۔"
راہب اپنے رب کو یاد کرتا رہا اور جلادوں نے آرے سے راہب کو چیر ڈالا۔
درباریوں پر اس کا بڑا اثر ہوا اور بادشاہ نے لڑکے سے کہا "بتا تیرے رب نے راہب کو میرے عذاب سے کیوں نہیں بچایا؟"
لڑکے نے جواب دیا "یہ اس کا امتحان تھا اور مجھے منع کردیا گیا تھا کہ میں خاموش ہوجاؤں اور راہب کو اس آزمائش سے گزر جانے دوں ورنہ میرا رب تو ہر شے پر قادر ہے۔"
بادشاہ نے غصے میں حکم دیا "یہ لڑکا یوں نہیں مانے گا اسے بھی سزا ملنی چاہیے۔"
لڑکے نے جواب دیا "بادشاہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے میرے رب نے منع نہیں کیا کہ میں اس آزمائش کی گھڑی میں خاموش رہوں اور اس سے مدد نہ چاہوں تو مجھے کوئی سزا نہیں دے سکتا۔"
بادشاہ نے لڑکے کو ایک موقع دیا "میں تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔ تو چاہے تو اپنے اَن دیکھے رب پر سے اپنا ایمان اور دھیان ہٹا دے اور مجھے اپنا رب مان لے۔ تجھے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔"
لڑکے نے جواب دیا "اے بادشاہ! جو تیرے جی میں آئے وہ کر لیکن میں اپنے رب سے منہ نہیں موڑ سکتا۔"
بادشاہ نے اپنے آدمی کو حکم دیا "اس لڑکے کو پہاڑی پر لے جا کر کسی کھڈ میں پھینک دو۔"
بادشاہ کے آدمی لڑکے کو پہاڑی پر لے گئے۔
لڑکے نے راستے میں دعا کی "اے میرے رب! مجھے ان کے شر سے بچا اور میرے ذریعے سے اپنی ربوبیت کی ہلکی سی جھلک ان سب کو بھی دکھا دے۔"
جب یہ لوگ لڑکے کو پہاڑی پر لے گئے تو وہاں زلزلے کی کیفیت پیدا ہوگئی اور بادشاہ کے آدمی جگہ جگہ سے پھٹ جانے والی پہاڑی میں دفن ہونے لگے۔ آخر میں اس لڑکے کے سوا کوئی زندہ نہ بچا۔
لڑکا سیدھا بادشاہ کے پاس گیا اور اس سے کہا "دیکھ بادشاہ! میرے رب نے مجھے بچالیا۔ تیرے آدمی پہاڑی میں دفن ہوگئے۔ میرا رب ہر شے پر قادر ہے۔ تو اپنے آدمیوں کو اگر اپنی ربوبیت کی قدرت سے جلا سکتا ہے تو جلا کے دکھا۔"
بادشاہ نے اپنے دوسرے آدمیوں کو حکم دیا "اس گستاخ لڑکے کو دریا میں لے جا کر ڈبو دو۔"
بادشاہ کے کارندے لڑکے کو دریا کی طرف لے چلے تو لڑکے نے دل ہی دل میں دعا کی "اے میرے رب! جس طرح تو نے مجھے پہلے پہاڑی پر بچایا تھا اسی طرح پانی سے بچا۔"
یہ لوگ لڑکے کو کشتی میں بٹھا کے بیچ دریا میں لے گئے اور خود دوسری کشتی میں بیٹھ گئے نکلنے سے پہلے انہوں نے لڑکے کی کشتی میں سوراخ کردیے تاکہ کشتی میں پانی بھر جانے کے بعد کشتی ڈوب جائے اور لڑکا مر جائے۔

لیکن لڑکے کی کشتی تو محفوظ رہی مگر بادشاہ کے کارندوں کی کشتی بھنور میں پھنس گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی تہ میں بیٹھ گئی' لڑکے کی کشتی کنارے سے جا لگی اور یہ اتر کے بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور بادشاہ سے کہا "دیکھ! میرے رب نے مجھے پھر بچالیا اور تیرے آدمی دریا میں ڈوب گئے۔ اب بھی وقت ہے کہ میرے رب پر ایمان لے آ' تو خود سوچ کہ تو کیسا رب ہے جسے کچھ دیر پہلے تک یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تیرے سارے آدمی دریا کی تہ میں چلے گئے اور مر گئے۔"

بادشاہ پریشان تھا کہ ذرا سا لڑکا اس کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ ابھی بادشاہ نے کوئی نیا حکم نہیں دیا تھا کہ لڑکے کو الہام ہوا "اب تو خاموش ہو جا اور بادشاہ کو خود بتا کہ وہ تجھے کس طرح قتل کرے کہ تو قتل ہو جائے۔"

لڑکے نے کہا "اے میرے رب! میری موت میں کیا فائدے مضمر ہیں؟"

جواب ملا "جو فائدے مضمر ہیں وہ تیری موت کے بعد ظاہر ہوں گے مگر وہ تجھے نہیں بتائے جائیں گے اور تجھے یہ سوال کرنا بھی نہیں چاہیے۔"

لڑکے نے رضائے الٰہی کے بموجب بادشاہ سے کہا "اے بادشاہ! تو میری موت پر قادر نہیں ہے۔ مجھے تجھ پر رحم آرہا ہے اب مجھ سے سن کہ میں کس طرح قتل کیا جاسکتا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا "بتا تو کیا چاہتا ہے اور میں کیا کروں کہ تو میرے حکم کے بموجب قتل ہو جائے؟"

لڑکے نے کہا "میرے گھر سے میری کمان اور ترکش منگوا۔"

بادشاہ نے دونوں چیزیں فوراً منگوالیں اور لڑکے سے پوچھا "ہاں۔ اب بتا اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

لڑکے نے خواہش ظاہر کی "تو شہر میں اعلان کروا دے کہ پوری آبادی بلند جگہ پر جمع ہو جائے' ان کی موجودگی میں تو مجھے ایک درخت پر سُولی دے دے اور اطمینان کرنے کے لیے میرے ترکش سے تیر نکال کر خود میرا نشانہ لے۔ تیر بہ آوازِ بلند دم کر "بسم اللہ رب الغلام" (اللہ کے نام پر جو اس غلام کا رب ہے)

لڑکے نے بادشاہ کو یقین دلایا "اگر تو نے اسی طرح کیا جس طرح میں نے بتایا ہے تو میں قتل ہو جاؤں گا' اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ تو مجھے ہلاک کرے۔"

بادشاہ کو حیرت تھی کہ لڑکے نے اپنے قتل کی ترکیب بتادی تھی۔ اس سے لڑکے کو کیا فائدہ پہنچے گا' بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ اب بادشاہ نے حکم دیا کہ اس عجیب و غریب رب کو ماننے والے لڑکے کے قتل کا نظارہ کرنے کے لیے پورا شہر اونچے اونچے ٹیلوں پر جمع ہو جائے اور دیکھے' بادشاہ ذونواس کی ربوبیت کا منکر کس طرح مارا جاتا ہے۔

شہر والے جمع ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹیلوں پر گنجائش نہ رہی۔

لڑکا بھی یہ منظر دیکھ رہا تھا اور بہت خوش تھا۔ جب بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ ایک بھی شخص شہر میں موجود نہیں رہا ہوگا تو لڑکے کو ایک درخت کے پاس ایسے کھڑا کر دیا گیا کہ اس کے سر پر ایک رسی لٹک رہی تھی۔ یہ رسی اس کے گلے میں ڈال دی گئی اور بادشاہ تیر کمان لے کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا پھر اس نے بہ آوازِ بلند کہا "بسم اللہ رب الغلام۔"

بادشاہ کی یہ آواز سبھی نے سنی اور بادشاہ کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ لڑکا بادشاہ کے حکم سے نہیں' اللہ کے نام سے قتل ہو رہا ہے۔

بادشاہ نے کمان سے تیر جوڑا اور کھینچ کر چھوڑ دیا۔

تیر لڑکے کے گلے میں پیوست ہو گیا اور لڑکا جاں بحق ہو گیا۔

ٹیلوں پر موجود لوگوں نے بہ آوازِ بلند اعلان کیا "آمنّا برب الغلام۔ آمنّا برب الغلام" (ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے)

ایک درباری نے بادشاہ سے کہا "اے بادشاہ! تجھے جس بات کا خوف تھا' آخر وہی ہو کر رہا۔ تو نے خود ہی اقرار کیا کہ پروردگار کے حکم سے لڑکے کی موت واقع ہوئی۔ تیری رعایا نے تیری ربوبیت سے انکار کر دیا اور وہ سب پروردگارِ عالم پر ایمان لے آئے' لڑکے نے تجھے جو ترکیب بتائی تھی تو اس وقت تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس میں اللہ کی کیا مصلحت پنہاں تھی۔ تیرے ہاتھوں پروردگارِ عالم کے حکم سے لڑکا تو مر گیا مگر تیری رعایا کو ایک رب کے ایمان پر قائم کر گیا۔ اب کوئی بھی تیری ربوبیت کا قائل نہیں ملے گا۔"

بادشاہ کو غصہ آیا اور حالتِ اشتعال میں کہا "یعنی مجھ سے دھوکا کیا گیا اور مجھ سے اَن دیکھے پروردگارِ عالم کا اقرار کروایا گیا۔ میں ان سب کو ہلاک کروا دوں گا۔ میرے غضب سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔"

اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر بھر کے محلوں اور گلی کوچوں میں خندقیں کھودی جائیں۔

ہر ہر محلے اور ہر ہر گلی اور کوچے میں خندقیں کھدنے لگیں اور جب یہ کام مکمل ہوا تو بادشاہ نے نیا حکم دیا "ان خندقوں میں آگ دہکائی جائے۔"

بڑے بڑے لکڑی کے کندے خندقوں میں ڈالے گئے اور ان میں آگ لگا دی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر جہنم زار بن گیا۔ محلّے کے

لوگ آگ کی تپش سے بچنے کے لیے محلّوں سے نکل گئے مگر کچھ ہی دیر بعد بادشاہ کا نیا حکم پہنچا کہ محلّوں اور گلی کوچوں کے لوگ اپنے اپنے علاقوں کی خندقوں کے پاس پہنچ جائیں۔

لوگوں نے بادشاہ کا یہ حکم بھی مان لیا اور دہکتی ہوئی خندقوں کے پاس پہنچ گئے۔

اب بادشاہ نے نیا فرمان جاری کیا "جو میرے رب ہونے کا اقرار باللسان کرے اسے معاف کردیا جائے اور پناہ کی جگہ پر پہنچا دیا جائے۔ جو انکار کرے اور اُن دیکھے پروردگارِ عالم پر ایمان رکھتا ہو' اسے خندقوں میں ڈال دیا جائے۔"

اور کچھ دیر بعد یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ شہری آبادی کے کسی ایک آدمی نے بھی بادشاہ کی ربوبیت کا اقرار نہیں کیا۔ وہ سب پروردگارِ عالم کے رب ہونے کا اقرار کرتے رہے اور بادشاہ کے آدمی ان کو خندقوں میں ڈالتے رہے۔

اسی ہجوم میں ایک عورت اپنے ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ دہکتی ہوئی خندق کے پاس لائی گئی۔ یہ اپنے بچے کی خاطر مذہب سے منکر ہو جانا چاہتی تھی اور بادشاہ کی ربوبیت کا اقرار کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں محسوس کررہی تھی کہ اچانک بچے نے ماں سے کہا۔ "اے ماں! اقرار کر کہ تو اپنے رب پر یقین رکھتی ہے۔ بادشاہ محض انسان ہے' کسی کا رب نہیں۔"

عورت نے اعلان کیا اور بچے کو لے کر آگ میں کود گئی۔ اس کی آواز دیر تک فضا میں گونجتی رہی "پروردگارِ عالم کے نام پر' پروردگارِ عالم کے لیے اور پروردگارِ عالم کی خاطر میں اس گمراہ بادشاہ کی ربوبیت سے انکار کرتی ہوں" اور یہ دونوں بھی جل گئے۔

بادشاہ کے ملازمین بھی آہستہ آہستہ پروردگارِ عالم کے قائل ہوتے جارہے تھے۔

ذونواس بادشاہ اور اس کے لوگ اصحاب الاخدود کے نام سے مشہور ہوئے۔



انہی واقعات کو کچھ فرق اور ناموں کی تفصیل کے ساتھ اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے۔

شام اور حجاز کے درمیان نجران نام کی ایک بستی ہے۔ یہاں کے باشندے بت پرست اور مشرک تھے۔ اس بستی کے قریب ہی ایک ساحر رہتا تھا۔ یہ ساحر بستی کے لڑکوں کو جادو کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس کے گھر پر بڑی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا اور پھر خدا نے ان مشرکوں کی اصلاح کے لیے ایک اور ہی فیصلہ کیا۔ نجران اور ساحر کے درمیان ویرانے میں ایک راہب نے سکونت اختیار کی۔ راہب اپنے ساتھ ایک پرانا بوسیدہ خیمہ لایا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نصب کیا اور خیمے میں بیٹھ کے اللہ اللہ کرنے لگا۔ اس راہب کا نام فیمون تھا۔

جو لڑکے جادو کا علم حاصل کرنے ساحر کے پاس جاتے تھے وہ اسی خیمے کے پاس سے گزرتے تھے مگر کوئی بھی لڑکا اس خیمے پر توجہ نہیں دیتا تھا لیکن ایک دن عبداللہ بن تامر نامی ایک لڑکے نے راہب کے خیمے کو توجہ سے دیکھا اور پھر خیمے میں جھانکنے لگا۔

راہب فیمون نے عبداللہ بن تامر کو جھانکتے دیکھا تو اسے اندر بلالیا اور پوچھا "تو کیا دیکھ رہا تھا؟"

عبداللہ بن تامر نے جواب دیا "میں دیکھ رہا تھا کہ اس بوسیدہ خیمے میں آبادی سے دور' تنہا کون شخص رہتا ہے اور کس طرح زندہ ہے۔"

راہب فیمون نے پوچھا "شاید تو ہر روز ادھر سے گزرتا ہے۔ تو کہاں جاتا ہے؟"

عبداللہ بن تامر نے جواب دیا "یہاں سے کسی قدر فاصلے پر ایک ساحر رہتا ہے۔ نجران کے لڑکے وہاں جادو کا علم حاصل کرنے جاتے ہیں' میں بھی ہر روز ساحر کے پاس جاتا ہوں۔"

راہب فیمون نے پوچھا "جادو کا علم حاصل کر کے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

عبداللہ بن تامر نے جواب دیا "بزرگوار! اتنی عمر ہونے کو آئی اور آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ جادو سے انسان کو کیا فائدے پہنچتے ہیں؟"

راہب نے جواب دیا "اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تو تم کیا کرو گے؟"

عبداللہ بن تامر نے جواب دیا "تب پھر میں جادو کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کروں گا کیوں کہ جب دو باتیں کرنے والوں میں سے ایک موضوعِ متعلقہ سے لاعلم ہو تو پھر خاموشی ہی بہتر ہے۔"

راہب فیمون نے عبداللہ بن تامر کو سمجھایا "لڑکے! جادو بہت معمولی چیز ہے۔ مجھے اللہ کے ناموں میں بڑی برکت نظر آتی ہے۔ انہی ناموں میں ایک اسمِ اعظم بھی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ یہ اسمِ اعظم ہے تو وہ اس سے بڑے کام لے سکتا ہے۔ سارے جادو اس ایک نام کے مقابلے میں بیکار اور ہیچ ہیں۔"

عبداللہ بن تامر نے راہب فیمون کو غور سے دیکھا اور کچھ ایسا لگا جیسے عبداللہ بن تامر کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔

راہب فیمون نے کہا "تو میری شکل کیا دیکھ رہا ہے؟ تیرا ابھی تک اللہ کے ناموں سے واسطہ تو پڑا نہیں۔ جب پڑے گا تو خود اسمِ اعظم کے اثرات محسوس کرلے گا۔"

عبداللہ بن تامر نے خواہش ظاہر کی "اگر میں اسم اعظم سیکھنا چاہوں تو کیا آپ مجھے سکھادیں گے؟"
راہب فیمون نے جواب دیا "بہت مشکل ہے، جس دماغ میں سفلی اور جھوٹے علم نے جگہ بنالی ہو وہاں اللہ کے پاک ناموں کے لیے گنجائش نہیں رہتی اور اسم اعظم تو بہت بڑی چیز ہے۔"
عبداللہ بن تامر نے کہا "تب پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا کچھ وقت آپ کی صحبت میں گزارا کروں۔"
راہب نے اجازت دے دی اور کہا "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ لوگوں کی گمراہی دور ہو۔ اللہ کے بندے شرک اور بت پرستی سے کنارہ کشی اختیار کریں۔"
عبداللہ بن تامر کو راہب فیمون کے خیمے میں اٹھنے بیٹھنے کی اجازت مل گئی اور وہ ہر روز پابندی سے وہاں پہنچنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کا ایسا دل لگا کہ سحر اور ساحری کی طرف سے پھر گیا یہاں اسے اللہ کے بہت سے نام بتائے گئے۔ ان کی صفات سے آگاہ کیا گیا۔
عبداللہ بن تامر کو اسم اعظم کی جستجو تھی لیکن راہب فیمون ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔ ایک دن عبداللہ بن تامر نے ضد کی کہ وہ اسم اعظم معلوم کرکے رہے گا مگر راہب نے یہ کہہ کے ٹال دیا "میں تجھے اسم اعظم بتا تو سکتا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ تو اس کو برداشت نہیں کرسکے گا کیوں کہ میں تجھ کو کمزور پاتا ہوں۔"
عبداللہ بن تامر نے ایک دم سکوت اختیار کیا اور اٹھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، جب آپ مجھے اس لائق سمجھیں کہ میں اسم اعظم کے لائق ہوگیا ہوں اور مجھ میں وہ کمزوری باقی نہیں رہی جو ابھی آپ کو نظر آرہی ہے تو اسم اعظم سے مجھے آگاہ کردیجئے گا۔"
اب عبداللہ بن تامر راہب فیمون کے بخشے ہوئے دینی علوم کا انتہائی لائق عالم بن چکا تھا۔
عبداللہ کا باپ تامر ان واقعات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا بیٹا عبداللہ جادوگر سے سحری علوم حاصل کررہا ہے۔
عبداللہ بن تامر کچھ عرصے اور خاموش رہا۔ اس کا خیال تھا کہ راہب اس کو ایک نہ ایک دن اسم اعظم سے آگاہ کردے گا۔ لیکن اچانک اسے احساس ہوا کہ راہب بخل سے کام لے رہا ہے اور وہ کبھی بھی اسم اعظم سے عبداللہ کو آگاہ نہیں کرے گا۔
آخر عبداللہ نے اسم اعظم کو جاننے کی ایک ترکیب سوچی۔ اس نے تیروں کا ایک گٹھا اٹھایا اور ہر تیر پر اللہ کا ایک نام لکھ دیا۔
اس نے تمام تیروں پر اللہ کا ایک ایک نام لکھنے کے بعد آگ جلائی اور تیروں کو ایک ایک کرکے آگ میں ڈالنا شروع کردیا اور یہ تیر آگ میں جلتے چلے گئے مگر ایک تیر جیسے ہی آگ میں ڈالا گیا وہ اچھل کر آگ کے باہر ہوگیا۔
عبداللہ نے اس تیر کو دوبارہ آگ میں ڈالا تو یہ پھر آگ سے باہر آگیا۔
اب عبداللہ نے اپنا عمل موقوف کیا اسے یقین ہوگیا کہ اس تیر پر لکھا ہوا نام اسم اعظم ہے۔
عبداللہ بن تامر اس تیر کو لے کر راہب کے پاس گیا اور اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے راہب کو بتایا۔ "میرا خیال ہے اس نام کو آگ اس لئے نہیں جلا سکی کہ یہ اسم اعظم ہے۔"
راہب نے تیر پر لکھے ہوئے نام کو دیکھا اور عبداللہ بن تامر کی کوششوں کی داد دی۔ "جب تو نے اسم اعظم معلوم ہی کرلیا ہے تو اب اس کی حفاظت کرتے رہنا۔ دوسروں تک یہ نام نہ پہنچے۔"
عبداللہ بن تامر نے اسم اعظم کا تجربہ کیا اور ایک مجذوم سے کہا "میں تجھے اچھا کرسکتا ہوں مگر تجھے پہلے اپنے آبائی دین کو چھوڑنا پڑے گا اور دین حق اختیار کرنا ہوگا۔"
زمانے بھر کا ستایا ہوا مجذوم آمادہ ہوگیا کہ اگر اس موذی اور ذلیل مرض سے نجات مل جائے تو وہ اپنے آبائی دین کو ترک کردے گا اور عبداللہ بن تامر کے بتائے ہوئے دین کو اختیار کرلے گا۔
عبداللہ بن تامر نے اسے اپنے دین میں داخل کرلیا اور پھر اسم اعظم کے حوالے سے اللہ سے دعا کی۔
مجذوم چند دنوں میں صحت یاب ہوگیا اور اس نے ہر طرف عبداللہ بن تامر کا چرچا شروع کردیا۔ جن لوگوں نے اس مجذوم کو بیماری کی حالت میں دیکھا تھا اور اب اسے بالکل صحت مند دیکھ رہے تھے، وہ حقیقت حال جاننے کے لیے بے چین ہوگئے اور دوسری طرف بیماروں نے عبداللہ بن تامر کا رخ کیا۔ ان میں اکثریت ان مریضوں کی تھی جن کے مرضوں کا کہیں کوئی علاج نہ تھا۔
مریض صحت یاب ہونے لگے تو پوری آبادی میں عبداللہ بن تامر توجہ کا مرکز بن گیا۔
لوگ بس یہ جان سکے کہ جب کوئی حاجت مند عبداللہ بن تامر سے ملتا ہے تو عبداللہ بن تامر پہلے اسے اپنے مذہب میں داخل کرتا ہے اور پھر اس کے حق میں دعا کرتا ہے جو قبول ہو جاتی ہے۔
ہر طرف عبداللہ بن تامر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے آبائی اور مقامی مذہب کو ترک کررہے تھے۔
آبادی کے وہ لوگ جنہیں عبداللہ بن تامر کی مدد کی کوئی ضرورت نہ تھی انہیں عبداللہ بن تامر کا یہ رویہ پسند نہ آیا اور انہوں نے عبداللہ کے باپ تامر سے شکایت کی "اپنے بیٹے کو سنبھالو جس نے اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیا اور کسی اجنبی دین کو اختیار کرلیا۔ ...اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے نئے دین کی تلقین کرے اور اپنے آبائی دین کی تضحیک کرتا رہے۔"

تامر نے لوگوں سے کہا "کوئی شخص بھی اپنے آبائی دین کو آسانی سے نہیں چھوڑتا اور اگر چھوڑتا ہے تو اس نئے دین میں کوئی غیر معمولی بات ضرور دیکھتا ہے۔"

لوگوں نے دھمکی دی "دیکھو تامر! ہم فضول بحث و مباحثہ تو نہیں کریں گے۔ اپنے بیٹے سے کہو کہ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیے۔"

تامر نے جواب دیا "تم لوگ یہ تو دیکھو کہ میرے بیٹے کی دعاؤں نے کتنے ہی لاعلاج مریضوں کو صحت یاب کر دیا۔ اب اگر وہ میرے بیٹے عبداللہ کے دین میں برضا و رغبت داخل ہو جاتے ہیں تو کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

لوگوں کو تامر کے اس رویّے میں بے جا طرفداری محسوس ہوئی۔ انہوں نے دھمکی دی "ہم اگر خود تیرے بیٹے کو باز نہ رکھ سکے تو ہمیں بادشاہ کو اس کی طرف متوجہ کرنا پڑے گا اور پھر بادشاہ تم لوگوں کے ساتھ جو سلوک کرے گا وہ تم خود سمجھ سکتے ہو۔"

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد تامر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو سمجھایا "بیٹے! بستی کے لوگ تیرے خلاف ہیں اور اب وہ بادشاہ کے پاس جانے والے ہیں۔"

عبداللہ نے ثابت قدمی سے کہا "جاتے ہیں تو جائیں۔ اس کا مجھ پر کیا اثر پڑے گا۔ انہیں نہیں معلوم کہ بادشاہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

عبداللہ نے اپنا کام جاری رکھا۔ مریض آتے رہے' نیا دین اختیار کرتے رہے اور صحت یاب ہوتے رہے۔

آخر عبداللہ کے مخالف بادشاہ کے کان بھرنے لگے۔

بادشاہ خود بھی عبداللہ کی شکایتیں اپنے معتبر آدمیوں سے سن چکا تھا اور اب اسے یہ باور کرایا گیا کہ اگر بادشاہ نے عبداللہ پر فوری توجہ نہ دی تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بادشاہ نے فرمان جاری کیا "عبداللہ بن تامر فوراً بادشاہ سے ملے اور بتائے کہ وہ لوگوں کے آبائی دین کے خلاف کیوں کام کر رہا ہے؟"

عبداللہ نے بے خوف و خطر بادشاہ سے ملاقات کی۔

بادشاہ نے اس نڈر نوجوان کو بے تکلفی سے دربار میں کھڑا دیکھا تو خشمگیں لہجے میں دریافت کیا "یہ تو نے کیسا فتنہ کھڑا کر دیا ہے کہ تیری شکایتیں میرے پاس آنے لگی ہیں؟"

عبداللہ نے جواب دیا "میں نے کوئی فتنہ نہیں کھڑا کیا۔ میں تو صرف بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کر رہا ہوں۔ اب اگر لوگ اسے فتنہ کہتے ہیں تو یہ ان کی عقل اور سمجھ کا قصور ہے۔"

بادشاہ نے کہا "لوگوں نے تیرے بارے میں ہمیں بتایا ہے کہ تو نیا دین پھیلا رہا ہے اور باپ دادا کے دین کو جھٹلا رہا ہے۔"

عبداللہ نے جواب دیا "میں حق کو عام کر رہا ہوں اور آبائی جھوٹ کو ختم کرتا جا رہا ہوں۔ بادشاہ کو اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

بادشاہ نے حکم دیا "مگر آج سے تجھ پر پابندی عائد کی جاتی ہے کہ تو کسی کو نہیں ورغلائے گا اور لوگوں کو اپنے آبائی دین پر قائم رہنے دے گا۔"

عبداللہ نے بادشاہ سے پوچھا "اگر میں بادشاہ کی بات نہ مانوں تو؟"

بادشاہ نے جواب دیا "تو تجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

عبداللہ نے پوچھا "مجھے کون اور کس کے حکم سے قتل کرے گا؟"

بادشاہ نے کہا "حکم میرا ہو گا اور قتل جلاد کرے گا۔"

عبداللہ نے حقارت سے کہا "غلط' مجھے بادشاہ کے حکم سے قتل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ میرے اللہ نے بادشاہ کو میرے قتل کا اختیار نہیں دیا۔"

بادشاہ کو طیش آیا اور اس نے حکم دیا "اس کو پہاڑی پر سے دھکیل کر ہلاک کر دیا جائے۔"

بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں عبداللہ کو ایک پہاڑی پر لے جایا گیا لیکن ابھی وہ دھکا نہیں دے سکے تھے کہ یکے بعد دیگرے ان کے پاؤں پھسلے اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔ عبداللہ محفوظ رہا وہ سیدھا بادشاہ کے پاس گیا اور اس کو بتایا "دیکھ' میں زندہ ہوں جب کہ تیرے آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا میں نے تجھ سے پہلے ہی یہ نہیں کہا تھا کہ تجھے میرے قتل کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔"

بادشاہ نے غصے میں حکم دیا "اس کو پانی میں ڈبو دیا جائے۔"

لیکن جب شاہی کارندوں نے عبداللہ کو ڈبو دینے کی کوشش کی تو پانی نے عبداللہ کو قبول نہیں کیا اور اچھال کے کنارے پر پھینک دیا۔

اس بار پھر عبداللہ نے بادشاہ کو بتایا "میں جانتا ہوں کہ اگر تو مجھے قتل کروانا چاہے تو مجھے کس طرح قتل کر سکتا ہے ورنہ مجھے مروا دینے کی کوشش کرتا رہ' مسلسل ناکام ہوتا رہے گا۔"

اب بادشاہ کے رویّے میں کچھ تبدیلی آگئی تھی' نرمی سے پوچھا "آخر وہ کون سا طریقہ ہے کہ میں اسے اختیار کروں اور تیری موت

واقع ہو جائے؟"
عبداللہ نے کہا "بادشاہ کو چاہیے کہ وہ شہریوں کو ایک جگہ جمع ہو جانے کا حکم دے اور جب یہ سب جمع ہو جائیں تو بادشاہ اللہ کا نام لے کر مجھ پر حملہ آور ہو تو میری موت یقینی ہو جائے گی۔"
بادشاہ نے شہریوں کو کھلے میدان میں جمع ہو جانے کا حکم دیا۔ جب یہ سب ایک میدان میں جمع ہو گئے تو بادشاہ نے عبداللہ سے پوچھا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟"
عبداللہ نے اللہ کا نام لیا اور یہ نام سبھی نے سنا۔
گویا اب بادشاہ نے اللہ کی قدرتِ کاملہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اللہ کا نام لے کر عبداللہ پر حملہ کیا تو وہ شدید زخمی ہو گیا مگر عبداللہ چوں کہ اسمِ اعظم کا حامل تھا اس لیے بادشاہ کا بھی برا حال تھا۔
ادھر عبداللہ کا انتقال ہوا اور دوسری طرف بادشاہ کا انتقال۔
ہجوم نے یہ مقابلہ دیکھا تو اسے عبداللہ پر رحم آیا۔ ان میں اکثریت ان کی تھی جو عبداللہ کے دین کو اختیار کر چکے تھے۔ گویا پورے شہر نے آبائی دین کو ترک کر دیا تھا اور عبداللہ کے دین کو اختیار کر لیا تھا۔
یہ ساری خبریں یمن پہنچیں۔ ان دنوں یمن کا بادشاہ یوسف ذونواس تھا۔ یہ بادشاہ مذہباً یہودیت کا قائل تھا۔ اسے عیسائیت سے نفرت تھی۔ نجران کے لوگوں نے ذونواس کو بتایا "ہم لوگ پرانے آبائی مذہب کے پابند ہیں اور اسی پر قائم رہنا چاہتے ہیں مگر ان دنوں نجران میں ایک نیا دین پھیل رہا ہے۔ ہمارا بادشاہ اس کو روک دینے کی کوششوں میں ہلاک ہوا۔ اب ان سب کی نظریں آپ پر ہیں۔ چلیں اور نئے دین والوں کو حکم دیں کہ نیا دین، نجران میں نہیں چلے گا۔ اگر نہ مانیں تو انہیں سزا دی جائے۔"
ذونواس نے غصے کے عالم میں نجران کا سفر اختیار کیا اور ان پر سختیاں شروع ہو گئیں۔ لوگوں کو میدانوں میں جمع کیا گیا اور ان سے سوال جواب شروع ہوئے۔
یہ بہادر لوگ جان کی پروا کیے بغیر بادشاہ کے ہر حکم کی خلاف ورزیاں کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ حق کو ترک کر کے باطل کا دین نہیں اختیار کریں گے۔
ذو نواس نے کہا "تو گویا تم لوگ میرا حکم نہیں مانو گے اور من مانی کرتے رہو گے۔"
لوگوں نے جواب دیا "ہم لوگ من مانی نہیں کر رہے ہیں۔ جسے حق سمجھتے ہیں، اسی پر قائم ہیں۔"
ذونواس نے اپنی فوج کو حکم دیا "اس شہر کے ہر ہر محلے اور گلی میں خندقیں کھودی جائیں، جب یہ تیار ہو جائیں تو ان میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے ڈال کر آگ لگا دی جائے۔ جو بھی شہری اپنے آبائی دین کو ترک کر چکا ہے، اسے حکم دیا جائے کہ وہ نئے دین کو چھوڑ دے اور اپنے آبائی دین کو دوبارہ اختیار کر لے۔ جو نہ مانے، اسے آگ میں ڈال دیا جائے۔"
بادشاہ کے حکم پر ہنگامی طور پر عمل شروع ہو گیا مگر نتیجہ صفر رہا۔
دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً بیس ہزار شہری دہکتی ہوئی آگ کی خندقوں میں جھونک دیے گئے۔
اس واقعے کا دور دور تک چرچا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ خبر روم تک پہنچا دی گئی کیوں کہ ایک شخص کسی طرح بچ کے نکل گیا تھا۔ اس نے رومی بادشاہ کو رو رو کر بتایا کہ اس کے بیس ہزار ہم مذہب بلاوجہ ہلاک کر دیے گئے، انہیں انصاف دلوایا جائے۔
ان دنوں حبشہ عیسائیوں کے زیرِ تسلط تھا اور یمن ایران کے زیرِ اثر تھا۔ روم نے ذونواس سے جواب طلب کیا اور ذونواس نے ایران کو آواز دی۔
روم نے حبشہ کے عیسائی بادشاہ کو ایک خط لکھا کہ وہ یمن پر حملہ کرے، ذونواس کو گرفتار کرے اور پھر نجران میں عیسائیت کو فروغ دیا جائے۔
ذونواس کو سن گن ملی تو اس نے ایران سے مدد مانگ لی۔ ایران نے اپنی فوج بھیج دی۔
دونوں میں سخت مقابلہ ہوا۔ ذونواس کو شکست ہوئی مگر اسے گرفتار نہیں کیا جا سکا اور ایک بار پھر یمن سے نجران تک عیسائی مذہب رائج اور مشہور ہو گیا۔



اصحاب الاخدود کے حوالے سے تیسری روایت حضرت انسؓ کی ہے۔ ان سے کچھ لوگوں نے پوچھا "حضرت! یہ اصحاب الاخدود کون تھے؟"
حضرت انسؓ نے جواب دیا "زمانۂ قدیم میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ جب ہر طرف کفر کا دور دورہ تھا تو کچھ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کفر و شرک کی آبادیوں سے دور اپنے لیے ایک چھوٹی سی بستی بسائیں گے اور اللہ کی یاد میں زندگی بسر کریں گے۔

چنانچہ یہ لوگ خاموشی سے کہیں دور نکل گئے اور ایک چھوٹی سی بستی آباد کر کے اس میں اللہ اللہ کرنے لگے۔ ان کے چلے جانے کی خبریں پھیلنا شروع ہوئیں تو کچھ لوگوں نے ان کی بستی کا سراغ بھی لگا لیا اور ان کے عبادت خانے کو بھی دیکھا۔ انہوں نے پوچھا "تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟"

انہوں نے جواب دیا "ہم شرک اور بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں اور چاہتے تھے کہ ہم اپنے طور پر خدائے واحد کی عبادت کریں مگر تم لوگوں نے ہماری یہ حق پرستی کی روش پسند نہ کی۔ ہمیں ستایا اور ہمیں مجبور ہو کے تم لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔ ہم نے سب سے الگ تھلگ اس ویرانے کو آباد کیا اور اللہ اللہ کرنے لگے لیکن تم لوگوں نے ہمارا پیچھا کیا اور تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے پتا نہیں اب تم کیا چاہتے ہو؟"

ان لوگوں نے کہا "تم نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اپنے آبائی دین کو ترک کیا اور بظاہر ایسا لگا کہ تم معصوم لوگ بالکل بے ضرر ہو مگر ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اس نئے دین پر نہیں چلنے دیں گے۔"

حق پرستوں نے بے بسی سے کہا "دیکھو! ہم پر جبر نہ کرو اور ہمیں یہاں ایک گوشے میں اللہ اللہ کرنے دو۔ دل دکھاؤ گے، ستاؤ گے تو اللہ بھی اس سے ناخوش ہوگا۔"

ان لوگوں نے اصرار کیا "اپنے آبائی شہر میں واپس چلو۔ ہم تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔"

دونوں طرف سے بحث جاری رہی۔ ایک گروہ لے جانے پر مصر تھا اور دوسرا یہاں سے ہلنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔

آخر پرانی بستی والوں نے انہیں دھمکی دی "ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تم کب تک یہاں رہتے ہو۔"

اللہ والوں نے معصومیت سے کہا "اس وقت تک جب تک اللہ چاہے گا۔ کسی بندے کی مجال نہیں کہ ہمیں یہاں سے بیدخل کرے۔"

بستی کے لوگ واپس چلے گئے اور وہاں کے حکمران سے ان کی شکایت کی "یہ بددماغ اور گمراہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے بڑا کوئی دیندار نہیں لیکن ان سب کو بتا دینا چاہیے کہ وہ ہم سے الگ تھلگ رہ کے، ہمارے دین کو نظرانداز کر کے ہنسی خوشی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ اگر وہ زیادہ جھگڑیں گے تو ہم بھی وہاں ایک بستی بسائیں گے۔ پھر دیکھیں گے کہ یہ وہاں سے کہاں جاتے ہیں۔"

حکمران نے تسلی دی اور کہا "انہیں یہاں آنا پڑے گا۔ نہیں آئیں گے تو ہم انہیں زبردستی لے آئیں گے۔"

بستی والوں نے اپنے حاکم سے کہا "فی الحال ان پر سختی نہ کریں کیوں کہ وہ اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ آج نہیں تو کل ہماری باتیں سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔"

ایک بار پھر نامہ و پیام شروع ہو گیا۔

ان اللہ والوں نے آئے دن کے جھگڑوں سے عاجز آ کر فیصلہ کیا کہ اب وہ کہیں اور بہت دور جا بسیں گے، جہاں ان کا پہنچنا مشکل ہوگا اور پہنچیں گے بھی تو ان کی ایک نہ سنی جائے گی اور اس طرح ذلیل کر کے رکھیں گے کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے۔

یہ لوگ اس جگہ کو بھی چھوڑ گئے اور کسی ایسی جگہ پہنچے جہاں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے مخالف اور ان کے ہم وطن یہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

بالآخر یہ لوگ اور آگے بڑھ گئے مگر ابھی انہیں یہاں پہنچے گنتی کے چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ بادشاہ نے ان کا پتا چلا لیا اور فوج لے کر ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا "تم لوگ ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

ان لوگوں نے جواب دیا "ہم نے آج تک کسی کو بھی نہیں ستایا اور یہی دوسروں سے چاہتے ہیں کہ وہ بھی ہمیں نہ ستائیں۔"

بادشاہ نے سنجیدگی سے کہا "دیکھو! اپنے جس رویّے سے تم یہ سمجھتے ہو کہ تم سب بے ضرر لوگ ہو تو یہ غلط ہے۔ تم نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ کے ہم سب کو قلبی اذیت پہنچائی ہے اور اب ہم سے بھاگتے پھر رہے ہو۔ اس سے نہ تو تمہارے عزیز رشتے دار خوش ہیں، نہ بستی کے لوگ اور نہ ہم حکمران۔"

ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا "یہ کیا زبردستی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ تم نے جو شرک اختیار کر رکھا ہے ہم بھی اسے اختیار کیے رکھیں۔ جس طرح تم تکلیف محسوس کرتے ہو اس سے زیادہ ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔ ہمیں اپنے طریقے سے زندگی بسر کرنے دو اور ہمیں بھول جاؤ۔"

بادشاہ نے کہا "جہاں تم پہلے رہتے تھے اور اب اس جگہ جہاں تم آباد ہو یہ ساری جگہیں میری حدودِ سلطنت میں واقع ہیں۔ اجازت کے بغیر تم کہیں نہیں رہ سکتے۔"

ان لوگوں نے بادشاہ کے خیالِ خام کو دور کرنا چاہا "یہ زمین اللہ کی ہے اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہاری ہے۔ تم سے پہلے اس زمین کی ملکیت کا کوئی اور دعویدار تھا۔ تمہارے بعد یہ زمین کسی اور کے قبضے میں چلی جائے گی اس لیے تم میری یہ بات مان لو کہ زمین کا مالک اللہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر تمہیں اس زمین پر قبضہ حاصل ہو گیا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو۔ اللہ کی مخلوق کو ستانے سے گریز

کرو۔"
بادشاہ نے سخت لب و لہجہ اختیار کیا "میں یہاں تمہاری نصیحتیں سننے نہیں آیا۔ چپ چاپ واپس چلو ورنہ تم یہاں سے ملکِ عدم روانہ کردیے جاؤ گے۔"
ان لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ اب فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور بادشاہ شر پر آمادہ ہے تو خاموشی سے اپنے حجروں میں چلے گئے اور کہا "ہم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا وہ جو چاہے کرے۔"
کسی نے تشویش ظاہر کی "بادشاہ غصے میں ہے کوشش کرو کہ اس کا مزاج اعتدال پر آجائے اس کے بعد ہم یہ کوشش کریں گے کہ اس کی حدود سے نکل جائیں۔"
بادشاہ نے اس چھوٹی سی بستی کو گھیرے میں لے لیا اور اپنے کچھ آدمی پرانی بستی میں روانہ کیے کہ وہ یہاں آئیں اور ایک دلچسپ تماشا دیکھیں۔
اسی دوران بہت سے گڑھے کھدوائے گئے اور ان میں لکڑیاں کاٹ کاٹ کے ڈلوادی گئیں اور آگ لگادی گئی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔
بادشاہ نے ان نیک آدمیوں کو ایک بڑی خندق کے کنارے بلوایا۔ جب یہ قطار میں بادشاہ کے سامنے خندق کے کنارے پہنچے تو خندق سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور اس کی تپش جسم کو جھلسائے دے رہی تھی۔
بادشاہ نے کہا "تم لوگوں نے دوزخ کا نام سنا ہے؟"
ان لوگوں نے جواب دیا "سنا ہے، دیکھا نہیں ہے۔"
بادشاہ نے دہکتی ہوئی خندقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سب تمہارے لیے جہنم ہے۔ میں تمہارا رب ہوں۔ میری مخلوق میری نافرمانی کرتی ہے تو میں اسے اس جہنم میں جھونک دیتا ہوں۔"
اب بادشاہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ حق پرستوں کو باری باری خندقوں کے قریب بلاتا اور پوچھتا "بتاؤ! تم کیا چاہتے ہو۔ اس آگ میں جل مرنا یا زندگی؟"
اور بادشاہ کو جواب ملتا "حالتِ کفر کی زندگی نہیں، حق پرستی کی موت قبول ہے۔"
بادشاہ بولا "اگر یہ بات ہے تو بتاؤ تم خود اس آگ میں کودو گے یا ہمارے آدمی تمہیں آگ میں جھونک دیں۔"
شروع میں تو بادشاہ کو ہر شخص سے یہی جواب ملا "ہم خود حق کی خاطر آگ میں کود جائیں گے۔ بادشاہ کے آدمیوں کو ہم سے دور رہنا چاہیے۔"
اور پھر یہ لوگ جذبۂ ایمانی سے سرشار، دوڑتے ہوئے خندق کی طرف جاتے اور دہکتی آگ میں چھلانگ لگادیتے۔
خندقیں دو چار تو تھی نہیں، بہت زیادہ تھیں اور یہ عمل ہر خندق کے سامنے جاری ہوگیا لوگ دوڑتے ہوئے آتے اور خندقوں میں دہکتی ہوئی آگ میں چھلانگ لگادیتے۔
میدان میں بادشاہ کے لیے شاندار خیمہ نصب کیا جاچکا تھا۔ اس خیمے کا در کھول دیا گیا اور اس کے اندر دروازے کے قریب سائے میں بادشاہ کی کرسی رکھ دی گئی جس پر وہ بیٹھ کر خندق میں کود کے جل مرنے والوں کا نظارہ کرنے لگا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے پوچھا "یہ کل کتنے پُرجوش ہوں گے۔ جو آگ میں جل مرنا چاہتے ہیں؟"
بادشاہ کے آدمیوں نے بتایا "تقریباً بیس ہزار نفوس۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، بوڑھے بھی اور بچے بھی۔ یہاں تک کہ زیرِ علاج مریض بھی ان میں شامل ہیں۔"
بادشاہ نے پوچھا "کیا بچے اپنی مرضی سے اس آگ میں جل مرنا چاہتے ہیں یا انہیں ان کے بزرگ ایسا کرنے پر مجبور کررہے ہیں؟"
بادشاہ کو بتایا گیا "یہاں ہر کوئی اپنی مرضی سے جل مرنا چاہتا ہے اور خصوصاً عورتوں اور بچوں کا جوش و خروش تو دیدنی ہے ۔ شاہی ملازمین کو بھی ان پر رحم آجاتا ہے۔"
بادشاہ نے غصے میں کہا "ایسے شاہی ملازمین کو ہٹادیا جائے جن کے دلوں میں جذبۂ ہمدردی پایا جاتا ہو۔"
اس حکم کی تعمیل کردی گئی۔
گھنٹوں اس منظر سے لطف اندوز ہونے والا بادشاہ بالآخر اکتا گیا اور کہنے لگا "بیس ہزار انسانوں کو جلنے مرنے کے لیے خاصا وقت چاہیے، میں کب تک اس کرسی پر بیٹھا نظارہ کرتا رہوں گا۔"
ایک خوشامدی درباری نے مشورہ دیا "ایک ہی جگہ گھنٹوں بیٹھ کے چند خندقوں کا نظارہ کرتے رہنا ایک اکتا دینے والا عمل ہے۔ بہتر ہوگا کہ بادشاہ سلامت اپنے گھوڑے پر بیٹھ کے مختلف خندقوں کا نظارہ کریں۔"

پورا ماحول جہنم زار بنا ہوا تھا اور شاہی خیمے تک ماحول گرم تھا۔
بادشاہ نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اس پر بیٹھ کے گھوم پھر کے یہ روح فرسا منظر دیکھتا رہا۔
اس نے ایک عورت کو دیکھا جو اپنے بچے کو گود میں لیے دہکتی ہوئی خندق کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ بادشاہ کے قریب سے وہ گزری تو بادشاہ نے سنا۔ عورت بچے سے کہہ رہی تھی "تو گود سے اتر جا اور بھاگ کے اپنی جان بچالے۔"
لیکن بچے نے انکار کیا "ماں! جب تو ہی نہ ہوگی تو میں جی کر کیا کروں گا؟"
ماں کے قدموں میں سستی آگئی اور اس نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں تیری خاطر زندہ رہوں گی۔"
بچے نے کہا "نہیں ماں! ایسا نہ کرنا۔ حق پرستوں میں میری وجہ سے تو سب سے پیچھے رہ جائے' یہ مجھے پسند نہیں۔"
اور بادشاہ نے دیکھا' یہ عورت بھی اپنے بچے سمیت خندق میں کود گئی۔
پورے دن میں بیس ہزار انسان دہکتی ہوئی خندقوں میں اتر گئے۔ بادشاہ نے اپنے امرا کے ساتھ گھوڑے کی پشت سے اس بھیانک اور ساکت و صامت ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں کی زمین تک تپنے لگی تھی اور گھوڑے بھی وحشت زدہ تھے شاید انہیں یہاں کی حدت پریشان کر رہی تھی یا کوئی اور بات تھی مگر یہ ضرور تھا کہ اس وقت وہ لگام کے اشاروں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ بادشاہ اور اس کے امرا اپنے اپنے گھوڑوں کو اس جہنم زار سے دور رکھنا چاہتے تھے مگر ان کے گھوڑے ان کو خندقوں کے قریب لے جا رہے تھے۔
بادشاہ نے اضطراری حالت میں اپنے امرا کو حکم دیا "اپنے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑو۔ یہ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہیں؟"
گھوڑوں کی لگامیں کھینچی گئیں تو ان کے منہ تو مڑ گئے مگر ان کا سفر خندقوں کی طرف جاری رہا اور پھر یکایک ان کی رفتار بھی بڑھ گئی۔
بادشاہ نے چیخ کر کہا "گھوڑے ہمیں دہکتی ہوئی خندقوں کی طرف لے جا رہے ہیں' کوئی انہیں روکے۔"
کوئی انہیں کیا روکتا' ایسا لگتا تھا جیسے یہ گھوڑے کسی نادیدہ اور غیر مرئی قوت کے اشاروں اور احکام پر چل رہے ہوں وہ خندقوں کے قریب ہوتے جا رہے تھے اور ان کی رفتار اتنی تیز ہو چکی تھی کہ یہ لوگ اب اپنے اپنے گھوڑوں کی پشت سے چھلانگ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔
ان کا اختیار ختم ہو چکا تھا اور بظاہر وہ سب اپنے اپنے گھوڑوں کے اختیار میں چلے گئے تھے۔
بادشاہ کا گھوڑا دہکتی ہوئی خندق کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے گھوڑا بادشاہ سمیت خندق میں اتر جائے گا۔
بادشاہ نے حوصلے سے کام لیا اور گھوڑے کی پشت پر سے چھلانگ لگا دی۔ بادشاہ کے ساتھ ہی گھوڑے نے بھی چھلانگ لگائی اور وہ خود تو خندق کے اس پار چلا گیا مگر بادشاہ دہکتی ہوئی خندق میں چلا گیا اور پھر یہی حال بادشاہ کے امرا کا بھی ہوا۔ ان کے گھوڑوں نے بھی چھلانگیں لگائیں اور اپنے سواروں کو دہکتی خندقوں میں گرا کے خود دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔
اب اس میدان میں بادشاہ کے صرف وہ ملازم باقی بچے تھے جن کے دلوں میں ان حق پرستوں کے لیے جذبۂ ترحم پیدا ہو گیا تھا۔
بیس ہزار ایماندار حق پرست جل کر مر گئے مگر ان کی بستی کا ایک شخص زندہ تھا۔ یہ ابھی تک ان حق پرستوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔
اس ہولناک منظر نے اس کے دل پر اثر کیا اور اس نے اس کا اظہار کیے بغیر ہی شام کا سفر اختیار کیا کیوں کہ ان دنوں شام عظیم رومی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ اور قسطنطنیہ کا قیصر شام آیا ہوا تھا۔
نجران کی بستی کا بھاگا ہوا دوس ذوالثعلبان نامی یہ شخص شام پہنچا اور وہاں کے حکام سے درخواست کی کہ اسے روم کے قیصر سے ملوا دیا جائے۔ اس کی قیصر سے ملاقات کروا دی گئی۔ اور اس نے سارا واقعہ رو رو کر سنا دیا۔
قیصر کو بے حد غصہ آیا اور اس نے حبشہ کے عیسائی بادشاہ کو حکم دیا "یمن کی غیر مسیحی حکومت کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے۔"
اور قیصر نے قسطنطنیہ واپس پہنچ کے عام فرمان جاری کیا "غیر مسیحی لوگوں کو عیسائیوں سے الگ کیا جائے۔"
اور پھر جب اس حکم پر عمل کیا گیا اور غیر مسیحی عیسائیوں سے الگ کر دیے گئے تو قیصر نے بھی وہی کام کیا جو نجران کے بادشاہ نے کیا تھا۔
قیصر نے غیر مسیحی عقائد رکھنے والوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائی مذہب اختیار کرلیں۔
کچھ نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا لیکن اکثریت نے قیصر کا یہ حکم نہیں مانا اور پھر قیصر نے بھی نجران کے بادشاہ کی طرح بہت سی خندقیں کھدوائیں اور ان خندقوں میں آگ دہکائی گئی اور جن جن غیر مسیحی لوگوں نے مسیحی مذہب اختیار کرنے سے انکار کیا تھا ان سب کو ان خندقوں میں جھونک دیا گیا۔
حبشہ کے نجاشی نے چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کے بحیرۂ احمر عبور کیا اور یمن کے ساحل پر اتر کر حاکم یمن کے خلاف جنگ شروع کر دی۔
یمن کا غیر مسیحی حکمران ایران سے مدد کا طالب ہوا مگر ایران سے جو مدد اسے حاصل ہوئی وہ باقاعدہ جنگجو نہیں تھے بلکہ یہ سب ایران کے قید خانوں سے نکالے ہوئے قیدی مجرم تھے۔ ان قیدیوں کو حبشہ کے بادشاہ کی فوج کے سامنے کھڑا کیا گیا تو یہ جنگجو سپاہیوں کا مقابلہ نہ

کر سکے۔ یمن کا بادشاہ شکست اٹھا کے بحیرۂ روم میں مغرب کی طرف فرار ہوا مگر راستے میں تند و تیز سمندری لہروں نے اس بادشاہ کو نگل لیا۔

اس مرنے والے بادشاہ کا بظاہر، نجران کے حادثۂ فاجعہ سے کوئی تعلق نہ تھا مگر نجران کے بادشاہ کی سرپرستی کرنے یا اس خوفناک واقعے کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کی وجہ سے قدرت نے اسے سمندر میں ڈوب جانے کی سزا دی۔

اس کے بعد یمن میں عیسائی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ خندق کے واقعات کئی ملکوں میں پیش آئے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایران کے کسی بادشاہ نے بھی اسی طرح خندقیں کھدوائی تھیں اور حق کے ماننے والوں کو دہکتی ہوئی خندقوں میں ڈلوا دیا تھا۔

اور اس سے بھی بڑا خوفناک واقعہ بابل میں پیش آیا تھا۔ بخت نصر نے شمس دیوتا کی پرستش کرنے پر یہودیوں کو مجبور کیا تھا مگر دانیال نبی کی سرپرستی میں یہودیوں نے شمس دیوتا کی پرستش سے انکار کر دیا تھا۔

بخت نصر نے غیظ و غضب کی حالت میں خندقیں کھودنے کا حکم دے دیا تھا، بہت سی خندقیں کھد گئیں اور ان خندقوں کو لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں سے بھر دیا گیا اور انہیں آگ لگا دی گئی پھر جب یہ دہکنے لگے تو یہودیوں کو ان خندقوں میں جھونک دیا گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک خندق میں دانیال نبی کو بھی ان کے ساتھیوں سمیت جھونک دیا گیا تھا مگر آگ ان کو جلانے سے قاصر رہی تھی۔

یہ خندقوں والے اصحاب کئی تھے اور ان کا کئی ملکوں سے تعلق تھا مگر قرآن پاک میں جن خندق والوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق نجران سے تھا۔ اس پر سبھی نے اتفاق کیا ہے۔



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب اسلام نے ایران میں توسیع اور اشاعت کی اور ابو موسیٰ اشعری ایک فاتح کی حیثیت سے اصفہان میں داخل ہوئے تو انہوں نے اس شہر کی فصیلوں کا جائزہ لیا۔ شہرپناہ کی ایک دیوار شکستہ تھی۔ ابو موسیٰ اشعری نے حکم دیا کہ اس شکستہ دیوار کو درست کیا جائے۔

مزدوروں نے کام شروع کیا اور دیوار کھڑی کر دی مگر چند گھنٹوں بعد یہ دیوار گر گئی۔

ابو موسیٰ اشعری نے دیوار کھڑی کرنے والوں سے پوچھا "کیسا کام کیا تھا کہ دیوار پھر گر گئی۔"

دیوار کھڑی کرنے والے ان کو کیا جواب دیتے، خاموشی سے دوبارہ دیوار کھڑی کر دی مگر کئی دن بعد یہ دیوار پھر گر گئی۔

دیوار کے دوبارہ گر جانے پر سبھی کو تعجب ہوا اور کچھ غور و خوض کے بعد بالاتفاق یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دیوار کی بنیاد میں کوئی خاص شے ہے جو دیوار کو کھڑا نہیں رہنے دیتی۔

اب بنیاد کی گہری کھدائی کی گئی تو وہاں سے ایک انسانی پنجر برآمد ہوا۔ یہ ایک کھڑے ہوئے شخص کا ڈھانچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی اور تلوار کے دستے پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ عبارت اور رسم الخط عربی تھے۔ کسی عالم نے یہ عبارت پڑھی، لکھا ہوا تھا "میں حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحاب الاخدود سے انتقام لیا۔"

اس عربی عبارت کی روشنی میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ عرب کے جرہم قبیلے میں اس نام کا ایک بادشاہ گزرا ہے اور اس کی مکے پر حکومت تھی، شاید اس نے خندقوں والوں کو نقصان پہنچایا ہو مگر کسی تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کے راوی محمد بن جعفر بن ابو طالب ہیں۔

دوسرا واقعہ مشہور محدث محمد بن ابوبکر بن خرم نے کسی سند کے بغیر بیان کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب ؓ کے زمانے میں، نجران کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا کہ کھدائی کے دوران اندر ایک قبر دکھائی دی۔ قبر میں جھانک کے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔

اب قبر میں اتر کے اس کا جائزہ لیا تو دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی بھی ہے۔ اس انگوٹھی پر ربی اللہ کندہ تھا۔

اس واقعے کی خبر حضرت عمرؓ کو کی گئی تو آپ نے فرمان جاری کیا "اس شخص کو اسی حالت میں اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔"

محققین نے اس پر کام کیا تو معلوم ہو گیا کہ یہ عبداللہ بن تامر کا ڈھانچا ہے۔

مضمون کے مآخذ

تفہیم القرآن	کتاب الہدیٰ	قصص القرآن	ترجمان القرآن
مولانا مودودی	مولانا یعقوب حسن	مولانا حفظ الرحمٰن	مولانا ابوالکلام آزاد

دلی کا قطب رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ بختیار کاکی

"ہر وقت کسی فکر میں ڈوبا رہنے والا بچہ جب اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو گیا تو بیوہ ماں کو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر لاحق ہو گئی۔ گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق ایک طباق شیرینی اور چھوہاروں سے بھر کر غلام کو حکم دیا کہ "بچے کو محلے کے مکتب میں داخل کرا دو۔"

طباق کاندھے پر رکھے اور ایک ہاتھ سے بچے کی انگلی پکڑے جب غلام گھر کی گلی سے ذرا آگے بڑھا تو ——— ایک بزرگ نے اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا: "اس بچے کو کہاں لیے جا رہے ہو؟"

غلام نے جواب دیا: "مکتب میں داخل کرانے!"

اجنبی بزرگ نے جواب دیا: "اس بچے کو بھلا مکتب کا مولوی کیا پڑھا سکے گا، میرے ساتھ آؤ، میں اس بچے کو اس کے استاد کے پاس پہنچا دوں جو منجانب اللہ مقرر ہوا ہے۔"

غلام سراسیمہ اور سہما سہما ان بزرگ کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ مشہور بزرگ اور عالمِ باعمل ابو حفص کے گھر پہنچ گئے اور اجنبی بزرگ نے بچے کو ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا: "ابو حفص! اس بچے کو خوب پہچان لے اور جی جان سے اس کی تعلیم و تربیت کر!"

وہ بزرگ یہ کہہ کر چلتے بنے اور ابو حفص نے بچے کو احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر غلام سے پوچھا:

"یہ بزرگ کون تھے؟"

غلام نے شیرینی اور چھوہاروں کا طباق ابو حفص کے روبرو رکھ کر پورا قصہ سنا دیا اور آخر میں کہا کہ "میں انھیں بالکل نہیں جانتا!"

ابو حفص نے رمز میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ سے کہا: "ہاں تم کیا جانو، یہ خضر علیہ السلام تھے!"

غلام ہکا بکا پاگلوں کی طرح ابو حفص کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

ابو حفص کے قریب ہی رحل پر قرآنِ پاک رکھا ہوا تھا۔ بچے کے ہاتھ میں تختی تھی۔ استاد نے قلم سیاہی میں ڈبویا اور پھر تختی کی طرف بڑھاتے ہوئے بچے سے دریافت کیا: "ہاں بیٹے! کہاں سے تمھاری تعلیم کا آغاز کیا جائے؟"

بچے نے سادگی سے جواب دیا: "لکھیے سبحان الذی اسری..."

استاد نے حیرت سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: "لیکن یہ تو پندرھویں پارے میں ہے! اور اس سے پہلے کے چودہ پارے؟"

بچے نے سادگی سے جواب دیا: "جب میں اپنی ماں کے پیٹ میں

تھا انھوں نے چودہ پارے ختم کر لیے تھے وہ سارے مجھے حفظ ہو چکے ہیں ـــ پندرھواں شروع کیا تھا کہ میری ولادت ہو گئی"!

ابو حفصؒ نے امتحاناً کہا "اچھا انھیں سُناؤ"!

بچے نے بے جھجک الف لام میم سے لے کر رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِینَ (چودھویں پارے) کے آخر تک سُنا دیا۔

غلام کے ہوش وحواس جاتے رہے لیکن اُستاد کا دل جذبۂ فخر و انبساط سے سرشار ہو گیا کہ پوری زندگی میں ایک عظیم الشان بچے کی استادی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

بچے نے بقیہ سولہ پارے بھی چار دن میں حفظ کر لیے۔

یہیں ایک دن بچے کی ملاقات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہو گئی' دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے اور کھنچ کر رہ گئے شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جو دونوں کے مقدرات میں تھا۔



علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل ہو چکی تھی اب وہ بچہ جوانی میں قدم رکھ کر قطب الدین کے نام سے معروف ہو چکا تھا۔ نوجوانی کے آغاز ہی میں مجاہدے اور ریاضت کا یہ عالم تھا کہ نماز اور تلاوتِ کلام کے مسلسل عمل اور اوراد و وظائف کی شدید محنت کے بعد جب بستر سے پشت لگاتے تو ہزاروں بار درود شریف کا وِرد کرتے۔

کچھ دنوں سے ماں یہ محسوس کر رہی تھیں کہ بیٹا انھیں چھوڑ کر کہیں جانے والا ہے۔ کسی لمبے اور دُور دراز سفر پر۔ ماں نے از راہِ فرضِ مادری ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی سے بیٹے کی شادی کر دی۔ نوجوان قطب الدین اِس حسین پری پیکر میں کچھ ایسا کھو گیا کہ سارے دن کی ریاضت کے بعد رات کا وقت اس پری پیکر کے لیے وقف کر دیا۔ درود شریف کے وِرد کا عمل فراموش ہو گیا اور اس صورتِ حال کو تین دن گزر گئے۔

قطب الدین کی بزرگی اور ولایت کا دُور دُور شہرہ ہو چکا تھا آس پاس کے لوگ ان کے مرید ہو چکے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد جب قطب الدین نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی تو کسی نے بتایا کہ رئیس احمد نامی ایک عمر رسیدہ پڑوسی مرید شرفِ ہمکلامی کے خواہش مند ہیں۔ نوجوان قطب الدین نے تلاوتِ کلام پاک کے بعد ان بزرگ سے ملاقات کی اور دریافت فرمایا "ہم سے کوئی خاص کام؟"

بزرگ پڑوسی نے کچھ تکلف اور کچھ شرمائے شرمائے لہجے میں عرض کیا "حضرت! جو عرض کرنا ہے خود میں اس کی ہمت نہیں پاتا"!

قطب الدین نے جواب دیا "شرماؤ نہیں' جو بات ہے صاف صاف کہہ دو"۔

شرمیلے پڑوسی نے عرض کیا "حضرت! رات کے پچھلے پہر اس ناچیز نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اِس خادم نے دیکھا کہ ایک عالی شان محل کے سامنے کھڑا ہے' اس محل کے سامنے لوگوں کا زبردست ہجوم ہے' محل کے اندر سے ایک درمیانہ قد' نورانی چہرے کا آدمی باہر آتا ہے اور لوگوں کا پیغام لیکر اندر چلا جاتا ہے اور پھر وہاں سے جواب لیکر واپس آتا ہے۔ یہ غلام آگے بڑھا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ بھائیو! یہ کون بزرگوار ہیں اور یہ محل کن صاحب کا ہے؟' جواب ملا۔ یہ قصر تو رسولِ مقبولؐ کا ہے' اندر آپ تشریف فرما ہیں اور یہ بزرگوار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں' جو حضرات رسولِ مقبولؐ کے نام پیغامات بھیجتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اندر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی یہ خاکسار حضرت عبداللہؓ کی طرف بڑھا اور ان سے درخواست کی کہ حضرت! رسول اللہؐ کی خدمت میں میری درخواست پہنچا دیجیے کہ رئیس احمد نامی آپ کا غلام زادہ دیدارِ پُرانوار کا مشتاق ہے' اِس پر بھی کرم ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت عبداللہ میری درخواست کا یہ جواب لیکر واپس آئے کہ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ ابھی تجھ میں ہمارے دیکھنے کی قابلیت نہیں ہے' تو واپس جا اور قطب الدین سے کہنا کہ کیا بات ہے' تین راتوں سے تمھارا تحفہ ہمیں نہیں ملا"!

خواب سُن کر نوجوان قطب الدین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے چند لمحوں کے لیے سکوت اختیار کیا' سینے میں ایک طوفان برپا تھا' حسین بیوی کے سحر اور رسولِ مقبولؐ کی محبت میں بپا ہونے والی جنگ میں عورت کو شکست ہو گئی' آپ اسی وقت اندر گئے' بیوی کو اس کا مہر ادا کیا اور طلاق دے کر ہمیشہ کی جُدائی اختیار کر لی۔ ماں اپنے بیٹے کی عظمت سے واقف تھیں وہ خاموش رہیں پھر ماں کے استفسار پر بیٹے نے مختصر جواب دے کر اسے چپ کر دیا "جو شے رسول اللہؐ کی نظر میں مجھے شرمسار کر دے میں اسے کس طرح رکھ سکتا ہوں"!

پھر وطن بھی چھوڑ دیا اور بغداد کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب رات

ہوگئی تو ایک مسجد میں قیام کیا، نماز کے بعد آپ وظیفے میں مشغول ہوگئے، اسی عالم میں انھیں اپنا بچپنا یاد آیا، وہ دن جب کسی اجنبی بزرگ نے انھیں استاد ابوحفصؒ کی خدمت میں پہنچا دیا تھا اور جس کی بابت استاد ابوحفصؒ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ وہ اجنبی بزرگ خضرؑ تھے جو تمھاری رہنمائی کو حاضر ہوئے تھے۔ قطب الدین نے سوچا کہ خضر علیہ السلام کی ضرورت آج کہیں زیادہ ہے۔ لیکن ایک خوب صورت لڑکے نے مسجد میں داخل ہوکر ان کے انہماک کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس نے پوچھا: "یہاں کیا کر رہے ہو؟"

قطب الدین نے جواب دیا: "ذکر و فکر!"

لڑکے نے کہا: "ذکر کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن یہ فکر کس کی کر رہے ہو؟"

نوجوان قطب الدین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "خضر علیہ السلام کی۔"

لڑکے نے حیرت سے قطب الدین کو دیکھا اور پوچھا: "وہ کس لیے؟ دین کے لیے یا دنیا کے لیے؟"

قطب الدین نے بے نیازی سے جواب دیا: "بندے کو دونوں سے مطلب نہیں، میں صرف اللہ کے واسطے ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لڑکے نے کہا: "خوب! جس خضر کی تو آرزو رکھتا ہے، وہ خود تیری ہی طرح سرگرداں ہے!"

اسی لمحے مسجد کے ایک گوشے سے ایک عمر رسیدہ شخص ان کے قریب آگیا اور پوچھا: "کیا بات ہے؟ تم دونوں کس بات پر الجھ رہے ہو؟"

لڑکے نے ہنس کر کہا: "یہ نوجوان کہتا ہے کہ مجھے نہ تو دین چاہیے اور نہ دنیا، پھر بھی خضر کی ضرورت محسوس کرتا ہے!"

مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں نوجوان قطب الدین نے ان بزرگ کو دیکھا اور ان کے حافظے میں بچپن کے اس اجنبی بزرگ کی شبیہہ ابھر آئی جس نے انھیں استاد ابوحفصؒ کی خدمت میں پہنچایا تھا۔ قطب الدین نے کچھ پوچھنے کے لیے حیرت زدہ انداز میں لڑکے کی طرف دیکھا لیکن لڑکا وہاں موجود نہ تھا، اس کے فوراً بعد ہی وہ اجنبی بزرگ کی طرف مڑے لیکن ادھر بھی کچھ نہ تھا، حیرت، ٹمٹماتا دیا، رات کا سناٹا اور جھینگروں کے ساز و آواز کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔



یہ سترہ سالہ نوجوان جب شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ احد الدین کرمانیؒ، شیخ برہان الدین چشتیؒ اور شیخ محمود اصفہانیؒ جیسے بزرگ جید صوفیائے کرام کی صحبت میں داخل ہوا تو اس مادرزاد ولی کی ولایت پر سبھی رشک کرنے لگے۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ سے یہیں ملاقات ہوگئی اور نوجوان قطب الدین نے والہانہ فرمایا: "یا حضرت! اب تابِ صبر نہیں، اس ناچیز کو شرفِ غلامی سے سرفراز فرمائیں!"

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے تبسّم فرمایا اور امام ابواللیث سمرقندی کی مسجد میں مذکورۂ بالا صوفیائے کرام کے روبرو قطب الدین کو شرفِ مریدی بخش کر بختیار کا خطاب عطا فرمایا اور اپنی خلافت بھی بخش دی۔ دونوں حضرات ایک بار پھر جدا ہوگئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سلطان الہند ہو کر اجمیر چلے گئے اور نوجوان قطب الدین ایران اور عرب کی سیر و سیاحت میں مصروف ہوگئے۔ عرصے بعد جب انھیں اپنے مرشد کی اجمیر میں موجودگی کا علم ہوا تو نوجوان مرید اپنے مرشد سے ملنے کے لیے ہندوستان چل پڑا۔ ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے ملاقات ہوئی، دونوں مل کر بے حد خوش ہوئے۔

ابھی ملتان میں قیام فرما ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ تاتاریوں نے اس کا محاصرہ کر لیا، پورا شہر خوف و ہراس میں مبتلا ہوگیا، شہر کا حاکم خوف زدہ تھا، فوج محدود تھی اور کسی طرف سے کمک ملنے کی کوئی امید نہ تھی، مقابلے کی ہمت نہ پا کر حاکمِ شہر نے تلوار اپنے گلے میں لٹکا لی اور مجرموں کی طرح حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوگیا، ان کے سامنے ہی حضرت بختیارؒ بھی تشریف فرما تھے۔ حاکمِ شہر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، حضرت بہاء الدینؒ سے کہا: "حضرت! وحشی تاتاریوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے، کوئی دم جاتا ہے کہ وہ فاتحانہ شہر میں داخل ہو جائیں گے اور شہریوں کی دولت و ناموس پر وحشیانہ ہاتھ صاف کرنے لگیں گے، خدا کے لیے کچھ کیجیے!"

حضرت بہاء الدینؒ نے معزز مہمان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں: "قطب الدین! تمھارے ہوتے ہوئے ہماری کیا مجال جو کوئی قدم اٹھائیں!"

نوجوان قطب الدین نے حاکمِ شہر سے کہا: "وہ تاتاری کہاں ہیں؟ وہاں ہمیں لے چلو!"

حاکمِ شہر نے جواب دیا: "حضرت! قلعے کی فصیل یا کسی برجی سے



کہیں جا رہے تھے۔ آپ کو ایک شخص نے دیکھتے ہی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اُنہیں بُرائیوں سے متصف قرار دیا۔ آپ اُس شخص کے قریب پہنچے اور اُس سے فرمایا :

"کیا یہ سب کچھ تم میری بابت کہہ رہے ہو ؟"

اُس شخص نے جواب دیا۔ "ہاں میں تمھی کو کہہ رہا ہوں، کیوں؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "جو کچھ تم نے کہا۔ اگر مجھ میں واقعی یہ بُرائیاں موجود ہیں تو خدا مجھ پر رحم فرماتے۔"

اُس شخص نے مرعوب ہو کر دریافت کیا۔ "اگر نہ ہوں تو ؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ "تب پھر خدا تم پر رحم فرماتے۔"

تاتاریوں کے لشکر کا مشاہدہ فرما سکتے ہیں!"

آپ نے فرمایا۔ "چلو ایسا ہی سہی، وہیں سے دیکھ لیں گے!"

حاکمِ شہر نے آپ کو قلعے کے صدر پھاٹک کی بُرجی میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ آپ نے دیکھا، حدِ نظر تک سیاہ، نیلے اور سُرخ خیموں کا ایک جنگل سا پھیلا ہوا تھا اور خیموں کے سامنے کے میدان میں بڑے بڑے بالوں اور چوڑے اور اُبھرے ہوئے جبڑوں اور کُھلی رنگت کے مسلح اور خوں خوار تاتاری دمدموں اور منجنیقوں کے آس پاس چل پھر رہے تھے۔ حضرت قطب الدینؒ نے بُرجی میں متعین ایک سپاہی کے ترکش میں سے ایک تیر نکال لیا اور حاکمِ شہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "لو! اسے چلّے میں رکھ کر، پوری قوت سے دُشمنوں کی طرف چھوڑ دو۔"

حاکمِ شہر اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا، بولا۔ "لیکن جناب والا! یہ تو ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہو جائے گا اور جواب میں جب یہ وحشی قلعے پر یلغار کریں گے تو ہم انھیں روک بھی نہ سکیں گے!"

حضرت بختیارؒ نے بے نیازی سے فرمایا۔ "جب تم نے ہم سے مدد مانگی ہے تو پھر جیسا ہم کہیں، اُس پر عمل کرو، ورنہ فقیر کو اجازت دو یہ واپس جائے اور تم جیسا مناسب سمجھو اسی پر عمل کرو۔"

حاکمِ شہر نے سوچا تباہی اور بربادی کے امکانات تو دونوں ہی صورتوں میں موجود ہیں۔ اگر نوجوان درویش بختیارؒ کے مشورے پر عمل نہ کیا گیا تب بھی یہ وحشی معاف نہ کریں گے اور اگر بختیار کے حکم پر تیر چھوڑا گیا تب بھی بربادی لازم ہے۔ دل نے مشورہ دیا کہ نوجوان بختیار کے حکم کی تعمیل زیادہ اہم ہے۔ اس کے بعد اگر تباہی آتی ہے تو یہ بزرگ خود ہی کچھ کریں گے۔ حاکمِ شہر نے گلے کی تلوار اُتار کر ایک طرف رکھ دی اور سپاہی سے کمان لے کر چلّے پر تیر چڑھایا اور پھر پوری قوت سے کھینچ کر چھوڑ دیا۔ تانت سے شپ کی آواز نکلی، کمان تھرتھرا گئی اور تیر ہوا میں لہراتا ہوا ایک منجنیق پر پہاڑی چٹان کی طرح جا گرا۔ منجنیق چکنا چُور ہو گئی، اس کے آس پاس موجود وحشی خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دُبک گئے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہوا؟ ابھی یہ معمہ حل نہ ہوا تھا کہ مغرب سے طوفانِ گرد و باد اُٹھا اور اس نے تاتاریوں کو محاصر میں لے لیا۔ دمدمے اُڑ گئے، منجنیقیں کہیں سے کہیں جا پہنچیں، خیمے ہوا میں غباروں کی طرح اُڑنے لگے۔ تاتاری بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے، ابھی طوفانِ گرد و باد کم نہ ہوا تھا کہ موسلا دھار بارش نے آ لیا اور تاریکی میں سب کچھ ڈوب گیا۔

حضرت بختیارؒ کے قدموں میں حاکمِ شہر گِر کر اُنھیں فرطِ عقیدت سے بوسے دے رہا تھا۔ آپ نے اسے اُٹھایا۔ حاکمِ شہر نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ "حضرت اعلام! آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے!"

آپ نے بے نیازی سے ارشاد کیا۔ "تو ان کی خدمت کر جنھیں تیرے سپرد کیا گیا ہے، یعنی اہالیانِ ملتان اور بندگانِ خدا کی خدمت، ہم تو خود ہی تم سب کی خدمت پر متعین ہوئے ہیں!"

حاکمِ شہر نے درخواست کی۔ "حضرت! آپ ملتان ہی میں قیام فرمائیں۔ آپ کی موجودگی ہماری طمانیتِ قلب کا باعث رہے گی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ملتان بہاء الدین زکریاؒ کے حوالے کیا گیا ہے۔ ہم یہاں چند دنوں کے لیے مہمان کی حیثیت سے تو رہ سکتے ہیں، مستقلاً نہیں!"

حاکمِ شہر نے اشتیاق سے پوچھا۔ "حضور والا کو کون سا علاقہ تفویض ہوا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہندوستان کا سلطان اجمیر میں فروکش ہے، ہم دہلی جا رہے ہیں، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ ہمیں کہاں متعین کرتا ہے ؟"

حاکمِ شہر نے گومگو سے پوچھا۔ "ہندوستان کا سلطان اجمیر میں فروکش ہے؟ حضرت وہ تو دہلی سے حکومت کرتا ہے، یہ آپ کو کس نے بتایا کہ ہندوستان کی راجدھانی اجمیر ہے!"

آپ نے تبسم فرمایا اور کہا "دہلی کا بادشاہ بھی ہمارے سلطان کا تابع ہے۔ تمھارے بادشاہ کا نام سلطان شمس الدین التمش ہے اور ہمارے سلطان کا نام خواجہ معین الدین چشتیؒ ہے، ہمارا سلطان، سلطانوں کا سلطان ہے۔"

حاکمِ شہر کو ان رموز کا کیا پتہ تھا، چپ ہو رہا۔

★

آپ ملتان سے چل کر، دہلی میں داخل ہوگئے۔ یہاں آپ نے مشہورِ زمانہ بزرگ قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے یہاں قیام فرمایا، حمید الدین ناگوریؒ ہر اعتبار سے حضرت بختیارؒ کے مرشد معلوم ہوتے تھے لیکن حفظِ مراتب کی ادائیگی کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ نوجوان بختیارؒ کی عزت اور احترام حضرت حمید الدین ناگوریؒ مریدوں کی طرح کرتے۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔

"عجیب بات ہے کہ قاضی حمید الدین جیسا بزرگِ کامل اس نوعمر بختیارؒ کا اس طرح احترام کرتا ہے جیسے کوئی مرید کسی مرشد کا کرے۔"

ایک مزشناس نے جواب دیا۔ "تم لوگ کیا جانو حضرت قطب الدین بختیارؒ اپنی نوعمری کے باوجود قطب المشائخ ہیں اور فضل و کمال میں حضرت حمید الدین ناگوریؒ سے فائق ہیں۔"

دہلی سے حضرت بختیارؒ نے اپنے مرشد خواجہ چشتیؒ کو لکھا۔ "غلام بختیار دہلی تک آچکا ہے اور آپ کی زیارت کا خواہاں ہے آپ کی اشارت یا بشارت کے ملتے ہی قدم بوسی کا شرف حاصل کرے گا۔"

چند دنوں بعد حضرت خواجہ چشتیؒ کا جواب آگیا آپ نے لکھا تھا۔ "بختیار! تم دہلی میں ٹھہرے رہو۔ اللہ نے وہاں کی ولایت تمھارے سپرد کر دی ہے تمھیں میرا قربِ روحانی حاصل ہے جس میں بُعدِ مکانی حائل نہیں ہو سکتا۔ چند دنوں بعد یہ فقیر بھی دہلی پہنچے گا اور ہم دونوں کی ظاہری ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

حضرت بختیارؒ دہلی میں ہی قیام فرما ہوگئے۔ روز بروز ہجوم بڑھنے لگا۔ پھر پورا شہر آپ کا معتقد ہوگیا، آپ اس ہجوم سے تنگ آکر کہیں چلے جانا چاہتے تھے لیکن حضرت خواجہ چشتیؒ نے یہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دے دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش بھی ہفتے میں دو دن حاضری دینے لگا۔ اس نے آپ کو کچھ مرحمت فرمانا چاہا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر التمش کا حاجب (سکریٹری)، بہت سارا نقد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذر پیش کرنا چاہا لیکن آپ نے اسے بھی قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "فقیر کو ان کی کوئی حاجت نہیں۔"

بادشاہ کے حاجب نے اصرار کیا، بولا۔ "حضرت! اسے قبول فرمالیں کیوں کہ انسانی ضروریات اسی سے پوری ہوتی ہیں، ان کی آپ کو یقیناً ضرورت پیش آئے گی۔"

حضرت بختیارؒ جس بوریے پر بیٹھے تھے آپ نے اس کا ایک کونا

حضرت عمرؓ نے فاتح ایران سعد بن وقاصؓ کو خط میں کچھ ہدایتیں لکھیں اور سب سے آخر میں لکھا۔ "اے ابن وقاص! تم خود نیکی اور تقوے پر قائم رہو اور اپنی فوج کو اس پر عمل پیرا رکھو اور رہبری یہ بات یاد رکھو کہ اگر ہم نیکی اور تقوے سے اپنے دشمن پر غالب نہ آسکے تو انہیں اپنی فوجی قوت سے بھی مغلوب نہ کر سکیں گے۔"

اُلٹ دیا اور بادشاہ کے حاجب سے فرمایا۔ "اِدھر دیکھ، میرے بوریے کے نیچے۔۔۔!"

حاجب نے دیکھا بوریے کے نیچے سونے کی نہر گہرائیوں میں جا کر غائب ہوگئی ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔ حضرت بختیارؒ نے فرمایا۔ "حق تعالیٰ، غیب کا خزانہ اپنے دوستوں کے تصرف میں دے دیتا ہے، ان کو تمھارے زر و جواہر کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اسی دوران سرکاری شیخ الاسلام کا انتقال ہوگیا۔ التمش نے یہ عہدہ حضرت بختیارؒ کو پیش کیا لیکن آپ نے انکار کر دیا، مجبوراً یہ منصب ایک دوسرے بزرگ نجم الدین صغریٰ کو پیش کیا گیا انھوں نے اسے قبول کرلیا، نجم الدین صغریٰ حضرت خواجہ چشتیؒ کے پیر بھائی بھی تھے، وہ شیخ الاسلام تو ضرور بن گئے لیکن اپنے رُوحانی مرتبے سے نیچے آگئے، سارا ہجوم تو حضرت بختیارؒ کے در پر رہتا تھا، شیخ الاسلام کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، ان کے دل میں حضرت بختیارؒ کے خلاف حسد پیدا ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد جب حضرت خواجہ چشتیؒ دہلی پہنچے تو حضرت بختیارؒ سے مل کر شیخ الاسلام سے ملنے بھی گئے، اس وقت نجم الدین صغریٰ اپنے مکان کے بعض حصوں کی تعمیر کرا رہے تھے، انھوں نے حضرت خواجہ چشتیؒ کو کنکھیوں سے دیکھا اور نظر انداز کر گئے۔ حضرت خواجہؒ، شیخ الاسلام کی سرد مہری سے آزردہ خاطر ہوئے اور انھیں مخاطب کر کے فرمایا۔ "نجم الدین! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے، کیا شیخ الاسلامی کے منصب نے تیرے دل میں غرور پیدا کر دیا ہے، اگر ایسا ہے تو تو گویا چاہِ ہلاکت میں گرا۔"

شیخ الاسلام نے تکدر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "حضرت! میں تو آپ کا اس حد تک مخلص اور تابعدار ہوں کہ جہاں آپ قدم رکھتے تھے وہاں میں اپنا سر رکھ دیتا تھا لیکن اب مجھے آپ سے یہ شکایت ہوگئی ہے کہ آپ نے اپنے مرید قطب الدین بختیارؒ کو دہلی کی ولایت عطا فرما دی ہے اور اجمیر سے تشریف

لاکر آپ نے شرفِ مہمان نوازی بھی اپنے اسی مُرید کو بخشا ہے۔ ان تمام باتوں اور آپ کی عنایتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یہاں کی ساری خلقت اسی در پہ حاضری دینے لگی ہے اور میں جو شیخ الاسلام ہوں، اس حد تک بے وقعت ہو چکا ہوں کہ ایک شخص بھی مجھے پان تک سے نہیں نوازتا، میں خود کو حقیر سا محسوس کرنے لگا ہوں۔"

حضرت خواجہؒ نے افسوس سے جواب دیا: "اچھا شیخ! تو خاطر جمع رکھ ہم قطب الدینؒ کو اپنے ہمراہ اجمیر لے جائیں گے۔"

حضرت خواجہؒ، بختیار کے پاس پہنچے اور آزردگی سے فرمایا۔ "قطب الدین! اِس شہر میں تجھ سے حسد کیا جاتا ہے اور بعض تیرے شاکی ہیں، تو ہمارے ساتھ اجمیر چل ہم وہاں تجھے مسندِ شیوخت پر بٹھا کر تیرے روبرو حاضری دیا کریں گے اور تیری خدمت کیا کریں گے۔"

نوجوان مرید آبدیدہ ہو گیا اور دلدوز لہجے میں جواب دیا: "جو کچھ حضور نے فرمایا یہ آپ کی بندہ نوازی ہے۔ غلام تو بس اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ آپ کے روبرو دست بستہ کھڑا رہے، اس کی کیا مجال کہ سامنے بیٹھ بھی سکے۔"

سامانِ سفر تیار ہو گیا تو بادشاہ کے نمائندے نے حضرت خواجہؒ سے عرض کیا۔ "حضور! بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ قطب الدینؒ کو اجمیر نہ لے جائیں۔"

لیکن یہ قافلہ اجمیر روانہ ہو گیا، دہلی میں صفِ ماتم بچھ گئی، لوگ زار و قطار رونے لگے اور شہریوں کا جمِ غفیر ان کے پیچھے ہو لیا۔ یہ لوگ رو رو کر واپسی کی درخواستیں کر رہے تھے۔ حضرت خواجہ کا دل پسیج گیا آپ نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا: "قطب الدین بختیار! لوگ تیری مفارقت سے پریشان اور آزردہ خاطر ہیں اتنے بہت سارے قلوب کی خرابی اور خستہ حالی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ تم دہلی ہی میں بود و باش رکھو اور ہم یہ شہر اور تمہیں خُدا کی حفظ و امان میں چھوڑتے ہیں۔"

جب حضرت خواجہؒ تنہا اجمیر جانے لگے تو ایک بار پھر شیخ الاسلام سے ملنے گئے، انھوں نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی۔ حضرت خواجہؒ نے غصّے میں فرمایا: "نجم الدین! شیخ الاسلامی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے تجھے رُسوائی سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔"

یہ کہہ کر آپ اجمیر تشریف لے گئے۔

دہلی ہی میں آپ نے دوسری شادی کی۔ دِن عُسرت اور تنگدستی میں گزرتے تھے سلطان التمش نے کئی بار چند گاؤں جاگیر میں دینے چاہے لیکن آپ نے انکار کر دیا، پڑوس میں بنیا رہتا تھا اس کی دکان سے اُدھار سامان آجایا کرتا تھا۔ ایک دن بنیے کی بیوی نے ازراہِ افتخار حضرت قطب الدینؒ کی بیوی سے کہا: "ہمارا پڑوس تم لوگوں کے لیے نعمت ہے، اگر ہم یہاں نہ ہوتے تو تم لوگ فاقوں مر جاتے۔"

صابر بیوی نے کوئی جواب نہ دیا اور بنیے کی بیوی کا مکالمہ غم و اندوہ سے شوہر کے سامنے دُہرا دیا۔ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر بیوی سے کہا: "اب بقّال سے کچھ بھی نہ لیا جائے گا، ہماری ضرورتیں محدود ہیں جب کھانے کی ضرورت ہو طاق کا پردہ ہٹا کے کاک (تنوری کلچہ نما نان) حاصل کر لیا کرو۔"

اس کے بعد بنیے سے کھانے پینے کا سامان نہیں خریدا گیا اور وقتِ اشتہا طاق سے کاک حاصل کی جاتی رہیں، یہیں سے آپ کاکی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

پھر محویت اور استغراق اس عروج کو پہنچ گیا کہ لڑکے کا انتقال ہوا اور جب بیوی کے رونے کی آواز سُنی تو کسی سے دریافت فرمایا: "یہ کیوں رو رہی ہے؟"

کسی نے جواب دیا: "آپ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے!"

آپ نے افسوس سے کہا: "اچھا۔ ہمیں اس کی علالت کا پتہ نہ تھا ورنہ اس کے لیے دُعا ضرور کرتے۔"

دہلی میں قحط پڑا، لوگ بھوکوں مرنے لگے، سلطان التمش نے اپنے بھانجے سعد الدین کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ منوں آٹے کی روٹیاں لگوا کر بھوکوں میں تقسیم کرے۔ ایک دن نانبائی کی غفلت سے بیشتر روٹیاں جَل جُھلس گئیں۔ سعد الدین نے غفلت کے جُرم میں نانبائی کو گرفتار کر لیا اور اسے قید خانے لے چلا، ایک مجمع ساتھ ہو لیا، ایک طرف سے حضرت کاکیؒ نمودار ہوئے اور لوگوں سے دریافت کیا: "یہ مجمع کیسا ہے اور یہ قیدی کون ہے؟"

لوگوں نے پورا قصّہ سُنا دیا، حضرت کاکیؒ سعد الدین کے قریب گئے اور اس سے کہا: "اگر تیری جلی جُھلسی روٹیاں ٹھیک ہو جائیں تو کیا تُو اس غریب کو چھوڑ دے گا؟"

سعد الدین نے مذاق اُڑایا: "جلی جُھلسی روٹیاں کس طرح ٹھیک ہو جائیں گی؟" پھر ساتھیوں سے کہا: "اس شخص کی بزرگی اپنی جگہ لیکن یہ مُردے کو جلانے کا دعوا کس طرح کر سکتا ہے! جلی جُھلسی روٹیوں کو صحیح حالت میں لے آنے کا یہی مطلب ہوا جیسے کسی مُردے کو جِلا دیا جائے!"

ایک بار رسولِ مقبولؐ نے کسی شخص کو نہایت بامعنی کہانی سُنائی فرمایا :

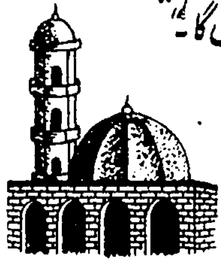
" ایک شخص کے تین دوست تھے۔ یہ شخص سخت بیمار پڑا اور جب مرنے کے قریب پہنچا تو اپنے ایک دوست سے دریافت کیا۔ "دوست اس مشکل وقت میں تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟"

دوست نے بے بسی سے عرض کیا۔ جناب خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ میں نے آپ کا ہمیشہ ہر بُرے وقت میں ساتھ دیا ہے اور عُمر بھر خدمت کرتا رہا ہوں لیکن افسوس کہ موت کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

اُس شخص نے اپنے دوسرے دوست کو طلب کیا اور اُس سے مدد طلب کی۔ دُوسرے دوست نے بے بسی سے عرض کیا۔ "اس مشکل وقت میں مَیں اِتنی ہی مدد کرسکتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ آپ انتقال فرما جائیں تو آپ کو نہلا دُھلا کر آپ کو کفن پہنا دُوں اور خوشبویات میں بسا کر کسی عمدہ سی قبر میں دفن کرکے مزار پھُولوں سے ڈھانپ دوں۔"

اُس شخص نے اپنے تیسرے دوست سے پوچھا۔ "بولو، تم میرا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہو؟"

تیسرے شخص نے جواب دیا۔ "جناب آپ بالکل فکر نہ کریں، میں موت کے بعد بھی آپ کا ساتھ دُوں گا۔ قبر میں آپ کے ہمراہ اُتروں گا اور جب قیامت کے دِن آپ قبر سے نکلیں گے تو اُس وقت بھی میں آپ کے ساتھ ہی ہوں گا۔"



یہ قصّہ سُنانے کے بعد آپؐ نے دریافت کیا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ یہ تین دوست کون ہیں؟"

سُننے والے نے ادب سے نفی میں گردن ہلا دی۔ "یا رسُولؐ اللہ! غلام نہیں جانتا۔"

آپؐ نے ارشاد فرمایا: "پہلے دوست کا نام مال، دوسرے کا عیال اور تیسرے کا اعمال ہے۔"

حضرت کاکیؒ نے قیدی نانبائی سے پوچھا۔ "تیرا تنور کہاں ہے؟ جلی ہوئی روٹیوں کو لے کر تنور تک واپس چل۔"

سعدالدین نے حضرت کاکیؒ کی عظمت کا خیال کیا اور نانبائی اور جلی ہوئی روٹیوں سمیت تنور پر واپس گیا۔ حضرت کاکیؒ نے نانبائی کو اُس کے ٹھیے پہ بٹھا کر روٹیاں دہکتے ہوئے تنور میں جھونک دیں اور اسے اوپر سے بند کردیا۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ سعدالدین ہنسا کہ چلو رہی سہی کسر بھی پُوری ہوگئی۔

نانبائی نے سوچا کہ یہ اچھا ہوا کہ میرے جُرم میں بختیار کاکیؒ میرے ساتھی ہوگئے۔

حضرت بختیار کاکیؒ نے کچھ دیر بعد تنور کا منہ کھولا اور نانبائی کو حکم دیا۔ "اپنی روٹیاں اندر سے نکال لے۔"

نانبائی نے حکم کی تعمیل کی اور روٹیاں نکالنے لگا۔ تمام روٹیاں بالکل صحیح سنکی پکی نکل آئیں۔

حضرت کاکیؒ نے سعدالدین سے فرمایا۔ "اپنی روٹیاں لے اور راستہ دیکھ۔ اِس نانبائی غریب کی جان چھوڑ اور ہمیشہ اس کا خیال رکھ کہ تیرے کسی فعل یا عمل سے بندگانِ خدا کو دُکھ نہ پہنچے۔"

آپ یہ کہہ کر چلے گئے لیکن شام کو سعدالدین دست بستہ حضرت کاکیؒ کی خدمت میں کھڑا یہ درخواست کر رہا تھا کہ "حضرت! خادم کو اپنے حلقۂ خدمت گزاراں میں شامل فرمالیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ثروت اور دولت کا درویشی سے بَیر چلا آتا ہے جب تک تیرے گھر میں یہ چیزیں موجود ہیں تو درویشی کس طرح اختیار کرسکتا ہے۔"

سعدالدین کوئی جواب دیے بغیر واپس چلا گیا اور دوسرے دن پھر حاضر ہوا، نہایت دردمندی سے عرض کیا۔

"حضرت! خادم نے اپنا سب کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کردیا اور شاہی منصب سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اب تو درویش کے دروازے غلام پر وا ہوجانے چاہئیں!"

پاس ہی قاضی حمیدالدین ناگوریؒ موجود تھے۔ آپ نے ان سے کہا۔ "یہ نہیں ملنے گا۔ اِس ضدی کو حلقۂ مریداں میں داخل کرلو۔"

سعدالدین مرید کرلیا گیا اور حضرت کاکیؒ ہی کی خدمت میں رہنے لگا۔

سلطان شمس الدین التمش کی انتہائی دِلی آرزو تھی کہ حضرت بختیار

عارفہ اور ولی اللہ حضرت رابعہؒ بیمار تھیں' عقیدت مند اور ہمعصر بزرگ شخصیات عیادت کے لیے حاضری دے رہی تھیں' حضرت سفیان ثوریؒ بھی جو بذاتِ خود ولایت کے عہدے پر فائز تھے' حاضر ہوئے اور مزاج پُرسی کے بعد دیر تک کلماتِ خیر نکالتے رہے اور آخر میں فرمایا۔ "رابعہ! میں آج شب' تہجد کے بعد آپ کے لیے خدا سے دُعا کروں گا کہ وہ آپ کو شفا عطا فرمائے!"

حضرت رابعہؒ نے جو تسلیم و رضا کا پیکر تھیں' دریافت فرمایا: "سفیان! کیا تمھیں اس پر یقین ہے کہ یہ بیماری خُدا کی مشیت اور مرضی کے مطابق اور اُس کے حکم کی پابند ہے؟"

حضرت سفیانؒ نے جواب دیا: "میرا اس پر ایمان ہے رابعہ!"

حضرت رابعہؒ نے فرمایا: "پھر تم اُسی خدا سے ایک ایسی چیز کیوں طلب کرنا چاہتے ہو جو اس کی مرضی اور حکم کے خلاف ہے۔"

سفیان ثوریؒ نے شرمندہ ہو کر گردن جُھکا لی۔ بولے: "خوب رابعہ! میں شرمندہ ہوں تسلیم و رضا کا جو مقام تمھیں حاصل ہے ہم ابھی وہاں تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔"

کاکیؒ اس کے پاس تشریف لائیں حضرت بختیار کاکیؒ بھی سلطان کے زہد و تقوے کے بہت قائل تھے' ایک دن اچانک سلطان کے روبرو پہنچ گئے' التمش کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی' اسی وقت اِس مجلسِ خاص میں حاکمِ اَودھ رکن الدین حلوائی بھی حاضر ہوا' یہ ذات کا حلوائی سیاست اور حکومت کے میدان میں آ کر بہت اچھا منتظم اور حاکم ثابت ہوا تھا اور اسے سلطان نے اَودھ کی حکومت بخش دی تھی' یہ شخص حضرت بختیار کاکیؒ کے مرتبے سے واقف نہ تھا' مجلسِ خاص میں اپنی نشست کے لیے ایسی جگہ پسند کی جو حضرت بختیار کاکیؒ کی نشست گاہ سے قدرے بلند تھی' سلطان اِس بے ادبی کو برداشت نہ کر سکا' وہ رکن الدین حلوائی کے خلاف کوئی حکم صادر فرمانے ہی والا تھا کہ حضرت بختیار کاکیؒ بھی اصل حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ آپ نے حاکمِ اَودھ حلوائی پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی' پھر سلطان سے فرمایا: "رکن الدین نے اپنے لیے صحیح جگہ کا انتخاب کیا ہے' میں کاک ہوں تو یہ حلوا ہے' اور حلوا ہمیشہ روٹی کے اوپر ہی رہتا ہے۔"

سلطان' حضرت بختیار کاکیؒ کی منشا سے آگاہ ہو گیا اور اس نے رکن الدین حلوائی کو کچھ بھی نہ کہا۔

عرصے بعد سلطان اپنے سپاہیوں کے ساتھ حضرت کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سپاہ حجرے سے دُور رہی اور سلطان آپ کی خدمت میں دست بستہ کھڑا ہو گیا' حضرت کاکیؒ کے ایک طرف حمید الدین ناگوری بیٹھے تھے' دوسری طرف سلطان کا بھانجا سعد الدین موجود تھا۔ سلطان نے حضرت کاکیؒ سے کہا۔ "حضرت کچھ اشتہا ہو رہی ہے کھانا مرحمت فرمائیں۔"

آپ نے اسی وقت گرما گرم کاک پیش کر دیں۔ سلطان نے پوچھا۔ "کیا خالی روٹیاں؟ انھیں کس چیز سے کھاؤں؟"

حضرت کاکیؒ نے حمید الدین ناگوریؒ کو اشارہ کیا' وہ اُٹھے اور وضو گاہ سے کپڑا اُٹھا لائے اور اسے روٹی پر رکھ دیا' غور سے دیکھنے اور کھانے پر پتہ چلا کہ وہ تو لذیذ ترین حلوا ہے۔ سلطان ان کرامتوں سے بہت متحیر ہوا اور اپنے بھانجے سعد الدین سے مخاطب ہوا: "کیوں سعد الدین! تو جوان اتنے دنوں سے یہاں حاضری دے رہا ہے' تو نے بھی ان سے کچھ حاصل کیا یا یوں ہی وقت ضائع کر رہا ہے؟"

سعد الدین نے اپنی گردن جھکا لی اور ایک ہاتھ اپنی بغل میں دے لیا' جب سلطان روٹی کھا چکا تو سعد الدین نے بغل سے ہاتھ نکال کر اپنے ماموں التمش کی طرف بڑھا دیا' اس میں تازہ ترین پان کا بیڑا تھا' سلطان پان کھا کر بہت خوش ہوا اور حضرت بختیار کاکیؒ سے درخواست کی کہ ہمارے سپاہی بھی بھوکے ہیں' اسی طرح انھیں بھی نوازا جائے۔"

حضرت بختیار کاکیؒ نے اسی طرح پورے لشکر کی دعوت کر دی اور سعد الدین نے اسی طرح سب کو پان پیش کر دیے اور وہیں سے سعد الدین تنبولی کے نام سے مشہور ہوئے۔



گھر میں سوائے روٹیوں کے ہر شے کی تنگی تھی' حضرت بختیار کاکیؒ کا آٹھ دس سالہ بیٹا اس تنگی ترشی سے پریشان تھا' اپنے ایک پڑوسی سے اس کا اظہار کر دیا' اس مخلص عقیدت مند نے بہت سارا سامان خرید کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا اور لجاجت سے کہنے لگا: "اس غلام کو آپ کی پریشانی کا ذرا بھی علم نہ تھا ورنہ حضرت کو اتنی پریشانی نہ اُٹھانی پڑتی۔"

آپ نے یہ سامان اسی وقت واپس کر دیا اور انتہائی کرب میں فرمایا۔ "خدایا! تو اُس شخص کی گردن توڑ دے جس نے ہمارے گھر کا راز فاش کر دیا۔"

شام کو خبر آئی کہ حضرت کاکیؒ کے صاحبزادے چھت سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ یہ صاحبزادے سر کے بل گرے تھے جس سے ان کا منکا ڈھل گیا تھا اور گردن ٹوٹ گئی تھی۔ آپ نے اِس خبر پر یہ تبصرہ فرمایا: "اچھا تو وہ یہ تھا' لیکن بخدا مجھے اگر پہلے سے ہی حقیقت کا صحیح علم ہوتا تو شاید میں ایسی بات زبان سے نہ نکالتا' لیکن اب تو جو ہونا تھا' ہو چکا۔"

آپ کو سماع کا بے حد شوق تھا' خدا معلوم' شیخ الاسلام کے اشارے پر یا خود ہی قاضی صادق اور مفتی عماد نے آپ کو منع کیا کہ "موسیقی شرعاً ناجائز ہے آپ سماع سے پرہیز کریں۔"

آپ نے جواب دیا "ہمارے دو معزز مہمان زکریا ملتانیؒ اور جلال الدین تبریزیؒ دہلی آئے ہوئے ہیں ہم نے ان کے لیے محفلِ سماع کا انتظام کیا ہے۔ تم دونوں بھی آجانا، ہم وہیں تمھیں شارعِ اسلامؐ سے سماع سننے کی اجازت دلوا دیں گے۔"

قاضی اور مفتی جز بز ہوئے اور انھوں نے سختی سے کہا "ہم اپنے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد باہر متعین کر دیں گے اور دیکھیں گے کہ آپ کس طرح محفلِ سماع منعقد کرتے ہیں اور لوگ اس میں کس طرح داخل ہوتے ہیں۔"

آپ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو بہت جلد زیرِ زمین چلا جانا ہے۔"

حمید الدین ناگوریؒ نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن آپ کو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے تھے۔

قاضی اور مفتی اپنے اختیارات کام میں لائے اور مشرقی اور جنوبی دروازوں پر پہرے دار سپاہی کھڑے کر دیے اور انھیں یہ حکم دیا کہ "بلا لحاظ مرتبہ و منصب، کسی کو بھی محفلِ سماع میں نہ جانے دیا جائے۔"

لیکن اسی عالم میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ مشرقی دروازے سے اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ جنوبی دروازے سے محفلِ سماع میں داخل ہو گئے، ان کے پیچھے اور بہت سے لوگ بھی اندر آ گئے اور پہرے دار سپاہی اندھوں کی طرح پہرا ہی دیتے رہ گئے۔ جب قاضی اور مفتی کو اس بات کا علم ہوا تو دونوں دل میں بے حد شرمندہ ہوئے اور دونوں خود بھی محفلِ سماع میں پہنچ گئے اور سماع سے ان پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ بے حال ہو گئے۔ اسی شب رسولِ مقبولؐ نے انھیں مطلع کیا کہ انھیں بختیار کی محفلِ سماع میں شرکت کرنی چاہیے!

دونوں نادم و شرمسار جب محفل سے نکلے تو سلطان نے انھیں برخاست کر دیا اور اس کا ان کے دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ اس صدمے اور خجالت نے ان دونوں کی جان لے لی۔

سلطان التمش، جلال الدین تبریزیؒ کی بھی بڑی عزت کرتا تھا۔ شیخ الاسلام کے سینے میں حسد کی آگ پھر بھڑکی۔ صبح کا وقت تھا، ایک غلام زادہ حضرت تبریزیؒ کے تلوے سہلا رہا تھا، شیخ الاسلام نے جو یہ حال دیکھا تو دل میں ایک بار پھر آتشِ حسد جل اٹھی۔ حضرت تبریزیؒ نے ان کے فکر و تردد کو اپنے کشف سے جان لیا، بآوازِ بلند فرمایا "شیخ! اگر تم اور صبح آجاتے تو اس لڑکے کو پیروں کے بجائے میرے پہلو میں دیکھتے۔"

شیخ الاسلام یہ دلیری خاموشی سے جھیل کر چلے گئے لیکن چند ہی دنوں

بابا فریدؒ سے ایک شخص نے، بادشاہ کے نام سفارشی خط لکھنے کی درخواست کی۔ آپ نے چند سطری خط میں لکھا:

"میں نے سائل (حاملِ ہذا) کا معاملہ خدا کے رُو برُو پیش کیا اور اب تیرے سامنے پیش کر رہا ہوں اگر تُو اس کو کچھ دے دے گا تو یہ دَین اللہ کی طرف سے ہوگی اور تو محض ایک واسطہ ہوگا اور اگر اسے یُوں ہی بے نیل و مرام اور مایوس واپس کر دے گا تو یہ روک بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوگی اور تُو محض مجبُور ہو گا۔"

بعد ایک عورت سلطان التمش کی خدمت میں پہنچی اور اس نے رو رو کر سلطان کو یہ منحوس خبر سنائی کہ جلال الدین تبریزی نے میرے ساتھ جبر سے کام لیا ہے اور میں ان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

اس خبر نے ایک تہلکا مچا دیا۔ سلطان بے حد گھبرا گیا، چاروں طرف سے علما اور مشائخ طلب کر لیے گئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھ دیا گیا کہ وہ اس کا فیصلہ کریں۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے بھرے مجمع میں اس عورت سے کہا۔ "عورت! جو کچھ تیرے دل میں ہے، اس کا ہم اللہ والے اپنی زبان سے اظہار نہیں کرنا چاہتے لیکن ہمیں معلوم سب کچھ ہے تو اس مجمع کے سامنے سب کچھ صاف صاف بتا دے، اگر جھوٹ بولی تو اپنے بُرے انجام کو پہنچے گی!"

عورت لرز گئی اور لکنت زدہ آواز میں بولی: "ایسا مجھ سے شیخ الاسلام نے کہلوایا ہے اور اس کے صلے میں انھوں نے مجھے پانچ سو دینار دینے کا وعدہ کیا تھا!"

حضرت زکریا ملتانیؒ نے پوچھا: "وہ پانچ سو دینار کہاں ہیں؟"

عورت نے ایک دُکان دار کا پتہ بتا دیا کہ اس کے پاس رکھے ہیں جو بعد میں مجھے مل جاتے۔

یہ لوگ دکان دار کے پاس پہنچے اس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی۔ سلطان کے لیے اب شیخ الاسلام کا وجود ناقابلِ برداشت تھا، اس نے انھیں فوراً برخاست کر دیا لیکن حضرت بختیار کاکیؒ کی ایما پر کوئی سزا نہیں دی۔ تاریخ میں یہ شیخ الاسلام حاسد نجم الدین صغریٰ کے نام سے مشہور ہو گئے۔



حضرت خواجہ چشتیؒ کو وصال فرمائے دو سال گزر چکے تھے، بختیار کاکیؒ اداس اداس رہتے تھے اسی عالم میں عید آگئی نماز ادا کر کے واپس جو ہوئے

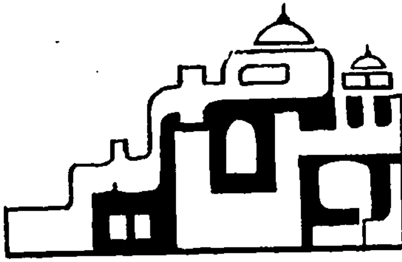
ایک شخص نے رسول اللہ سے کچھ طلب کیا۔
آپ نے دریافت فرمایا "تیرے پاس کچھ ہے؟"
اس نے جواب دیا "ہاں! ایک کمبل، جس کا نصف بچھاتا اور نصف اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ جس سے پانی پیتا ہوں۔"
آپ نے ارشاد فرمایا "جا یہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آ۔"
جب وہ دونوں چیزیں لے کر حاضر ہوا تو آپ نے انھیں دو درہم میں فروخت کر دیا۔ آپ نے یہ دونوں درہم اس کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایک درہم کا تو تو کھانے کا سامان خرید لے اور دوسرے کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آ۔"
اس نے یہی کیا۔ رسول اللہ نے کلہاڑی میں اپنے ہاتھ سے دستہ لگایا اور اسے حکم دیا کہ "جا لکڑی کاٹ کر فروخت کر اور اب میں پندرہ دن تک تیری شکل نہ دیکھوں۔"
وہ شخص چلا گیا اور جب پندرہ دن بعد آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو ضروریاتِ زندگی پر خرچ کرنے کے بعد بھی دس درہم اس کے پاس موجود تھے۔
آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا "تیرے لیے یہ بہتر ہے کہ جب تو قیامت کے دن کھڑا ہو تو تیرے چہرے پر بھیک مانگنے کا بدنما داغ نہ ہو۔ اور ہاں، یہ یاد رکھ کہ سوال کرنا صرف اس شخص کو زیب دیتا ہے جو معذور ہو یا جس کے ذمے کوئی تاوان ہو، یا پھر وہ شخص سوال کرے جس کی گردن پر خون بہا ہو۔"

تو ایک جگہ رک کر کچھ سونگھنے لگے۔ کسی نے پوچھا "یا حضرت! کیا سونگھ رہے ہیں؟"
آپ نے فرمایا "ہمیں یہاں کی زمین سے بوئے عشق محسوس ہو رہی ہے!" پھر اس زمین کے مالک کو طلب کیا اور اس سے یہ زمین خرید لی اور مریدوں سے فرمایا کہ "ہمیں یہیں دفن کیا جائے!"
محفلِ سماع گرم تھی۔ قوال پر بھی وجد کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے لہرا کر یہ شعر ادا کیا:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حضرت بختیار کاکیؒ کی حالت غیر ہو گئی۔ آپ بے ہوش ہو گئے۔ شعر کی تکرار ہوتی رہی اور آپ کا حال متغیر ہوتا رہا۔ پھر تین دن تک یہی کیفیت رہی۔ جب آخری بار ہوش میں آئے تو اس وقت آپ کا سر حمید الدین ناگوریؒ کے زانو پر تھا اور پیر بدرالدین غزنوی کی آغوش میں۔ آپ نے خرقۂ خلافت اپنے غیر حاضر مرید حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کو پہنچانے کا حکم دیا اور وصال فرما گئے۔ چاروں طرف ایک کہرام برپا ہو گیا۔
جب آپ کا جسدِ مبارک نماز کے لیے سامنے رکھا گیا تو خواجہ ابوسعید نامی ایک محرمِ راز نے باآوازِ بلند یہ اعلان کیا کہ "حضرت بختیار کاکیؒ نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ ان کے جنازے کی امامت وہ شخص کرے گا جس نے تمام عمر حرام نہ کیا ہو اور عصر کی سنت اور تکبیرِ اولیٰ کو کبھی ترک نہ کیا ہو۔"
یہ ایک ایسا اعلان تھا جس نے سب کو گونگا کر دیا۔ بڑے بڑے بزرگ اور شیوخ موجود تھے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو حضرت بختیار کاکیؒ کی شرطِ وصیت پر پورا اترتا ہو۔ پھر ایک شخص مجمع سے علیحدہ ہو گیا اور آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چل کر جنازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے رکے رکے لہجے اور رسوا ہو جانے کے احساس سے اپنی زبان کھولی۔
"لوگو! ہمیں بے حد دکھ اور افسوس ہے کہ جس راز کو ہم پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے حضرت بختیار نہیں چاہتے کہ وہ پوشیدہ رہے۔ ہم ان کی وصیت اور حکم کی تعمیل میں امامت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں!"
یہ آواز شہنشاہِ ہند شمس الدین التمش کی تھی۔ جس کے لیے بعد میں پتہ چلا کہ حضرت بختیارؒ کے خلفا میں اس کا نام بھی شامل ہے۔
دہلی کی جامع مسجد سے تقریباً گیارہ میل دور قصبہ مہرولی میں حضرت بختیارؒ آرام فرما رہے ہیں اور ان کی وجہ سے لوگ اس جگہ کو قطب صاحب کہتے ہیں۔ ۵۸۲ھ میں پیدا ہونے والے اس ماوراءالنہری قطب نے جب ۶۳۴ھ میں دہلی میں وصال فرمایا تو اس وقت آپ کی عمر باون سال کی تھی، اور اس مختصر سی مدت میں آپ نے وہ بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا جو ان کے معاصر لمبی عمریں گزار کر بھی نہ حاصل کر سکے۔
بدرالدین غزنوی جن کی آغوش میں آخری لمحات میں آپ کے پیر تھے، لوگوں کو بتایا کہ "وصال سے ذرا پہلے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ حضرت بختیارؒ اپنے حجرے سے نکل کر متبسم آسمان کی طرف محوِ پرواز ہیں۔ جب ہم دونوں کی نظریں ملیں تو انھوں نے فرمایا: بدرالدین! اللہ کے دوستوں کو موت نہیں آتی، وہ جہاں چاہتے ہیں رہتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں! پھر جب میری آنکھ کھلی تو حضرت بختیار کاکیؒ وصال فرما چکے تھے۔"

*



✡ ضیاء تسنیم بلگرامی

سُلطان شہاب الدّین غوری نے ہندوستان

پر دوبار حملہ کیا اور ناکام واپس گیا۔ پرتھوی راج چوہان دونوں مرتبہ حاوی رہا۔ غوری حیران تھا کہ وہ ناکام کیوں ہو رہا ہے کسی امیر نے مشورہ دیا "حضور والا! غزنی کے میر بدر الدین صاحبِ کشف اور مستجاب الدعوات ہیں، کیوں نہ ان سے رُوحانی اعانت حاصل کی جائے!"

بات غوری کی سمجھ میں بھی آگئی' اسے خوب معلوم تھا کہ میر بدر الدین عرف بندگی میاں کے والد بہا الدین زکریّا ملتانی آفاقی گیر شہرت کے مالک ہیں، بیٹا بھی رُوحانی علم ضرور رکھتا ہوگا۔

غوری ہاتھ باندھ کر ان کی خدمت میں کھڑا ہو گیا۔ دل کی رقّت کا اثر چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ دست بستہ عرض کیا "حضرت! اسلام کا حق اس ناچیز پر ہی نہیں' آپ پر بھی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ میں نے پرتھوی راج پر دوبار حملہ کیا لیکن ناکام رہا، کیا آپ کے ہوتے ہوئے آپ کا یہ ناچیز اسی طرح شکست و ندامت اٹھاتا رہے گا۔"

بدر الدّین نے بے باکی سے جواب دیا "شہاب الدین' تیری فوج میں برائیوں کے سوتے کھلے ہوئے ہیں انہیں بند کر' اس کے بعد فلاح کی آس لگا!"

غوری نے عاجزانہ دریافت کیا "خادم حضرت کا اشارہ نہیں سمجھا!"

آپ نے لاپروائی اور حقارت سے جواب دیا "اس میں اشارے کی کون سی بات ہے، تیرے لشکر میں ظلم ہی ظلم ہے عدل نام کو بھی نہیں، جہاں عدل نہیں وہاں کچھ بھی نہیں، جو زمین شور زدہ ہو اس پر فصل کس طرح تیار ہوگی۔"

غوری آپ کے قدموں میں جھک گیا، داہنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھوں سے لگا کر ہونٹوں پر رکھ کر بوسہ دیا، بولا "حضرت! بس اتنی سی بات!! اچھا آج سے آپ میری فوج میں منصبِ قضا پر فائز کیے جاتے ہیں!"

میر بدر الدّین نے پہلے تو منصبِ قضا قبول کرنے میں تامل سے کام لیا، لیکن اب انھیں بھی تنہائی سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی مجبوراً عہدۂ قضاہ قبول کر لیا اور فوج میں ایسا سخت انتظام کیا کہ کوئی شرع و آئین کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔

غوری نے ہندوستان پر تیسرے حملے کی تیاری کی اور فوج کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کو بھی ہندوستان لیتا گیا اور جب پرتھوی راج سے مقابلہ ہوا تو چوہان کو شکست فاش دیکھنی پڑی دہلی مسلمانوں کا دار السلطنت قرار پایا، لیکن بدر الدّین نے دہلی کی سکونت ترک کی۔ عالمِ بالا سے انھیں حکم ملا کہ "ہانسی جاؤ اور لوگوں کی گمرہی دُور کرو۔"

یہ بحکمِ ربّی ہانسی چلے گئے اور ان کی کئی پشتیں بندگانِ خدا کی خدمت میں مصروف رہیں۔ انہی کی نسل کے حضرت سیّد مشرّف نے ہمایوں کا عہد دیکھا۔ اس خاندان میں منصب قضا موروثی چلا آرہا تھا، لیکن سیّد مشرّف نے یہ منصب نہیں قبول کیا۔ رحم دل ہمایوں نے اس خاندان کی عظمت کا خیال کرتے ہوئے جاگیر بخش دی۔ ہمایوں کے بعد اکبر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا تو اپنے مذہبی رُجحان کی وجہ سے کئی صوفیوں کی خدمت میں حاضریاں دیں اور اسی سلسلے میں ہانسی بھی گیا، سیّد مشرّف کے گھر پہنچا، لیکن یہاں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا۔

بادشاہ کی تشریف آوری کوئی معمولی بات نہ تھی، آبادی کے معزز حضرات ادب و تعظیم بجا لائے، لیکن سیّد مشرّف کے خاندان کا ایک شخص بادشاہ سے شانِ بے نیازی سے پیش آیا بادشاہ کو یہ بات شاید شاق نہ گزرتی، لیکن امرا اور مصاحبین خاص نے اس بات کو ہوا دی، بادشاہ نے دریافت کیا "کیا یہ لوگ شاہی

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تاریخِ فرشتہ ◎ انوارِ اولیا ◎ انوارِ اصفیا

محمد قاسم فرشتہ — رئیس احمد جعفری — غلام علی اینڈ سنز

آداب و رسوم سے واقف نہیں ہیں؟"
کسی چاپلوس نے جواب دیا "جہاں پناہ! ہوتے کیوں نہیں لیکن تصوّف اور بزرگی کا ایک خول انھوں نے اپنی شخصیت پر چڑھا رکھا ہے اور حضور کو خود سے برتر نہیں سمجھتے۔"
بادشاہ نے پوچھا "انھیں اس کی کیا سزا دی جائے؟"
اسی چاپلوس نے مشورہ دیا "حضورِ والا! یہ سلطنت مغلیہ کے نمک خوار ہیں اور جنّت مکانی (ہمایوں) نے انھیں جاگیر بخشی تھی، اس نا چیز کی رائے ہے، اگر ان کی جاگیر اور املاک ضبط کر لی جائے تو ان کے دماغ ٹھکانے آجائیں گے۔"
بادشاہ نے حکم دیا "آگرے پہنچ کر یاد دلایا جائے۔"
اس بات چیت کا سید مشرّف کو بھی علم ہوگیا۔ فرمانِ ہمایونی لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کو دکھا کر فرمان ریزے ریزے کرکے ہوا میں اُڑا دیا۔ بادشاہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پوچھا "آپ نے یہ فرمان کیوں چاک کر دیا؟ کیا اتنی جاگیر آپ کے خاندان کی کفالت کو ناکافی تھی، اگر یہ بات تھی تو آپ کو اس کا ہم سے ذکر کرنا تھا کہ ہم اس میں کچھ اور اضافہ کر دیتے!"
بادشاہ کا خیال تھا کہ سیّد مشرّف کو اُس گفتگو کا علم نہیں ہے جو اس کے اور مصاحبین کے درمیان ہو چکی ہے۔
سیّد مشرّف نے جواب دیا "بادشاہ کے والد کی عطا کردہ جاگیر ہمارے خاندان کی کفالت کو کافی تھی لیکن یہ بات ہمیں بالکل پسند نہیں کہ بادشاہ جب ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں تو اس کے مُعاوضے میں ہم سے ادب و تعظیم کی خواہش کریں"
بادشاہ بہت شرمندہ ہوا، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا بادشاہ نے بڑی خوشامد کی کہ جاگیر کا فرمان دوبارہ لے لیا جائے، لیکن یہ تیار نہ ہوئے، بادشاہ نادم اور شرمسار آگرے چلا گیا اور سیّد مشرّف کے خاندان نے عُسرت اور تنگدستی کی زندگی اختیار کی اور کبھی شاہی مراعات اور نوازشات کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھائی
سیّد مشرّف کا انتقال ہُوا تو ان کے صاحبزادے سیّد عطاء اللہ نے ہانسی کی سکونت ترک کی اور نارنول چلے گئے۔ وہاں حضرت نظام الدّین نامی ایک بزرگ بڑی شہرت رکھتے تھے۔ عطاء اللہ ان کی صحبت میں حاضری دینے لگے، دونوں حضرات ایک دوسرے کے مراتب سے آگاہ تھے، لیکن نظام الدّین نارنولی عطاء اللہ سے کچھ زیادہ مرتبہ رکھتے تھے۔
یہیں نارنول میں سیّد عطاء اللہ کی ملاقات راجو خان نامی ترکمان سے ہوگئی یہ شخص ماوراء النہر سے نیا نیا نارنول پہنچا تھا عطاء اللہ سے راجو خان کی اتنی دوستی ہُوئی کہ ترکمان کی بیوی عطاء اللہ کو بھائی کہنے لگی۔ اسی دوران عطاء اللہ کے گھر میں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ یہ اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں مٹھائی لے کر نظام الدین نارنول کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی۔
"حضرت! اس نومولود کے حق میں دُعائے خیر فرمائیں!"
شاہ نظام الدّین نے ذرا سی مٹھائی چٹکی سے اُٹھا کر زبان پر رکھ لی اور فرمایا "عطاء اللہ! میں شادی اور غمی کی چیزیں کبھی نہیں کھاتا، ہمیشہ پرہیز کرتا ہوں، لیکن جس فرزند کی پیدائش تمھارے گھر میں ہوئی ہے یہ کوئی معمولی بچّہ نہیں ہے۔ خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہے!" اس کے بعد مٹھائی کو چباتے ہوئے فرمایا۔ "میں بھی دُعا کرتا ہُوں، تم بھی دُعا کرو، لیکن جو مرتبہ اُسے خدا کی طرف سے مِل چکا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی!"
عطاء اللہ نے بھی شاہ صاحب کی خواہش پر ذرا سی مٹھائی منہ میں رکھ لی۔
نظام الدّین نے پوچھا "اس بچّے کا نام کیا رکھو گے؟"
عطاء اللہ نے جواب دیا "حضرت خود ہی تجویز فرما دیں۔"
نظام الدین نے کہا "شاہ نعمت اللہ۔ یہ اللہ کی نعمت ہے جو تمھارے گھر میں بشکل فرزند وارد ہُوئی ہے۔ اس کا نام نعمت اللہ رکھو۔"
چنانچہ اس بچّے کا نام نعمت اللہ رکھ دیا گیا۔ یہ ابھی چند سال ہی کے تھے کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ راجو خان ترکمان کی بیوی نے نعمت اللہ کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے لیا۔ باپ نے قرآن کی تعلیم دینی شروع کر دی اور اس غیر معمولی بچّے نے چار سال چار ماہ کی عمر میں قرآن پاک پڑھ ڈالا، اس کے بعد گلستان کا درس شروع ہوا۔ یہ ابھی پڑھ ہی رہے تھے کہ راجو خان ترکمان نارنول سے جرجرچ چلا گیا۔ چونکہ بچّہ راجو خان کی بیوی کی سرپرستی میں تھا اس لیے بچّے کی خاطر عطاء اللہ کو بھی جرجرچ جانا پڑا۔
جرجرچ میں عطاء اللہ ایسے بیمار ہوئے کہ زندگی کی اُمید جاتی رہی۔ ایک دن، جبکہ راجو خان گھر پر موجود نہ تھا عطاء اللہ کی حالت اتنی غیر ہُوئی کہ گھڑی دو گھڑی زندہ رہنے کی اُمید بھی

جاتی رہی۔ انھوں نے حالتِ نزع میں راجو خان کی بیوی کو بلایا اور کمزور، تھرتھراتی آواز میں پوچھا "تم مجھے کیا کہتی تھیں؟"

سوگوار خاتون نے افسردگی سے جواب دیا "بھائی"

عطاء اللہ نے نعمت اللہ کا ہاتھ اس سوگوار خاتون کے ہاتھ میں دے دیا، کہا "یہ نعمت اللہ تمھارا بھتیجا ہے، کیا میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر سفرِ آخرت اختیار کر سکتا ہوں؟"

خاتون نے جواب دیا "بھائی عطاء اللہ! جب میں نے آپ کو صدقِ دل سے بھائی کہہ دیا تو آپ کچھ کہیں یا نہ کہیں نعمت اللہ کو میں اپنا بھتیجا ہی سمجھوں گی اور آپ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اپنی اولاد کی طرح رکھوں گی چاہے آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں"

مرنے والے نے اطمینان کی سانس لی اور کچھ دیر ساکت رہ کر پھر زبان کھولی "بہن! ایک بات اور۔"

منہ بولی بہن ان کی صورت تکنے لگی۔ پوچھا "وہ کیا؟ فرمائیے"

عطاء اللہ نے جواب دیا "ایک وصیت ہے، اس پر تمھیں پورا پورا عمل کرنا ہے۔ اگر تم نے اس کے پورا کرنے میں کوتاہی یا تامل سے کام لیا تو یہ سمجھ لینا کہ میں قیامت کے دن تمھارا گریبان پکڑ لوں گا"

منہ بولی بہن نے گھبرا کر پوچھا "بھائی عطاء اللہ! آپ جو کچھ فرمائیں گے۔ میں اس پر بسر و چشم عمل کروں گی، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

عطاء اللہ نے کہا "جب میں مر جاؤں تو تم میرا منہ سیاہ کر دینا۔ کیونکہ میں سیاہ کار اس کا مستحق ہوں، منہ سیاہ کر کے میرے پاؤں میں ایک رسّی باندھ دینا اور اسی حالت میں چوراہے پر پھنکوا دینا۔ کیونکہ مجھ جیسے بُرے انسان کا یہی حشر ہونا چاہیے۔"

ابھی بہن نے جواب میں کچھ کہا بھی نہ تھا کہ عطاء اللہ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور ملکِ عدم کی راہ لی۔

بہن سخت کش مکش میں پڑ گئی۔ یہ عبرت ناک وصیت اور اس پر عمل درآمد کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی اور پھر ایک نرم دل خاتون، عورت تو یوں ہی رحم دل ہوتی ہے۔ جب راجو خان ترکمان آ گیا تو بیوی نے اسے پوری بات بتا دی، اور مشورۃً پوچھا "کچھ آپ ہی بتائیں کہ اس وصیت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے؟"

شوہر نے بہت کچھ غور و فکر کے بعد جواب دیا "میری سمجھ میں اس وصیت کو بس ایک ہی طرح پورا کیا جا سکتا ہے!"

بیوی نے جلدی سے پوچھا "وہ کس طرح؟ خدا کے لیے جلدی سے بتائیں۔ میں تو بہت پریشان ہو رہی ہوں"

راجو خان نے جواب دیا "عطاء اللہ کو غسل دے کر چہرے پر سیاہ کپڑا لپیٹ دیا جائے اور پاؤں میں ایک چٹ باندھ کر گھر ہی میں تھوڑا سا کھینچا جائے۔ اس کے بعد چوراہے پر دفن کر دیا جائے!"

بیوی کا خوشی سے چہرہ کھل گیا۔ اسی وقت شوہر کی تجویز کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔ غسل کے بعد منہ پر سیاہ کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر پاؤں میں ایک مضبوط چٹ باندھ کر انھیں ذرا سا کھسکایا گیا۔ اس عمل کے بعد انھیں کفن میں لپیٹ کر بیچ چوراہے پر دفن کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے جب راجو خان ان کے مزار پر چراغ جلانے جاتا تھا تو قبر کی پائنتی رکھا ہوا چراغ خود بخود روشن ہو جایا کرتا تھا۔ راجو خان نے اس راز کو جاننے کی بڑی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔

منہ بولی بہن نے نعمت اللہ کو اپنے بچوں کے ساتھ نہایت پیار و محبت سے رکھا اور یہ راجو خان کے بچوں کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تیرہ برس کی عمر میں اس ترکمان نے انھیں فنِ سپاہ گری میں طاق کر دیا۔ شمشیر بازی، تلوار زنی اور تیر اندازی میں نعمت اللہ کا جواب نہ تھا۔

ایک دن نعمت اللہ ایک سرکاری عہدے دار دوست محمد خان کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک زمیندار حاضر ہوا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ دوست محمد خان کے ذمے زمینداروں سے مال گزاری وصول کرنے کا کام تھا۔ دوست محمد خان نے زمیندار سے شکایت کی کہ تم مال گزاری نہیں داخل کر رہے ہو۔ حکومت تمھارے خلاف سخت کارروائی کرنے والی ہے!"

زمیندار نے عاجزی سے عرض کیا "جناب! ہمارے ساتھ اپنا آدمی کر دیں۔ ہم مال گزاری کی رقم اس کے حوالے کر دیں گے"

دوست محمد خان نے اپنے عملے کے چند دلیر آدمیوں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں یہ حکم پایا جاتا تھا کہ "اس زمیندار کے ساتھ جاؤ اور مال گزاری وصول کر لاؤ!"

لیکن اس کے عملے نے نظریں چرا لیں۔ کیونکہ یہ لوگ

خوب اچھی طرح واقف تھے کہ زمیندار اپنے علاقے میں لوگوں کو لے جا کر کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے، مار پیٹ کر واپس کر دیتے ہیں۔ نعمت اللہ نے عملے کی بزدلی دیکھ کر عرض کیا "جناب! میرا جی چاہتا ہے ذرا میں بھی سیر و تفریح کر لوں۔ اگر اجازت ہو تو اس زمیندار کے ساتھ میں چلا جاؤں اور مال گزاری کی رقم لے کر واپس آجاؤں!"

دوست محمد خان اٹھ کر اندر چلا گیا اور وہاں نعمت اللہ شاہ کو طلب کیا۔ چپکے چپکے سمجھاتا ہوا بولا "میاں صاحبزادے! تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔ کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ زمیندار لوگ سرکاری آدمیوں کو اپنی زمین پر لے جا کر بہت زیادہ خوار اور ذلیل کرتے ہیں۔ تم ابھی نوعمر ہو معلوم نہیں یہ زمیندار تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ اگر اس نے تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچا دیا تو آخر میں تمھیں کہاں سے لاؤں گا؟"

نعمت اللہ نے جواب دیا "کیا آپ خدا کی طرف سے انسانی جانوں کے تحفظ کی خدمت لے کر آئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو میں کہیں بھی نہ جاؤں گا یہیں رہوں گا!"

دوست محمد خان نے جواب دیا "صاحبزادے! تم ضرورت سے زیادہ منطقی ہو۔ بھلا ایک فانی انسان دوسرے فانی انسانوں کی جانوں کا تحفظ کس طرح کر سکتا ہے؟"

"اگر یہ بات ہے تو مجھے اس شخص کے ساتھ جانے دیجیے جس نے ہمیں جان دی ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا"

دوست محمد خان اس نوعمر بچے کی بات سے عاجز اور بے بس ہو گیا اور مجبوراً زمیندار کے ساتھ چلے جانے کی اجازت دے دی۔ زمیندار انھیں ساتھ لے کر اپنی زمین پر چلا گیا اور اس نے نعمت اللہ کو چارپائی پر بٹھا کر اندر جاتے ہوئے کہا "صاحبزادے! آپ ذرا دم لیں، میں روپے جمع کر کے ابھی حاضر کرتا ہوں!"

نعمت اللہ نے تیکھے لہجے میں کہا "جناب والا! میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا، سرکاری واجب الادا رقم وصول کرنے آیا ہوں، آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ ہماری رقم لے کر ہمارے پاس آجائیں"

زمیندار نے کہا "ہم نے تمہاری دعوت کا انتظام کیا ہے پہلے کچھ کھا پی لو۔ اس کے بعد مال گزاری کی رقم بھی تمہارے حوالے کر دی جائے گی"

ابھی نعمت اللہ نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ زمیندار اپنی حویلی میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کا طشت لے کر حاضر ہو گیا۔ نعمت اللہ نے پوچھا "رقم لائے؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا "کھانا حاضر ہے، پہلے اسے نوش فرمالیں!"

نعمت اللہ نے غصے میں زمیندار کی پشت پر کئی بیت رسید کر دیے۔ زمیندار تلملا گیا، لیکن اپنی تکلیف کا احساس کیے بغیر اس نے نعمت اللہ سے کہا "بیٹے! تم ہمارے مہمان ہو ہم تمہاری مار بھی برداشت کر لیں گے اور یہی کہے جائیں گے کہ پہلے کچھ نوش فرمالو، اس کے بعد مال گزاری کی رقم دی جائے گی"

نعمت اللہ نے سوچا، عجیب ضدی سے واسطہ پڑا ہے۔

بدرجۂ مجبوری کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ زخمی زمیندار نے آگے بڑھ کر نعمت اللہ کے ہاتھ دھلائے اور جب یہ کھانا کھانے لگے تو خود سامنے بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگا۔ نعمت اللہ زمیندار کے اخلاق اور رویے سے بے حد متاثر ہوئے۔ لقمے منہ میں جا رہے تھے، دانت انہیں چبانے میں مصروف تھے، لیکن نعمت اللہ کے دل اور دماغ کہیں اور ہی تھے۔ وہ سوچ رہے تھے "نعمت اللہ! تو کیسا سرکش بندہ ہے کہ اس نرم دل اور خوش اخلاق زمیندار سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ ذرا سوچ تو ذرا کہ اس کی پشت تیرے تازیانوں کی ضربات سے لہولہان ہو چکی ہے۔ لیکن یہ فرشتہ صفت انسان اس کی پرواہ کیے بغیر پوری رغبت اور پیار سے تجھے کھانا کھلانے میں مشغول ہے۔ کیا یہ دُنیا چند روزہ نہیں ہے؟ کیا اس چند روزہ زندگی میں اپنے اُس خالق سے بے نیاز اور غافل رہنا جائز ہے جو اس زمیندار سے زیادہ عفو و درگزر کرنے والا ہے"

کھانے کے بعد نعمت اللہ نے زمیندار سے مال گزاری کی رقم وصول کی اور خاموشی سے دوست محمد خان کے حوالے کر دی۔ دوست محمد خان نے چُپ چُپ نوجوان سے پوچھا "نعمت اللہ تم چُپ کیوں ہو؟ زمیندار نے تمہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟"

نعمت اللہ نے جواب دیا "ہاں اس نے مجھے جس قسم کا اضطراب بخشا ہے اس کا بیان میرے بس کی بات نہیں ہے اس نے مجھ سے میری دُنیا چھین لی، دوست محمد خان! وہ زمیندار نہیں، تازیانۂ عبرت تھا جو میرے غافل اور لاپرواہ دل و دماغ پر شدید ضربیں لگا کر ہٹ گیا!"

دوست محمد خان اس نوجوان کی باتیں نہیں سمجھ سکا۔

افکار اور تردد میں ڈوبا ہوا یہ نوجوان جب رات کو اپنی خواب گاہ میں داخل ہوا تو اس کا یہ عالم تھا کہ دل پر مایوسی اور مادی دنیا کی بے وقعتی کے گھونسے لگ رہے تھے اور وہ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ بالکل اس طرح چل رہا تھا گویا کوئی شرابی نشے میں دھت بستر پر جا رہا ہو۔ لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا ہوش و حواس سے محروم، گم صم، بستر پر اوندھے منہ گر کر وہ دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر، جب آنسوؤں کے ذریعے دل کا بوجھ کسی حد تک بہہ گیا۔ تو یہ منفعل نوجوان اٹھا اپنی تلوار، کٹار، ترکش، کمان جسم پر سجائے اور چند اشرفیاں پاس رکھ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے تھوڑی دیر عبادت کی۔ پھر فجر کی نماز ادا کی۔ دریا کے دوسرے کنارے، مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا، چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور نرم اور ملائم صبح کی لذت سے نعمت اللہ کا دل معمور ہو رہا تھا۔

اسی عالم میں ایک سمت سے راجو خان کا ایک ملازم نمودار ہوا۔ یہ انھیں دیکھتے ہی ان کے پاس بھاگ کر پہنچا اور رو رو کر کہنے لگا: "جناب والا! آپ کا کیا ہے۔ آپ تو چپ چاپ یہاں تشریف لے آئے، مجھ سے تو پوچھیے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے، چاروں طرف آپ کی تلاش جاری ہے! راجو خان نے ہمیں حکم دیا ہے کہ میں آپ کو کہیں سے بھی تلاش کر کے اس کی خدمت میں حاضر کردوں۔ براہ کرم آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔"

انھوں نے مایوسی سے جواب دیا: "میں جس دنیا کو لات مار چکا ہوں اس میں دوبارہ کس طرح واپس جا سکتا ہوں۔ یہ کام نہ تو مجھے پسند ہے اور نہ ہی میرا خدا پسند کرے گا!"

ملازم نے جواب دیا: "اگر آپ میرے ساتھ واپس نہیں چلیں گے تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہو لوں۔"

"یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"بالکل اسی طرح، جس طرح آپ نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور اس ویرانے میں نکل آئے!"

آپ کچھ دیر تک خاموشی سے سوچتے رہے، پھر کہا: "اچھا پھر ایسا کرو کہ مجھے دو اشرفیاں دے دو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ واپس چلتا ہوں!"





نے زمانے کی شکایت کی، حضرت علیؓ نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا، فرمایا "زمانے کو برا مت کہو!"

کسی نے کہا: "زمانے سے ہمیں کئی شکایتیں ہیں لیکن سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ یہ ہمیں یاد نہیں رکھے گا۔"

آپؓ نے فرمایا: "تم زمانے پر احسان کرو، یہ تمھیں یاد رکھے گا!"

کسی نے کہا: "ہم نے لوگوں پر احسان بھی کیے لیکن زمانے نے انھیں بھی بھلا دیا!"

حضرت علیؓ نے فرمایا: "بار بار احسان کرو۔ احسان کرنے میں کبھی نہ تھکو، پھر دیکھنا یہ تمھیں کوشش کے باوجود بھلانے میں ناکام رہے گا۔"



ملازم نے بے بسی سے جواب دیا: "اس وقت تو میرے پاس چاندی تک کا سکہ نہیں، دو اشرفیاں کہاں سے لاؤں گا!"

آپ نے پوچھا: "کہیں سے بھی تو دو اشرفیوں کا انتظام کر سکتا ہے؟"

ملازم نے جواب دیا: "بالکل کر سکتا ہوں، آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔ میں وہیں دو اشرفیاں فراہم کر دوں گا!"

آپ نے مسکرا کر بے نیازی سے جواب دیا: "پہلے گھر سے دو اشرفیاں لے آ، اس کے بعد مجھے واپس لے چلنا، اشرفیوں کے بغیر تو میں ایک قدم بھی گھر کی طرف نہ اٹھاؤں گا!"

ملازم نے کہا: "اچھا آپ یہیں ٹھہریے، میں ابھی واپس آتا ہوں!"

وہ اشرفیاں لینے گھر گیا، اور یہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے ایک جگہ انھوں نے خربوزے والے کے گرد چند آدمی بیٹھے دیکھے انھوں نے اپنے پاس کی رقم خربوزے والے کے حوالے کی اور اس سے کہا: "ان سب کو پیٹ بھر کے خربوزے کھلا دے!"

خربوزے والے کو اشرفیاں مل گئی تھیں، اس نے نہایت خوشی سے ان سب کو خربوزے کھلائے۔ پھر آپ نے ان لوگوں سے

پوچھا "تم میں سے کون ہے جسے ہتھیاروں کا شوق ہو؟"
کئی آدمیوں نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ "ہمیں ہتھیاروں کا بے حد شوق ہے!"

آپ نے اپنے ہتھیار، ان کے حوالے کر دیئے اور وہاں سے حیدر آباد دکن چلے گئے وہاں حضرت شیخ محمدؒ کا بڑا شہرہ تھا، نعمت اللہ نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور مریدی کا شرف حاصل کیا۔

حضرت شیخ محمدؒ نے ان سے ایک عجیب سوال کیا، پوچھا "میاں صاحبزادے! کیا تم نے ظاہری علوم حاصل کر لیے؟"

آپ نے سچ سچ عرض کر دیا کہ "نہیں"، لیکن ابھی پوری طرح نہیں کہہ پائے تھے کہ پیر نے کہا۔
"وہ بھی کمال کے لوگ ہیں، علومِ ظاہری تو حاصل کیے نہیں اور راہ طلب میں نکل کھڑے ہوئے۔ بھلا ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ علم کے بغیر کبھی بھی کوئی چیز ہاتھ لگی ہے۔ یہاں تک کہ خدا بھی نہیں۔ بے علم نتواں خدا را شناخت!"

نعمت اللہ شرم سے پانی پانی ہو گئے، بولے "بہتر ہے حضور والا! میں بعد فراغت تعلیم دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت میں اس لائق ضرور ہو چکا ہوں گا کہ آپ مجھ پر عنایات کر سکیں۔"

اس کے بعد نعمت اللہ نے دولت آباد کا رخ کیا جہاں جبریل نامی ایک مشہور عالم رہتا تھا۔ فلسفہ و حکمت کا پیکر، فکر و دانش کا مجسمہ، جہاں بڑے بڑے لائق و فائق لوگ علم کی تشنگی بجھانے آیا کرتے تھے۔ جبریل نے نعمت اللہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور شرح ملّا جامی سے تدریس شروع کی۔ ہونہار اور ذہین شاگرد بہت جلد فلسفہ اور منطق میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ جبریل کے دل پر شاگرد کی خداداد ذہانت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ استاد اپنے شاگرد کو اُستاد کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ جبریل نے ایک دن اپنی خوشی کا یوں اظہار کیا کہ پہلے تو شاگرد کی پشت تھپتھپائی، پھر کہا "اخوند (استاد)! خدا کی قسم میرا یہ جی چاہتا ہے کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے اسے لقمہ بنا کر تمہارے اندر منتقل کر دوں!"

اور ہوا بھی ایسا ہی، غالباً یہ بات اُستاد خود نہیں کہہ رہا تھا، خدا کہلا رہا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد اُستاد کے سکھانے پڑھانے کے لیے کچھ بھی نہ رہ گیا تھا، شاگرد استاد سے کچھ زیادہ ہی جان گیا تھا

جبریل کی بیوی اور نوجوان لڑکی، دونوں ایران میں تھے۔ اس ہونہار شاگرد کے لیے اُستاد کے دل میں اتنی جگہ پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے شاگرد ہی سے کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ شاگرد تمام علوم حاصل کر چکا تھا اور اب رخصت ہونے والا تھا اور بیٹی پاس نہ تھی۔ اُستاد بہر حال اُستاد تھا، اس نے اس مشکل کا حل بھی نکال لیا۔ ایک دن نعمت اللہ سے کہا "نعمت اللہ! تم میرے شاگرد ہو اور میں اُستاد، تم اپنے اُستاد کے مرتبے سے تو بخوبی واقف ہو گے؟"

نعمت اللہ نے سعادت مندانہ عرض کیا۔ "خوب اچھی طرح کوئی خدمت میرے لائق ہو تو اس کا حکم فرما دیں!"

جبریل نے کہا "میری بیوی ایران میں ہے اس کے ساتھ میری بیٹی بھی ہے۔ میں تمہیں اس کا پتہ دیتا ہوں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے آؤ!"

نعمت اللہ نے پتہ لیا اور ایران چلے گئے اور چند ماہ بعد دونوں کو لے کر واپس آ گئے اسی دوران دولت آباد کے صوبے دار کا نائب انتقال کر گیا۔ اسے اس خالی جگہ کے لیے کسی لائق شخص کی ضرورت تھی۔ اس نے جبریل سے مشورہ کیا تو استاد نے نعمت اللہ کا نام پیش کر دیا صوبے دار نے کہا "نعمت اللہ کو ساتھ لے کر کل آ جائیے!"

جبریل نے وعدہ کر لیا لیکن جب اس کا ذکر نعمت اللہ کے سامنے آیا تو انھیں رنج پہنچا۔ ان کا دل پہلے ہی دنیا سے بیزار تھا۔ وہ دنیاداری میں الجھنا پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے اسی رات رختِ سفر باندھ دیا اور رات کی تاریکی میں حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ پیر کی خدمت میں حاضری دی۔ پیر نے اس پڑھے لکھے مرید پر خصوصی توجہ دی اور ذکر اشغال میں کامل کر کے فیروز پور جانے کا حکم دیا۔

جب یہ فیروز پور جا رہے تھے تو پیر نے انھیں ذرا دیر روک کر پوچھا "کیا تم روحانیت میں کامل ہو چکے؟"

نعمت اللہ نے جواب دیا "آپ کی موجودگی میں یہ ناچیز اتنا بڑا دعوا کس طرح کر سکتا ہے!"

پیر اس جواب سے بہت خوش ہوئے کہا "آفرین تم خود کو کبھی بھی کامل نہ سمجھنا بلکہ یہ سمجھو کہ تمہیں میری طرف سے کاسۂ گدائی عطا کیا گیا ہے اس میں جہاں کہیں سے بھی اچھی باتیں

ملیں، ڈال لینا، خود کو غنی نہ سمجھنا، ہمیشہ تشنگی برقرار رکھنا۔"

نعمت اللہ فیروز پور پہنچے اور سولہ برس اس کے نواح کے جنگلات میں عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ جذب کا عالم طاری ہوا تو لباس تک کا ہوش نہ رہا۔ سولہ برس تک کپڑے یوں بھی ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ جسم پر لباس نام کا ایک تار تک باقی نہ رہا اور یہ سردی، گرمی اور برسات سے بے نیاز برہنہ جسم لیے ریاضت میں مشغول رہے۔ آخر کے چار برس تو ایسے گزرے کہ جنگل سے قریب ریگستان میں چلے جاتے۔ سر پر پتوں کی ٹوپی رکھتے اور نچلے نصف جسم کو ریت میں دھنسا دیتے اور تیمم کر کے نماز ادا کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ عالمِ جذب سے گزر کر سلوک کی منزل میں داخل ہو رہے تھے۔ اس کے بعد آبادی میں جانے کا خیال آیا، جنگل سے باہر نکلے، ایک شخص کو بلا کر ستر پوشی کے لیے کپڑے مانگے، اس نے پھٹا پرانا لباس دیا اور ساتھ ہی سوئی دھاگا بھی دیا کہ خود ہی ٹھیک کر کے پہن لو۔ یہ ان چیتھڑوں میں فیروز پور آبادی میں داخل ہوئے۔ یہاں کچھ دن رہ کر اکبر آباد چلے گئے، اکبر آباد سے حیدر آباد گئے اور پیر کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوئے۔ کچھ دن رہ کر خاندیش چلے گئے۔ یہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے کہ ایک کچے مکان سے لڑکیوں کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ لڑکیاں چکی پیس رہی تھیں اور گیت گا رہی تھیں، ان کا گیت نعمت اللہ کو بہت اچھا لگا۔ یہ کھڑے ہو کر سننے لگے پھر اچانک خیال آیا کہ اس طرح کھڑا دیکھ کر لوگ انھیں کیا کہیں گے۔ یہ آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ اندر سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے انھیں نظر بھر کے دیکھا اور عرض کیا "شاہ صاحب! کہاں سے آنا ہوا ہے؟ تشریف رکھیے کچھ کھانے پینے کے لیے حاضر کروں؟"

نعمت اللہ نے جواب دیا "لڑکی! ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں جہاں ٹھہر گئے۔ وہی ہمارا ٹھکانا ہو گیا۔ ہم پیاسے ہیں کیا تو ہمیں پانی پلا سکتی ہے؟"

لڑکی بھاگی بھاگی اندر گئی اور واپس آ کر بصد ادب آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا۔ آپ نے پانی پی کر دعا دی "لڑکی! تو خوش رہے، خدا تجھے صاحبِ اولاد کرے!"

لڑکی شرما گئی کیونکہ ابھی وہ کنواری تھی۔ شاہ صاحب نے فرمایا "شرماؤ مت۔ خدا تجھے صاحبِ اولاد بھی کرے گا اور صاحبِ ثروت بھی!"

لڑکی نے انھیں بہت بہت روکنا چاہا لیکن یہ پھر حیدر آباد پیر کی خدمت میں واپس گئے۔ اور کچھ دن رہ کر گجرات چلے گئے۔

گجرات کے شاہ عالم نامی بزرگ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے حجرے میں ان کے قیام کا بندوبست کیا۔ شیخ شاہ عالم کا لڑکا شیخ جلال ان کا اتنا معتقد ہوا کہ انہی سے طریقہ سلوک کی تربیت حاصل کی۔ شاہ نعمت اللہ گجرات میں ایک عرصے تک مقیم رہے یہاں تک کہ شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ نعمت اللہؒ نے شیخ جلال کی محبت اور سکون اور طمانیت کی خاطر گجرات ہی میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ انہی دنوں مغل فرماں روا جہانگیر گجرات پہنچا اور شیخ جلال نے بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ بادشاہ نے پوچھا "کیا شاہ نعمت اللہ واقعی کوئی بڑے مرتبے کے بزرگ ہیں؟"

شیخ جلال کے ساتھ ہی کئی دوسرے مقربین خاص نے بھی یہی جواب دیا "شاہ نعمت اللہ ولی ہیں اور آج ان کے پائے کا بزرگ دور دور نہ ملے گا!"

سطوتِ شاہی تمکنت سے گویا ہوئی "وہ انھیں ہمارے حضور میں پیش کیا جاتے!"

شاہ نعمت اللہ کو بادشاہ کی یہ ادا پسند نہ آئی سرد مہری سے جواب دیا "ہم دونوں کی حیثیتوں میں بعد القطبین ہے پھر ہم ایک دوسرے سے کس طرح مل سکتے ہیں!"

جب یہ جواب جہانگیر تک پہنچایا گیا تو وہ بہت جزبز ہوا، شاہ صاحب کے روحانی مرتبے سے ڈرتا بھی تھا اور کسی نہ کسی طرح ملاقات بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجبوراً یہ منصوبہ بنایا حضرت شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے پہنچے اور وہیں شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کرے۔ شاہ صاحب بھی بادشاہ کی منشا سے آگاہ ہو گئے بادشاہ جیسے ہی وہاں پہنچا شاہ نعمت اللہ دوسرے دروازے سے نکل گئے۔ بادشاہ کو شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکنے کا بہت ملال ہوا۔ وہ کئی دن تک ملاقات نہ ہو سکنے کے ملال سے افسردہ رہا۔ آخر اپنے درباری امیر خان جہاں سے کہا "خان بابا! ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کریں۔ اس سلسلے میں ہماری دونوں کوششیں ناکامی کی نذر ہو گئیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے۔"

خان جہاں نے گردن جھکا کر ہاتھ باندھ لیے، آہستہ سے

جواب دیا "جہاں پناہ ملول نہ ہوں۔ یہ ناچیز اسی وقت شاہ صاحب کے پاس جاتا ہے اور انھیں کسی بھی طرح بادشاہ سلامت کی ملاقات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے!"

خان جہاں شاہ نعمت اللہ کی خدمت میں مؤدبانہ باریاب ہوا اور اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد بادشاہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ بولا۔ "بادشاہ کی دین داری اور فقرا نوازی کا جواب نہیں اور خصوصی طور پر جہاں پناہ آپ کی ذات سے تو کچھ غیر معمولی لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی حسنِ عقیدت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ صاحب کی حاضری کی قید بھی اڑا دی ہے وہ فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب ہمیں جب بھی چاہیں اپنے غلاموں کی طرح طلب فرمالیں۔ بادشاہ کے اس اشتیاق کو دیکھ کر ناچیز کے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ دونوں کی ملاقات کا اہتمام اور انصرام یہ گناہگار خود اپنے ہاتھوں کرا سکتا ہے اگر اسے اس حقیر کی درخواست سمجھ کر قبول فرمایا جائے تو یہ عین مُرید نوازی ہو گی!"

شاہ صاحب نہایت انہماک سے خان جہاں کی تقریر سنتے رہے جب موصوف نے ذرا دم لیا تو آپ نے زبان کھولی۔ فرمایا "خان جہاں! ہم تم سے ایک سوال کریں گے اس کے جواب پر اس ملاقات کا انحصار ہے!"

خان جہاں نے خوش ہو کر دریافت کیا "بندے کو جھوٹ بولنے کی تو عادت ہی نہیں، جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔"

آپ نے پوچھا "خان جہاں! یہ بتاؤ صحبت اثر کرتی ہے یا نہیں؟"

خان جہاں نے جواب دیا "صحبت کا اثر امرِ مسلّمہ ہے؟"

آپ نے کہا "پھر یہ بتاؤ کہ کہاں ایک بادشاہ اور کہاں ایک فقیر بے نوا۔ اگر اس کی صحبت نے مجھ پر اثر کیا تو میری گدڑی چھن جائے گی اور اگر میری صحبت نے بادشاہ کو زیرِ اثر لے لیا تو امورِ سلطنت میں خرابی پھیلے گی اور رعیّت تباہ و برباد ہو جائے گی، اب ایمانداری سے یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کی ملاقات ایک دوسرے کے لیے کتنی مضر اور تکلیف دہ ثابت ہو گی!"

خان جہاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ خاموشی اختیار کی۔ کچھ دیر بعد فکر مند لہجے میں سوال کیا "حضرت! یہ تو فرمائیں کہ یہ عاجز بادشاہ کو کیا جواب دے؟"

آپ نے جواب دیا "تم میرے وکیل ہو، میری طرف سے بادشاہ سے عرض کر دو کہ وہ مجھے خواہ مخواہ تکلیف نہ دیں، ہم دونوں

جُنید بغدادیؒ

کے پاس ایک شخص دینار کی ایک تھیلی لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے سوال کیا۔ "کیا تیرے پاس اس تھیلی کے سوا بھی دینار ہیں؟"

اس نے جواب دیا "ہاں، بہت سارے دینار ہیں!"

آپ نے سوال کیا "کیا تو اور دینار بھی چاہتا ہے؟"

وہ شخص سمجھا کہ اس نے جو دینار دیتے ہیں اس سے خوش ہو کر جنید بغدادیؒ اپنے فیضِ روحانی سے اسے کوئی بڑا خزانہ بخشنے والے ہیں۔ بولا "حضرت! بس آپ کی نظرِ کرم درکار ہے، دولت کی طمع بھی کہیں جاتی ہے!"

آپ نے وہ تھیلی اُٹھائی اور اسے دیتے ہوئے فرمایا "پھر اس تھیلی کا تو ہی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ میں کہاں کسی مستحق کی تلاش میں نکلوں گا!"

کی حیثیت دو متوازی لکیروں جیسی ہے جو کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گی۔"

ایک بار جہانگیر نے اپنے علما کو حکم دیا کہ قرآن پاک کا ایک ایسا ترجمہ کیا جائے کہ جتنے حرف قرآن پاک میں ہیں اتنے ہی ترجمے میں بھی ہوں۔

علما کی ایک جماعت سر جوڑ کر بیٹھی اور بدقّت تمام ڈھائی سپاروں کا ترجمہ شاہی فرمان کے التزام سے مکمل کیا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے اپنی عاجزی کا اظہار کیا۔ آخر میں دبے لفظوں بادشاہ سے یہ بھی کہا کہ "اگر شاہ نعمت اللہ چاہیں تو یہ کام پورا کر سکتے ہیں" بادشاہ کے دل میں شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکنے

کا کانٹا پہلے ہی چبھ چکا تھا، مایوسی سے کہا "شاہ صاحب ہم سے ملنا تو گوارا کرتے نہیں، ہمارے کہنے سے ترجمہ کیا کریں گے!"

علما میں سے کسی نے کہا "مقربانِ شاہی میں سیّد جلال الدین حضرت شاہ صاحب کے مرید ہیں اور وہ ان کا بے حد خیال کرتے ہیں اگر سیّد جلال ان سے کہیں تو یہ کام ضرور پورا ہو جائے گا!"

بادشاہ نے سیّد جلال کو حکماً لکھا کہ "یہ کام شاہ نعمت اللہ سے کسی بھی طرح کرایا جائے!"

سید جلال اُداس اور افسردہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اس نئی افتاد کا ذکر کیا۔ شاہ صاحب تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر بولے "اچھا اگر اس کام پر تمہاری ملازمت شاہی کا انحصار ہے تو میں یہ کام کر دوں گا لیکن تم بادشاہ سے یہ پوچھ لو کہ قرآن میں جہاں جہاں قصّے بیان ہوتے ہیں کیا ان کے نوٹ اور حاشیے کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

جہانگیر نے جواب میں کہلا دیا کہ "صرف ترجمہ کیا جائے حواشی کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے کہ اصل عبارت اور ترجمے کی عبارت کے حروف برابر ہوں۔"

حضرت شاہ صاحب نے اجازت پاتے ہی ترجمے کا کام شروع کر دیا اور دو ماہ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ بادشاہ کے حکم پر علمائے وقت نے حروف شماری کی تو دونوں برابر نکلے۔ جہانگیر اس کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اشتیاقِ ملاقات میں اور اضافہ ہو گیا اس ترجمے کا نام "ترجمہ جہانگیری" رکھا گیا۔ جب جہانگیر کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی تو اس نے غصے میں سید جلال کو ملازمت سے سبکدوش کر کے جاگیر ضبط کر لی اور انھیں یہ حکم دیا کہ "اگر تم شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کرا دو تو تمھیں تمھارے منصب پر پھر بحال کر دیا جائے گا اور جاگیر دوبارہ بخش دی جائے گی!"

سید جلال روتے ہوئے گھر پہنچے اور شاہ صاحب کو پوری بپتا سنا دی۔ آپ نے مکدّر ہو کر فرمایا۔

"اچھا تم زیادہ ملال نہ کرو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری ملاقات کے بغیر بادشاہ کی عنایت تم پر نہ ہو گی تو تم اس کی ذرا بھی فکر نہ کرو میں کچھ کروں گا۔ سردست تم بہت زیادہ تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو شاید دھوپ میں آنے سے تم کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے ہو تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

اس کے بعد آپ نے ایک خدمت گار کو حکم دیا "جب جلال لیٹ جائے تو تم پنکھا جھلنا!"

سیّد جلال لیٹ گئے اور خدمت گار پنکھا جھلنے لگا۔ یہاں تک کہ سید جلال پر غنودگی طاری ہوئی اور وہ سو گئے۔ شاہ صاحب نے اٹھ کر قلمدان سنبھالا اور سید جلال کے نام ایک خط لکھا۔

"سید جلال! میں تمہاری مشکلات کا غوث الثقلین (دونوں جہان میں مددگار) ہوں۔ تم مطمئن رہو تمھارے تمام کام حسبِ خواہش ہو جائیں گے مجھ کو ہمیشہ اپنا معین و مددگار سمجھو۔ اب ہم تم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہیں، حشر میں ملاقات ہو گی، اس سے پہلے نہیں۔ فقیر نعمت اللہ"۔

شاہ صاحب نے یہ رقعہ قلمدان میں رکھا اور سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔

سیّد جلال کی ملازمت پھر بحال ہو گئی اور جاگیر کی واگزاشت کا شاہی فرمان بھی جاری ہو گیا انھیں شاہ صاحب کی جدائی کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ کچھ عرصے تک انھیں اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے اور جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو شاہ صاحب کا رقعہ نکال کر پڑھنے بیٹھ گئے اور دیر تک روتے رہے۔

شاہ صاحب گھومتے پھرتے پھر اس گاؤں میں پہنچے جہاں مدتوں پہلے ایک پنہاری نوجوان لڑکی نے انھیں پانی پلا کر دعائیں حاصل کی تھیں۔ اب وہاں کچے مکان کی جگہ عالیشان محل کھڑا تھا کسی عورت نے شاہ صاحب کو پہچان لیا اور اس لڑکی کو شاہ صاحب کی تشریف آوری سے مطلع کیا، اب وہ لڑکی عورت بن چکی تھی۔ وہ بدحواس بھاگتی ہوئی شاہ صاحب کے قدموں میں جا گری، اس کے پیروں میں جوتی تک نہ تھی لیکن جسم پر نہایت قیمتی لباس تھا۔ عورت نے رو کر کہا "حضرت! ہمارے غریب خانے پر تشریف لے چلیں میرا شوہر شکار پر گیا ہوا ہے واپسی پر وہ بھی قدم بوسی کی سعادت حاصل کرے گا!"

آپ نے ہنس کر فرمایا "نادان لڑکی! بس تجھے دیکھ لیا، دل شاد کیا، اب فقیر زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا۔"

اس عورت نے آپ کے پیر پکڑ لیے، بولی "حضور! مجھے جو کچھ بھی ملا ہے آپ کی دعاؤں سے ملا ہے اگر ساتھ نہیں چلتے تو یہاں اتنی دیر تو ٹھہریے کہ میں گھر ہو کر واپس آجاؤں!"

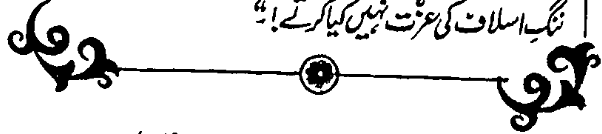
آپ نے جواب دیا "ہاں اتنی دیر البتہ ٹھہر سکتے ہیں!"

عورت بھاگ کر گھر گئی اور وہاں سے سو اشرفیوں کی تھیلی اور



ایک اجنبی بوعلی سینا سے ملنے پہنچا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے عرض کیا "جنابِ والا! میں بخارا کے سب سے بڑے عالم بدرالدین کا بیٹا ہوں میرا دادا بخارا کا افضل العلما کہلاتا تھا اور میرے گھر میں دولت کی اتنی فراوانی تھی کہ دونوں وقت دسترخوان پر بلا مبالغہ سو آدمی شریکِ طعام ہوا کرتے تھے!"

بوعلی سینا نے اس بڑبولے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم اپنے باپ دادا کی تعریف سے انھیں بڑا ثابت کر رہے ہو تو اچھائی اور بڑا پن اُن میں تھا اور وہ عزّت و توقیر کے مستحق تھے نہ کہ تم اور اگر یہ دولت کی خوبی تھی کہ تمھارے دسترخوان پر دونوں وقت سو آدمی شریکِ طعام ہوا کرتے تھے تو یہ خوبی دولت میں تھی نہ کہ تم میں آخر تم کس خوبی سے ہم سے اپنی عزّت و توقیر کے خواہاں ہو؟ ہم ننگِ اسلاف کی عزّت نہیں کیا کرتے!"



اپنے لڑکے کو گود میں لے کر واپس آئی اور لڑکے اور تھیلی کو قدموں میں ڈال کر کہنے لگی "حضور! اگر قیام نہیں فرماتے تو اس بچے کے سر پر دستِ شفقت فرما کر دعا سے سرفراز فرمائیں اور اشرفیوں کی تھیلی حقیر نذرانہ سمجھ کر قبول فرمالیں۔"

آپ نے بچّے کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور اشرفیوں کی تھیلی بچّے کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں نے تیری اشرفیاں قبول کیں اور اب انھیں میں اپنی طرف سے تیرے بچّے کی نذر کرتا ہوں؟"

عورت مچل گئی کہ "نہیں ایسا نہیں ہوگا یہ رقم تو آپ کو قبول ہی کرنا پڑے گی!"

آپ نے عورت کے اصرار پر تھیلی سے ایک اشرفی لے لی اور بقیہ اشرفیاں وہاں کے تکیہ دار کے حوالے کر دیں۔

یہاں سے رخصت ہو کر یہ ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے شیر آتا دکھائی دیا۔ آپ رُک گئے اور شیر سے فرمایا "اے یارِ عزیز! اگر مشیتِ خدا یہ ہے کہ تو مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے تو آگے بڑھ اور خدا کی مشیت پوری کر لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میری راہ چھوڑ دے اور اپنی راہ لے۔"

شیر گرجا بالکل اس طرح جیسے اپنی عاجزی کا اظہار کر رہا ہو اور جست لگا کر ایک طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے جب تھک گئے اور گرمی نے بہت پریشان کیا تو ایک درخت کے نیچے قیام کیا اور مراق[بے] میں چلے گئے اسی عالم میں ایک سیاہ سانپ آپ کے پنجوں پر سر رکھ کر سو گیا آپ نے سانپ پر نظر ڈالی اور مراقبے میں دوبارہ چلے گئے۔ سانپ نے کچھ دیر آرام کیا اور اپنی راہ لی۔

آپ چند دنوں کے لیے فیروز پور میں قیام فرما رہے اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان دنوں ٹانڈے میں دو صاحب[ِ] کشف بزرگ رہتے تھے ایک تو میر سید احمد اور دوسرے شاہ کرم اللہ شاہ کرم اللہ اپنے مریدوں میں بیٹھے وعظ و تلقین میں مشغول تھے اچانک جھرجھری لی اور خلافِ معمول اُٹھ کھڑے ہوتے۔ مریدوں [نے] دریافت کیا "حضرت! کوئی خاص بات ہے کوئی خاص واقعہ"

کرم اللہ شاہ نے کہا "ایک ایسی ذات ہمارے پاس آ ر[ہی] ہے جو صاحبِ ولایت ہے اور جس کے سامنے ہم دونوں (میر س[ید] احمد اور کرم اللہ) متغیر ہو جائیں گے!"

کسی مرید نے پوچھا "یہ کب تک یہاں آ جائیں گے؟"

شاہ کرم اللہ نے جواب دیا "بہت جلد، عنقریب، دو د[ن] کے اندر ہی!"

دو دن ابھی گزرے بھی نہ تھے کہ شاہ کرم اللہ اپنے مریدو[ں کے] ساتھ گنگا کے کنارے پہنچ گئے۔ بولے "وہ صاحب بس آنے والے ہیں!"

مریدوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور حیرت سے پوچھا "حضر[ت] وہ بزرگ کہاں ہیں اور کدھر سے آ رہے ہیں؟"

شاہ کرم اللہ نے دریائے گنگا کی موجیں چیر کر آتی ہوئی کشتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس کشتی میں جو سامنے آ رہی ہے وہ صاحب تشریف لا رہے ہیں اور ہم سب یہاں کے استقبال کو جمع ہوتے ہیں!"

جب کشتی کنارے آ گئی تو شاہ کرم اللہ آگے بڑھے اور [شاہ] نعمت اللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نہایت اعزاز اور تکریم [سے] اپنی خانقاہ میں لے گئے۔ آپ نے شاہ کرم اللہ سے پوچھا "میر [سید] احمد کہاں ہیں؟"

شاہ کرم اللہ نے جواب دیا "مالتی پور میں!"

آپ نے کہا "میں ان سے ملنا چاہتا ہوں!"

شاہ کرم اللہ انھیں لے کر مالتی پور پہنچ گئے۔ میر سیّد ا[حمد] پہلے ہی سے دروازے پر کھڑے ان کے منتظر تھے دیکھتے ہی د

آگے بڑھے اور شاہ نعمت اللہ سے بغل گیر ہوگئے۔ شاہ صاحب چند دن ان کے ساتھ رہے، پھر ایک دن جب واپسی کی اجازت چاہی تو سیّد احمد اُداس ہوگئے اور فرمایا "نعمت اللہ میرا وقت قریب ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ میری نمازِ جنازہ پڑھا کر واپس جائیں!"

آپ نے جواب دیا "سیّد احمد آپ بے فکر رہیں، فقیر نمازِ جنازہ کے وقت دوبارہ حاضر ہو جائے گا"

اس کے بعد آپ واپس آگئے اور کہیں اور تشریف لے گئے۔ اسی دوران سیّد احمد کا انتقال ہوگیا اور انتقال سے پہلے یہ وصیت کردی کہ میری میّت اس وقت تک نہ اٹھے جب تک شاہ نعمت اللہ جنازے کی نماز نہ پڑھ دیں!"

لوگوں نے سید احمد کو غسل دیا اور کفن پہنا کے باہر رکھ دیا اور شاہ نعمت اللہ کا انتظار کرنے لگے اسی وقت ایک طرف سے شاہ نعمت اللہ نمودار ہوتے اور ان کی نماز جنازہ پڑھا کے واپس چلے گئے۔

اسلام خان چشتی صوبے دار جہانگیر نگر (ڈھاکا) نے آپ کے نام بیس گاؤں کا اوقاف کرنا چاہا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

بنگالے کے ہفت ہزاری نواب خان خاناں اور پنج ہزاری خان اعظم مہابت خان آپ کے بہت معتقد تھے۔ مہابت خان بنگال کا صوبے دار تھا۔ بادشاہ نے اسے اکبر آباد بلالیا اور اُس کی جگہ مہابت خان کے بیٹے خانہ زاد خان کو بنگالے کا صوبے دار مقرر کیا۔ مہابت خان نے رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب سے کہا "حضرت! یہ گناہ گار اکبر آباد جا رہا ہے اس کی جگہ آپ کا غلام قائم ہو رہا ہے عاجز کی دلی خواہش ہے کہ حضرت اس پر نظرِ عنایت رکھیں!"

آپ نے جواب دیا "میں اسے ایک ماہ پہلے خطرات سے مطلع کر دیا کروں گا ماننا نہ ماننا اس کا اپنا اختیاری فعل ہوگا"

شاہ صاحب نے خانہ زاد خان کے ساتھ ہی سکونت اختیار کی۔ اس صحبت نے اس کی طبیعت ہی بدل کر رکھ دی۔

ایک دن، خانہ زاد خان کی ڈیوڑھی پر ایک مکّار درویش آیا اور اس نے اندر اطلاع کرائی کہ "صوبے دار سے کہو فیروز پور سے فقیر نعمت اللہ آیا ہے!"

اس فقیر نے کہیں سے یہ سن رکھا تھا کہ صوبے دار کو شاہ نعمت اللہ سے بڑی عقیدت ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب صوبے دار بنگالے کے ساتھ ہی تشریف فرما ہیں۔

خانہ زاد خاں درویش کی عیاری پر لال بھبوکا ہوگیا اور سپاہیوں کو یہ حکم دینا چاہا کہ "مکّار درویش کی اچھی طرح مرمت کر کے رخصت کردو، تاکہ کہیں اور دھوکے بازی کا مرتکب نہ ہو"

لیکن حضرت شاہ صاحب نے صوبے دار کو اس حکم کے اجرا سے منع کر دیا۔ فرمایا "بابا! یہ اخلاق محمدی سے بعید ہے۔ خدا جانے بے چارہ کہاں سے اور کس ضرورت سے آیا ہے اور تمھاری نسبت اچھا حسن ظن رکھ کر یہ حرکت کی ہے۔ اس فقیر کی خواہش ہے کہ تم اس سے بدسلوکی نہ کرو، غریب اگر جھوٹ بول کر اپنا پیٹ پالنا چاہتا ہے تو تمھارا کیا نقصان ہے اس کو اندر بلواؤ اور سلوک کر کے رخصت کر دو!"

خانہ زاد خان نے درویش کو اندر بلوایا جب وہ سامنے آیا تو شاہ نعمت اللہ تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ صوبے دار نے بھی آپ کی اتباع کی اور دست بستہ کھڑا ہوگیا اور پوچھا "حضور کی تعریف؟"

عیار درویش نے جواب دیا "فقیر کو نعمت اللہ کہتے ہیں!"

صوبے دار نے ہاتھوں کو بوسہ دے کر دریافت کیا "حضور کا کیسے آنا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا "فقیر نے فیروز پور میں خانقاہ بنوائی ہے اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا"

صوبے دار نے دو سو اشرفیاں درویش کے حوالے کیں اور عزت و احترام سے رخصت کر دیا۔

ایک دن آپ نے خلافِ معمول خانہ زاد خان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا، جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

من در ہوایت اے گلِ خنداں چو عندلیب
اے تو بنو بہار تماشائے دیگراں

اس شعر پر صوبے دار کے کان کھڑے ہوتے اور اسی وقت متصدیوں منشیوں کو حکم دیا کہ یہ شعر لکھ لو، اب ہمارا یہاں قیام ناممکن ہے، شاید آج ہی کل میں بادشاہ سلامت ہمیں طلب فرمانے والے ہیں"

اور بالکل ایسا ہی ہوا، ایک ماہ کے اندر ہی بادشاہ کا فرمان پہنچا جس میں خانہ زاد خان کو اکبر آباد کی حاضری کا فوری حکم دیا گیا تھا۔

یہ عجیب غریب بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اتنے تفصیلی حالات مل جانے کے باوجود ان کے سن وفات اور مزار کا صحیح پتہ نہیں چلتا ان کے پیر و مرشد نے انھیں فیروز پور روانہ کیا تھا ہو سکتا ہے ان کا وصال فیروز پور ہی میں ہوا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔



شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے نامی حکمران سُلطان غیاث الدین کی حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے عقیدت و شیفتگی اتنی بڑھی کہ اس نے اپنی بیٹی زہرہ خاتون کو بابا فریدؒ سے وابستہ کر دیا۔ ان سے شیخ بدرالدین پیدا ہُوئے۔ بابا فرید کا سلسلۂ رشد و ہدایت کسی بعید ترین ستارے کی روشنی کی طرح زمانی فاصلے طے کرتا ہوا پندرھویں صدی عیسوی تک آ گیا۔ اس خاندان کے ایک فرد نے اجودھن کی سکونت ترک کی اور لدھیانے میں اقامت اختیار کی۔ لدھیانے میں ابھی ایک نسل بھی نہ گزری تھی کہ شیخ بہاء الدین نامی ایک شخص نے اشارۂ غیبی پا کر یہاں کی سکونت بھی ترک کر دی اور اپنے کنبے کو لے کر دہلی چلا آیا اور سرائے حضرت شیخ علاءُ الدین زندہ پیرؒ میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام شیخ موسیٰ رکھا گیا۔ شیخ موسیٰ کی پیدائش کے کئی سال بعد دُوسرا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام شیخ سلیم رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر شیخ سلیم چشتی کہلایا اور اس کا فیضان اتنا عام ہوا کہ بڑے بڑے شاہانِ وقت اس کے حضور غلاموں کی طرح دست بستہ حاضری دے کر اپنی درخواستیں گزارا کرتے تھے۔ آپ کا سنِ ولادت ۸۸۲ھ (۷۷-۱۴۷۶ء) ہے۔ ان دنوں ہندوستان پر بہلول لودھی حکومت کر رہا تھا۔

شیخ موسیٰ جوان ہو چکے تھے اور شیخ سلیم ابھی نو سال کے تھے کہ شیخ بہاء الدین اور ان کی اہلیہ کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی ذمّہ داری اپنی اولاد کی طرح قبول کی اور شب و روز کا بیشتر حصّہ اپنے چھوٹے بھائی کی دلجوئی میں گزارنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود شیخ موسیٰ نے یہ محسوس کیا کہ ان کا چھوٹا بھائی بہت زیادہ اداس اور فکرمند رہتا ہے۔ جب دیکھیے، بیٹھا کچھ نہ کچھ سوچ رہا ہے۔ انہماک کا یہ عالم ہوتا کہ آنکھیں کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر یُوں جم جاتیں گویا وہ پتھر کی ہوں۔ پھر کسی بات سے اس نو سالہ معصوم بچّے کا دل بھر آتا اور پتھر جیسی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ بڑا بھائی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ اس کا چھوٹا بھائی والدین کی موت سے حد درجہ سوگوار ہے لیکن وہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اس معصوم کا دل تو خشیتِ الٰہی سے لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ اس ننھے سے دل میں تو دیدارِ رسُولِ پاکؐ کے دیکھنے کی تڑپ تھی اور یہی تڑپ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس پر آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلتی تھی۔

شام کے جھٹ پٹے میں، شیخ موسیٰ جب گھر میں داخل ہُوئے تو وہاں اپنے چھوٹے بھائی کو نہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ یہ اِدھر اُدھر تلاش کرتے ہُوئے جب گنبد زندہ پیرؒ میں داخل ہُوئے تو اندھیرے

میں اپنے مرحوم والدین کے مزار کے پائنتی کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ طاق میں رکھی ہوئی موم کی شمع ہوا کے ایک جھونکے سے جھلملا گئی۔ موسیٰ نے آگے بڑھ کر آہستہ سے کہا: "سلیم! تم یہاں ہو؟"

سلیم نے سر اٹھایا اور کھوئی کھوئی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

بڑے بھائی نے پوچھا: "سلیم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ننھے سلیم نے جواب دیا: "بھائی صاحب! ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اپنی کوئی قیمتی چیز گم کر دی ہے، وہ کیا چیز ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، لیکن اس کی کمی کا احساس ستاتا رہتا ہے۔"

بڑے بھائی کو خیال گزرا کہ سلیم پر مرحوم والدین کی جدائی شاق گزر رہی ہے۔ اس رات وہ سو نہیں سکے۔ پوری رات اسی فکر میں گزار دی کہ آخر اپنے معصوم، پیارے پیارے بھائی کے غم و اندوہ کا کیا علاج کیا جائے؟

دوسرے دن صبح موسیٰ چشتی نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ دہلی کی سکونت ترک کر رہے ہیں اور آگرے کی طرف چلے جائیں گے۔ اس اعلان پر فوراً ہی عمل درآمد بھی کیا گیا۔ موسیٰ چشتی اپنے چھوٹے بھائی اور سامان کے ساتھ ایک قافلے میں شامل ہو کر آگرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ قافلے کے بیشتر افراد آگرے میں رک گئے لیکن شیخ موسیٰ آگرے سے بائیس میل دور سیکری چلے گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ سامنے جنوب میں حدِ نظر تک اراولی کا کوہستانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سیکری کبھی سیکروار راجپوتوں کی راجدھانی رہ چکا تھا اور اس جگہ کو راجپوتانے کے دروازے کی حیثیت حاصل ہے۔ موسیٰ یہیں رہ گئے۔ انھوں نے یہیں شادی کر لی اور سکون سے زندگی گزارنے لگے۔

سلیم کا وہی حال تھا، ان کا گھر میں جی نہ لگتا۔ ویرانوں میں نکل جاتے اور مضطرب اور بے چین دل کو سکون پہنچانے کی کوشش میں ذکرِ الٰہی کرتے رہتے۔ موسیٰ بھی اپنے چھوٹے بھائی کی حالت سے کچھ بے خبر نہ تھے۔ شادی کے کئی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم تھے پہلے اگر سلیم چھوٹا بھائی تھا تو اب وہ بیٹا محسوس ہونے لگا تھا۔

سلیم اس اضطراب، اضطرار میں اپنی زندگی کے چودہ سال گزار کر پندرھویں میں داخل ہو گئے۔ موسیٰ جب رات کو سونے لگتے تو ایک بار سلیم کے حجرے میں ضرور جاتے اور وہاں انھیں معروفِ عبادت دیکھ کر واپس آ جاتے۔ یہی حال ان کی بیوی کا تھا وہ بھی اپنے خاموش طبع اور عبادت گزار دیور کو عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ بھاوج کسی ضرورت سے اٹھ کر جب سلیم کے حجرے کی طرف سے گزریں تو وہاں کچھ غیر معمولی سکوت محسوس کیا۔ انھوں نے ایڑیوں کے بل چل کر حجرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یہ پریشان ہو گئیں۔ اس کے بعد انھیں سارے گھر میں تلاش کر ڈالا لیکن سلیم کہیں بھی نظر نہ آئے۔ انھوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ کبھی سوچتیں، شوہر کو اس سے آگاہ کر دیا جائے۔ پھر سوچتیں سارے دن کا تھکا ماندہ شوہر بہت پریشان ہو جائے گا۔ اسی کش مکش میں مشرق میں پو پھٹی اور مسجدوں سے اذان اور مندروں سے گھنٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ موسیٰ نے بیدار ہو کر وضو کیا اور جب وہ نماز باجماعت کے لئے گھر سے نکلنے لگے تو ان کے ساتھ ہی سلیم بھی نکلے۔ بھاوج نے حیرت سے انھیں دیکھا اور سوچنے لگیں کہ رات والا واقعہ کوئی خواب تھا یا واقعی ایک واقعہ؟

دوسری رات پھر وہی ہوا، سلیم اپنے حجرے سے غائب تھے۔

تیسری رات بھی یہی ہوا اور پھر چوتھی رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ فجر کی نماز دونوں بھائی مسجد میں جا کر ادا کرتے۔

بھاوج نے تشویش سے سوچا: "اگر سلیم کو عبادت اور ریاضت ہی کرنی ہے تو انھیں اپنے حجرے میں ضرور موجود رہنا چاہیے لیکن نصف رات کے بعد حجرہ خالی ہو جاتا ہے۔ آخر یہ صاحبزادے جاتے کہاں ہیں؟" طرح طرح کے شکوک اور وسوسے دل میں گھر کرتے اور نیک اور پاک باز عورت انھیں ایک جھٹکے میں دل سے نکال پھینکتی اور اپنے وسوسۂ شیطانی پر خجل اور شرمندہ ہو جاتی۔ بالآخر ان وسوسوں نے اتنا ہلکان کر دیا کہ اپنی تشویش کو شوہر پر ظاہر کر دیا۔ موسیٰ پریشان ہو گئے اور ایک رات انھوں نے اپنے چہیتے کی نگرانی میں رات کی نیند حرام کر ڈالی۔

سلیم نے آہستہ سے اپنے حجرے کا دروازہ بند کیا اور گھر سے باہر نکل گئے۔ رات کی تاریکی سے موسیٰ نے بھی فائدہ اٹھایا اور ان کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ گھر سے تھوڑی دور، مشرق میں جہاں پہاڑی کا ایک حصہ نشیب کی شکل اختیار کر کے ذرا مسطح میدان نظر آتا ہے۔ وہاں چند بڑے بڑے تناور درختوں کا جھنڈ پایا جاتا تھا۔ سلیم اس جھنڈ میں پہنچ کر ایک درخت پر چڑھ گئے۔ موسیٰ گھٹنوں کھڑے اپنے بھائی

کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن سلیم نیچے نہ اُترے۔ ادا دلی کی بلند و بالا چوٹیوں سے درندوں کی خوفناک آوازیں وقفے وقفے سے سُنائی دیتیں اور موسٰی کانپ جاتے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اسرار کیا ہیں؟

فجر سے دو گھڑی پہلے سلیم درخت سے نیچے اُترے اور گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ پریشان اور تھکے ہارے بڑے بھائی نے آگے بڑھ کر سلیم کا راستہ روک لیا اور پوچھا: "سلیم! یہ کیا اسرار ہیں؟ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

چھوٹے بھائی نے مطمئن انداز میں بھائی کو دیکھا اور کہا: "آپ ہمارا پیچھا کرتے رہیں؟"

"ہاں!" موسٰی نے کہا: "تمھاری بھابی تمھاری اس نئی روش سے بہت پریشان ہیں اور میں خود بھی بے حد گھبرا گیا ہوں، آخر تم ہمیں بتاتے کیوں نہیں کہ اتنی رات گئے تم یہاں کیوں آتے ہو اور اس درخت پر چڑھ کر کیا کیا کرتے ہو؟"

سلیم نے کوئی جواب دینے کے بجائے رقت سے کہا: "بھائی صاحب! میں حج کے لئے جانا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دیجیے، بہت شکرگزار ہوں گا"

موسٰی نے کہا: "یہ ہماری بات کا جواب تو نہ ہوا؟"

سلیم نے کہا: "بھائی صاحب! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خشیت الٰہی اور حبِّ نبوی کا بوجھ ایسا نہیں ہے کہ میں آسانی سے اُٹھا سکوں۔ مفارقت کی آگ میرے سارے وجود کو پھونکے دے رہی ہے، خدا کے لیے مجھے اجازت مرحمت فرما دیں، اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

موسٰی نے اپنے بھائی کو سینے سے لگا لیا اور رونے لگے، بولے "میں تم سے جو پوچھ رہا ہوں اگر تم اس کا جواب نہیں دے سکتے تو نہ دو لیکن میں تم کو اپنے پاس سے جدا نہیں کر سکتا۔ سلیم! میں نے تجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ میں تیری جدائی کا صدمہ نہیں برداشت کر سکتا۔"

ماسوا اللہ سے منہ موڑنے والے بھائی نے کہا: "آپ کو بیٹا چاہیے؟"

موسٰی نے بھائی کو حیرت سے دیکھا۔ کہا: "بیٹا؟ یہ تو اسی دن سے میری سب سے بڑی آرزو بن گیا ہے جس دن تیری بھابی تیرے گھر میں میری بیوی بن کر آئی تھی!" پھر سرد آہ بھر کر کہا: "شاید خدا کو یہ بات منظور نہیں ہے کہ میں کسی بچے کا باپ کہلاؤں۔ اُس پاک بے نیاز سے اس محرومی کی شکایت بھی تو نہیں کی جا سکتی۔"

سلیم نے کیفیت جذب میں کہا: "آپ کو بیٹا ملے گا، عنقریب بہت جلد، لیکن جب آپ باپ بن جائیں تو ہمیں حج پر جانے سے نہ روکیے گا، یہ ہم سے ابھی اسی وقت عہد کر لیجیے!"

موسٰی نے اپنے نوجوان بھائی کو حالتِ جذب میں پہلی بار دیکھا تھا۔ انھیں ایسا لگا جیسے وہ کسی مجذوب کی بڑ سُن رہے ہوں، بے سروپا، ناقابلِ یقین بڑ، جس کی کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی، جس کا کوئی انجام نہ ہو۔



نہایت ہوشیاری سے پیچھا کر کے موسٰی نے سلیم کے درخت پر پوشیدہ رہنے کا راز معلوم ہی کر لیا۔ نوجوانی کا گرم خون سلیم کو آرام و آسائش پر مائل کرتا رہتا تھا اور عجب طرح کی پُرسکون اور آرام دہ فضا میں نیند منڈلانے لگتی تھی تو ذکرِ الٰہی میں خود کو فراموش کر دینے والے اس نوجوان نے اس پر قابو پانے کے لئے یہ انوکھا طریقہ دریافت کیا تھا کہ وہ نصف رات کے بعد کسی درخت پر چڑھ کر کسی شاخ پر بیٹھ جاتے اور وہاں اللہ اللہ کرتے رہتے گھڑی گھڑی شیروں کی دہاڑ سے فضا دہل جاتی اور سلیم بآسانی اپنی نیند پر غلبہ پالیتے۔ موسٰی کے دل پر اپنے چھوٹے بھائی کے زہد و تقویٰ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کے ساتھ تعظیم و احترام سے پیش آنے لگے۔

تقریباً دس ماہ بعد موسٰی صاحب اولاد ہوگئے۔ اب وہ ایک بچے کے باپ تھے۔ انھوں نے فرطِ شفقت سے بچے کو گود میں لیا اور میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اسی عالم میں سلیم بھی وہیں پہنچ گئے اور بھائی سے کہا: "بھائی صاحب! خدا نے آپ کو صاحب اولاد کر دیا، مبارک ہو! اب تو میں حج بیت اللہ کے لیے اجازت حاصل کر سکتا ہوں۔"

بڑے بھائی نے کہا: "سلیم! مجھے اپنا عہد یاد ہے، اب تم جا سکتے ہو لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ صاحب اولاد ہو جانے سے میرے دل میں تمھاری محبت کم ہو گئی ہے۔" پھر ذرا رک کر آہستہ سے کہا: "بلکہ اس واقعے کے بعد تو میں تمھارا احترام کرنے لگا ہوں۔ سلیم! تم ولی ہو۔"

سلیم نے اجازت پاتے ہی سرہند کا رُخ کیا۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور شیخ مجدالدین سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ یہاں سے چل کر ایک آدھ جگہ اور رُکے اور پھر اجودھن پہنچ گئے۔ یہاں بابا فریدؒ کے دیوان اور صاحب سجادہ شیخ ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقہ حاصل کیا۔ اب نوجوان سلیم، سلیم چشتی ہو چکے تھے۔ کیونکہ بابا فریدؒ خواجگانِ چشت میں سے تھے۔ اجودھن میں بابا فریدؒ کے مزار پر جو دوسرے حضرات

ابودرداؓ صحابی سے کسی نے پوچھا

مد جناب ایبو لوگ

موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟"

ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: "ہر شخص دُنیا کو آباد کر رہا ہے اور آخرت کو برباد، اور ظاہر ہے کہ آبادی کو چھوڑ کر بربادی کی طرف جانا کون پسند کرے گا۔"

خرقہ کی اُمید میں شب و روز عبادت و ریاضت میں لگے ہوئے تھے جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک اٹھارہ سالہ نوجوان بابا فریدؒ کے مزار پر آیا اور بآسانی خرقۂ خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو انھیں صاحبِ سجادہ سے شکایت پیدا ہو گئی۔

صاحبِ سجادہ ان کے بگڑے تیوروں کو کئی دن برداشت کرتے رہے۔ آخر ایک دن ان سے سوال کیا: "حضرات! یہ ناچیز کئی دن سے یہ محسوس کر رہا ہے کہ آپ ہم سے کسی بات پر کبیدہ خاطر ہو رہے ہیں، کیا ہم اس کا سبب دریافت کر سکتے ہیں؟"

ایک عمر رسیدہ زاہد نے جواب دیا: "آپ نے ہم پر ان نووارد صاحبزادے کو جیسی ترجیح دی ہے کیا اس سے ہمارے دل فگار نہیں ہو رہے؟ کیا ہمارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی؟"

شیخ ابراہیم نے جواب دیا: "حضرات! ہم نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں کیا، ہم آپ کو یہ کس طرح باور کرائیں کہ ہمیں بابا فریدؒ کی ہدایت پر ان صاحبزادے کا انتظار تھا۔ بابا ہمیں بار بار خواب میں یہ ہدایات دے رہے تھے کہ سلیم آ رہا ہے، ہمارے تبرکات ان کے حوالے کر دینا۔ پھر ہم کس طرح بد دیانتی کر سکتے تھے۔"

لوگوں نے سکوت اختیار کیا۔

سلیم چشتی کچھ عرصہ اجودھن میں قیام فرما رہے اس کے بعد پاپیادہ حج کو روانہ ہو گئے۔

آپ نے کئی حج کیے اور مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے رہے جب بھی رسولِ مقبولؐ کے مزارِ اقدس پر حاضری دیتے۔ حال سے بے حال ہو جاتے۔ یہ مدینہ منورہ ہی میں رہ جانا چاہتے تھے لیکن رسول اللہؐ نے انھیں وطن واپس جانے کی ہدایت کی۔ آپ رو رو کر یہ عرض کرتے تھے کہ "یا رسول اللہؐ! اپنے اس غلام کو مدینے کا پیوند ہو جانے کا شرف عطا فرمائیں۔"

رسول اللہؐ نے خواب میں وطن کو واپسی کا حکم دیتے ہوئے بشارت دی: "شیخ الہند! وطن واپس جاؤ، تم کو وہیں تمھارے وطن میں جائے دفن کے لیے مدینے کی زمین مل جائے گی۔"

یہ حسبِ ارشادِ نبویؐ وطن واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنے گھر بار سے بے تعلقی اختیار کی اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر اقامت گزیں ہو گئے۔ شہر اور شہر والوں سے دُور لیکن جنگلی درندوں سے بالکل قریب، اتنے قریب کہ وہاں کوئی انسان رہنے کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہاں سنگ سرخ کے پہاڑ دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور دن کو سُورج کی روشنی میں سنگ تراشوں کی جمعیتیں پتھر لینے آیا کرتی تھیں۔ ایک دن صبح صبح جب انھوں نے اس خطرناک مقام پر سلیم چشتیؒ کو دیکھا تو ڈرتے ڈرتے عرض کیا: "جناب آپ نووارد ہیں اور لاکھ درویش سہی لیکن ایک بات ہماری بھی مانیں۔"

آپ نے پوچھا: "وہ کیا؟ کہو، ذرا ہم بھی تو سنیں!"

سنگ تراشوں نے کہا: "ہم ان حدود میں برسہا برس سے آ جا رہے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ یہ علاقہ درندوں کا مسکن ہے، ہم یہاں مسلح آتے ہیں لیکن آپ کسی احتیاطی تدبیر کے بغیر ہی فروکش ہو گئے ہیں۔ یہ ایک خطرناک بات ہے۔"

آپ نے بے نیازی سے پوچھا: "اور کچھ؟"

ایک ادھیڑ عمر سنگ تراش نے جواب دیا: "اور یہ کہ آپ یہاں دن میں بے شک رہیں کیونکہ آپ کے آس پاس ہم سب بھی موجود رہیں گے لیکن شام کو جب ہم سب یہاں سے جانے لگیں تو ہمارے ساتھ آپ بھی چلے جائیں، کیونکہ یہاں رات کا قیام خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

آپ نے جواب دیا: "یہ فقیر تو جہاں بیٹھ گیا، بیٹھ گیا۔ ہم کہاں کے ایسے ہیں کہ اللہ کی مخلوق سے ڈرتے پھریں۔ تمھارے نیک مشورے کا شکریہ!"

سنگ تراش یہ سمجھے کہ اس درویش کو شاید کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اپنی عبادت و ریاضت پر گھمنڈ ہے۔ جبھی تو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ سنگ تراش اس ضدی اور خدا پرست انسان کو پہاڑی پر تنہا چھوڑ کر مغرب سے پہلے پہلے چلے گئے۔

دوسرے دن صبح جب یہ لوگ اُوپر جا رہے تھے تو انہیں یقین تھا کہ وہاں کہیں، کسی جگہ اس ضدی شخص کی لاش ضرور ملے گی جس کا پیٹ کوئی درندہ پھاڑ چکا ہوگا اور دُور تک خون ہی خون بہہ رہا ہوگا۔

یہ لوگ نہایت احتیاط سے چوکنے انداز میں جب اُوپر پہنچے تو دیکھا سلیم چشتی نماز میں مشغول ہیں اور ان کے قریب ہی دو شیر بیٹھے چوکسی کر رہے ہیں۔

جب سلیم چشتی نے سلام پھیر کر شیروں کی طرف دیکھا تو وہ دُم ہلانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے دُور سے آتے ہوئے سنگتراشوں کی طرف دیکھا اور شیروں کو حکم دیا: "تم واپس جاؤ۔"

شیر دُم ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اس دن پہلی بار سنگتراشوں کو آپ کی بزرگی، عظمت اور ہونے کا صحیح احساس ہوا۔ وہ سیدھے آپ کے رُو برو پہنچے اور قدموں میں گر گئے۔ آپ نے انھیں اٹھایا اور پُوچھا: "تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟"

لوگوں نے جواب دیا: "حضرت! ہمیں اپنے جذبۂ شوق کا اظہار کر لینے دیجیے، آپ منع نہ کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا: "لیکن ہمارے قدموں میں اپنا سر رکھ کر ہمیں گناہگار تو نہ کیجیے۔"

اس کے بعد سنگ تراشوں نے آپ کے لیے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کر دی، جو بعد میں "مسجد سنگتراشاں" کہلائی اور آج بھی موجود ہے۔

اسی دوران مضافات کے راجپوتوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور مسلمان ہونے لگے۔ یہ مسلم راجپوت "ملکانے" کے نام سے بہت مشہور ہوئے۔



پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر بابر ہندوستان کی قسمت کا مالک ہو چکا تھا۔ ابھی اس نے پوری طرح سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ ہندوستان کی کئی دُوسری طاقتیں بابر کے خلاف متحد ہو گئیں۔ ان میں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہ تھی۔
اس متحدہ محاذ نے میواڑ کے سورج بنسی راجا رانا سانگا کو اپنا سپہ سالارِ اعظم مان لیا۔ سیکری کے جنوب میں پانچ میل دُور خانوا دکنواہہ، نامی گاؤں کے میدان میں رانا سانگا دو لاکھ فوج کے ساتھ خیمہ زن ہو گیا۔



مشہور بزرگ امام شعبیؒ حمام میں غسل کرنے تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے ایک شخص کو بالکل برہنہ نہاتے دیکھا۔ آپ نے شرم سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اس شخص نے ازراہِ مذاق پوچھا: "حضرت! آپ اندھے کب سے ہو گئے؟"

امام شعبیؒ نے جواب دیا: "جب سے خدا نے تیری عصمت کا پردہ چاک کیا۔"



بابر بھی اپنی بیس ہزار فوج لے کر نکلا اور سیکری میں خیمہ زن ہو گیا۔ یہیں کی ایک مسجد میں بابر نے شراب نوشی سے توبہ کی اور جام و سبو، ساغر و مینا توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیے۔ اس کے ساتھی گھبرائے ہوئے تھے اور انھیں اپنی فتح مندی پر یقین نہیں تھا۔ یہ معرکہ، معرکۂ بابر ورانا سانگا نہیں تھا بلکہ معرکۂ کفر و اسلام تھا۔ کیونکہ رانا سانگا نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو شمالی ہند اور بعد میں پورے ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال باہر کرے گا۔

غضب کا رن پڑا اور شام ہوتے ہوتے زخمی رانا سانگا نے راہِ فرار اختیار کی۔ سلیم چشتیؒ کی دُعائیں بابر کے حق میں تھیں اور کم تعداد فوج کے باوجود بابر نے اپنی بے پناہ شجاعت، جنگی فراست اور سلیم چشتیؒ کی دُعاؤں کے طفیل رانا سانگا کو عبرتناک شکست دی۔

پہلے یہ جگہ سیکری تھی، بابر نے فتح مندی کے بعد اس کا نام شکری رکھ دیا اور شکری سے خانوا تک شہیدوں کی ایک بستی قائم ہو گئی جو گنج شہیداں کہلائی۔

چند سال بعد بابر اپنے حصے کا کام ختم کر کے خود کو ہمایوں پر قربان کر گیا۔ ہمایوں برسرِ اقتدار آیا۔ لیکن چند سالوں کے اندر اندر بہار کے افغان جاگیردار فرید خان نے اسے متواتر شکستیں دے کر ہندوستان سے نکال باہر کیا اور خود شیر شاہ سوری کے نام سے ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔ شیر شاہ کے امیر الامرا خواص خاں نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حاضری دی اور شرفِ مریدی سے شاد کام ہوا۔ کچھ عرصہ بعد شیر شاہ خواص خاں سے بدظن ہو گیا اور اسے قید خانے میں ڈال دیا۔ خواص خاں کے پسماندگان شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور رو دھو

کر مدد کے طالب ہوئے۔

آپ نے انھیں تسلی دی اور مستقبل کا فیصلہ سُنا دیا: "جو ظلم کرے گا، ظلم سہے گا۔"

شیر شاہی سپاہ آپ کی خدمت میں گستاخانہ پہنچی اور درشت لہجے میں سوال جواب شروع کر دیے۔ اس نے پوچھا:

"تم خواص خاں کے حمایتی ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "حمایتی صرف خدا ہے، ہم تو اس کے اشاروں کے چاکر ہیں۔"

شیر شاہی سردار نے گرج کر سوال کیا: "تم ایک ادنیٰ گوشہ نشین، خواص خاں، شاہی معتوب کے پسماندگان سے مِل کر سازشیں کرتے ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "سازشیں دُنیادار کرتے ہیں، وہ لوگ جنھیں ملوکیت جیسی گھناؤنی شے نے اپنا اسیر بنا لیا ہو، دامِ فریب کے بندے ہوتے ہیں۔ تمھارا بادشاہ محسن کُش ہے!"

شیر شاہی سردار نے حکماً کہا: "ہمارا بادشاہ کیا، شہنشاہ تمھارا بادشاہ بھی ہے!"

آپ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا: "ہمارا بادشاہ ہمیشہ رہے گا یہ تو تمھارا ہی بادشاہ ہے جو چند گھڑی کسی شعلے کی طرح روشنی دے کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گا!"

سردار نے سخت آواز میں کہا: "بکواس بند کرو!"

آپ نے ذُومعنی جواب دیا: "بکواس بند کر دی جائے گی!" پھر پُوچھا: "خواص خاں کا کیا ہوا!"

شیر شاہی سردار نے جواب دیا: "اسے شاہی حکم پر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔"

"بہت بُرا کیا تمھارے بادشاہ نے۔" آپ نے افسوس کا اظہار کیا: "مرگِ ناگہاں تمھارے بادشاہ کی تاک میں ہے!"

شیر شاہی سردار نے اپنے بادشاہ کا دُوسرا حکم سُنا دیا۔ بولا: "بابی خواص خاں کے قتل کے بعد بادشاہ نے تمھارے لیے یہ حکم صادر کیا ہے کہ تم چونکہ شاہی غدار اور اس کے پسماندگان سے دلی ہمدردی رکھتے ہو اس لیے تمھیں احتیاطاً گوالیار کے قلعے میں نظربند کر دیا جائے۔ بادشاہ نہیں چاہتے کہ تم ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ۔"

آپ نے جواب دیا: "تمھارے بادشاہ کے دل میں جو بھی آئے کر گزرے لیکن ہمارا بادشاہ بہت قوی ہے۔ اس کی گرفت اور دائرۂ گرفت میں پُوری کائنات ہے۔"

شیر شاہی سپاہ نے آپ کو سیکری سے اٹھوا کر گوالیار میں نظر بند کر دیا۔ جب یہ لوگ شاہی فرمان کی بجا آوری کے بعد آپ کے پاس سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے کہا: "تم اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ مظلوموں کی فریادیں عرشِ اعظم تک پہنچ چکی ہیں اور مالکِ یوم الآخر نے ظالموں کے خلاف اپنا فیصلہ صادر فرما دیا ہے، مرگِ ناگہانی تیرے بادشاہ کے تعاقب میں ہے۔"

معلوم نہیں آپ کا یہ پیغام بادشاہ کو پہنچا بھی یا نہیں لیکن کچھ عرصہ بعد ہی جبکہ شیر شاہ کالنجر کے قلعے کی تسخیر میں لگا ہوا تھا بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ اس میں جھلس کر ہلاک ہو گیا اور آپ کے عقیدت مندوں نے گوالیار کی نظر بندی سے آپ کو رہا کر کے سیکری پہنچا دیا۔

شیر شاہ کے بعد اس کے بیٹوں میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ شیر شاہ کا بڑا بیٹا دارالخلافے سے دُور تھا، چھوٹا قریب تھا۔ امرا نے اسی کو اسلام شاہ سُوری کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔ دونوں بھائیوں کو حضرت سلیم چشتی سے بڑی عقیدت تھی۔ عادل شاہ اپنے چھوٹے بھائی کو تاج و تخت سے معزول کرنے کی نیت سے لاؤ لشکر لے کر آگے بڑھا اور اپنے ایک مصاحبِ خاص کو حضرت سلیم چشتی کی خدمت میں حصُولِ دُعا کے لیے بھیجا۔ قاضی غیاث الدین نامی یہ امیر، حضرت سلیم چشتی کے خاص مُریدوں میں سے تھا۔ اس نے نہایت ادب سے عرض کیا: "حضرت! آپ کا یہ غلام چاہتا ہے کہ اس معرکے میں عادل شاہ سُرخروئی حاصل کرے اور آپ کا یہ بندہ آپ کی دُعاؤں سے کسی قابل ہو جائے!"

حضرت سلیم چشتیؒ نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا پھر پُوچھا: "تم عادل شاہ کے پاس کب جاؤ گے؟"

قاضی غیاث الدین نے جواب دیا: "جب بھی حضُور اجازت مرحمت فرمائیں گے چلا جاؤں گا!"

آپ نے فرمایا: "تو اب چلے جاؤ!"

قاضی غیاث نے ہاتھ مَلتے ہوئے کہا: "حضرت! یہ ناچیز عادل شاہ کو کس طرح یقین دلائے گا کہ یہ حضُور والا سے اس کے

حق میں دُعاؤں کی سوغات لے کر واپس آیا ہے۔"

آپ نے دریافت کیا: "تم کیا چاہتے ہو؟"

قاضی غیاث نے جواب دیا: "آپ اس گناہگار کو ایک گھوڑا مرحمت فرمادیں تاکہ اس پر سوار ہو کر عادل شاہ کی خدمت میں حاضری دے اور پھر اسی گھوڑے کو عادل شاہ کے حوالے کر دے اور وہ اس کی پشت پر بیٹھ کر اپنے حریف کا مقابلہ کرے!"

آپ نے اپنا عراقی گھوڑا قاضی غیاث کے حوالے کر دیا اور فرمایا: "عادل شاہ سے کہنا، اس گھوڑے پر وہ خود تو سواری کر سکتا ہے لیکن کسی اور کو ہرگز نہ دے ورنہ اس کے نتائج اچھے نہ نکلیں گے۔"

قاضی غیاث اس گھوڑے پر سوار ہو کر عادل شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا اور گھوڑے کو عادل شاہ کے حوالے کرتے ہوئے ساری باتوں سے اسے مطلع کر دیا۔

چند گھڑیوں بعد عادل شاہ کے ایک مصاحب خاص نے اس گھوڑے کو بے حد پسند کیا اور کہا: "حضورِ والا! یہ گھوڑا تو بہت خوبصورت لگتا ہے کیا تھوڑی دیر کے لیے مجھے مرحمت فرمادیں گے؟"

عادل شاہ کو دینے میں تامل ہوا لیکن یہ سوچ کر کہیں یہ مصاحب ناراض ہو کر اپنے سواروں سمیت اس کے چھوٹے بھائی سے نہ جا ملے، گھوڑا سواری کی غرض سے اس کے حوالے کر دیا۔ قاضی غیاث کو یہ بات گراں گزری۔ یہ چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو کر سیکری چلا گیا اور حضرت سلیم چشتیؒ کو ساری رُوداد سنا دی۔ آپ نے ذرا دیر کے لیے سکوت اختیار فرمایا پھر بولے: "افسوس کہ عادل شاہ نے اپنی سلطنت کھو دی!"

جب دونوں بھائی آمنے سامنے آ ڈٹے تو چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے خوفزدہ ہو کر قلعے میں بیٹھ رہا۔ اس کی فوج کا بیشتر حصہ عادل شاہ سے جا ملا۔ اس نے اس نازک موقع پر ایک خاص ایلچی حضرت سلیم چشتیؒ کی خدمت میں روانہ کیا اور آپ سے طالبِ دُعا ہوا۔

آپ نے اس ایلچی سے دریافت فرمایا: "اسلام شاہ کیا کر رہا ہے؟"

ایلچی نے جواب دیا: "حضرت! وہ اپنے بھائی عادل شاہ سے خوفزدہ ہو کر قلعے میں رُوپوش ہے!"

آپ نے پوچھا: "میدان میں نکل کر مقابلہ کیوں نہیں کرتا؟"

ایلچی نے جواب دیا: "فوج کا بیشتر حصہ عادل شاہ سے جا ملا ہے...... ان حالات میں کس طرح جنگ جیتی جا سکتی ہے؟"

"اچھا!" آپ نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا: "پہلے ہم نے عادل شاہ کی مدد کی تھی لیکن وہ اہل ثابت نہ ہوا، جاؤ! اسلام شاہ سے کہہ دو قلعے سے نکل کر میدان میں صف آرا ہو جائے۔ عادل شاہ ہارے گا اور اسلام شاہ کی برگشتہ فوج واپس آجائے گی۔"

ایلچی نے جب یہ پیغام اسلام شاہ کے گوش گزار کیا تو وہ بلا توقف قلعے سے باہر نکلا اور اپنی باقی ماندہ فوج کو صف بستہ کیا اور عادل شاہ سے نبرد آزما ہو گیا۔ ابھی جنگ جاری ہی تھی کہ اسلام شاہ کی فوج واپس آگئی اور اپنے ساتھ عادل شاہ کی فوج کا بیشتر حصہ بھی لیتی آئی۔ عادل شاہ ہراساں و بدحواس شکست اٹھا کر عظیم آباد کی طرف فرار ہو گیا۔

اسلام شاہ نے نو سال دبدبے سے حکومت کی لیکن اس کے فوت ہوتے ہی اس کا چچازاد بھائی، اسلام شاہ کے بیٹے کو قتل کر کے برسرِ اقتدار آگیا۔ اس شخص نے ہیموں نامی شاطر بنیے کو وزارت کا منصب بخشا اور سارے اختیارات اس کے حوالے کر کے خود رنگ رلیوں میں لگ گیا۔ ہیموں کا دماغ یہاں تک خراب ہوا کہ اس نے اپنے لیے راجہ بکرماجیت کا خطاب پسند کیا۔ افغانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ ہمایوں ایران سے واپس آگیا اور سکندر شاہ سوری کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گیا۔ ابھی ہمایوں کو تاج و تخت سنبھالے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ قلعے کی بالائی منزل سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس نے مغرب کی اذان سن کر عجلت میں نیچے اترنا چاہا تھا لیکن توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا زینے کی آخری نچلی سیڑھیوں تک پہنچ کر دم توڑ دیا۔ ان دنوں نو عمر اکبر اپنے اتالیق اور سپہ سالار بیرم خاں کے ساتھ کلانور پنجاب میں مقیم تھا۔ وہیں اس کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔

ہمایوں کی موت نے سوریوں کے حوصلے بلند کر دیے اور ہیموں لشکر جرار لے کر دہلی پر حملہ آور ہوا اور چشم زدن میں اسے فتح کر لیا۔ ہیموں نے مسلمانوں کو ستانا شروع کیا اور اس کی شرارتوں سے حضرت سلیم چشتیؒ بھی محفوظ نہ رہے۔ آپ نے ہندوستان کی طوائف الملوکی اور انتشار سے دل برداشتہ ہو کر اپنا ایک آدمی

سورت کی بندرگاہ اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ بحری جہاز کا انتظام کرے جس سے وہ اپنے ساتھیوں سمیت حج بیت اللہ کو روانہ ہوجائیں۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو بھی ان کے ساتھ حج کو جانا چاہے آپ اپنے خرچ پر بخوشی لے جائیں گے۔

جہاز کا انتظام ہوگیا اور آپ اپنے آخری حج پر روانہ ہوگئے اس بار بھی آپ نے یہی خواہش کی تھی کہ وہیں پیوندِ خاک ہوجائیں گے۔ مکہ معظمہ سے آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور رسول اللہؐ کے قدموں میں معتکف ہوگئے اور خاصی مدت اسی حالت میں گزار دی ایک شب خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ آپ سے فرما رہے ہیں

"سلیم! ہندوستان واپس جاؤ، وہاں کے لوگوں کو فیض پہنچاؤ اور دین کی اشاعت کرو!"

آپ نے خوشامدانہ درخواست کی: "حضورؐ! اس گناہ گار کو خاکِ مدینہ میں مل جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں، اب یہ در چھوڑ کر کہاں جاؤں؟"

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: "تمھیں پہلے ہی یہ بتایا جا چکا ہے کہ تمھیں وہیں مدینے کی زمین عطا کر دی جائے گی۔"

اب مزید اصرار کا موقع نہ تھا، خوش خوش واپس ہو گئے۔



بیرم خاں اکبر کے ساتھ جالندھر سے پانی پت کی طرف بڑھا اور ۱۵۵۶ء میں وہ خونریز واقعہ پیش آیا جس میں ہیموں کو شکست فاش دی گئی۔ وہ ہاتھی پر سوار ہوکر اپنی فوجوں کو لڑا رہا تھا کہ ایک تیر نے اسے زخمی کر دیا۔ اس نے میدانِ جنگ سے فرار ہوجانا چاہا لیکن گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اکبر شہنشاہِ ہند ہوگیا۔

سلیم چشتیؒ مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے واپس آرہے تھے۔ راستے میں بڑے بڑے صوفیوں اور بزرگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس سیاحت میں ان کی خواجہ اسماعیل شیروانی اور قطبِ وقت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند سے ملاقات ہوئی۔ اسی دوران رسول اللہؐ نے خواب میں حکم دیا کہ شام میں شیخ ابراہیم عیاضؒ کے پاس جاؤ، آپ شیخ ابراہیم عیاضؒ کے پاس پہنچے اور ان کی بیعت کی۔ پھر بغداد چلے گئے اور امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے مزار پر حاضری دی اور

حضرت عمر بن عبدالعزیز

پر نزع کا عالم طاری تھا، گرد و پیش موجود لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے ہیں، ایک شخص نے ان کے ہونٹوں کے قریب اپنا کان کر دیا، آپ نیم مدہوشی میں فرما رہے تھے،
"اے اللہ! میں زندگی میں تیرے احکام پر عمل نہ کر سکا، اب اگر تو مجھے معاف کر دے تو یہ تقاضائے فضل ہوگا اور اگر سزا کی گرفت میں لے لے تو عین عدل!"

یہیں حضرت غوث الاعظمؒ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ حضرت غوث اعظمؒ نے اپنے سجادہ کو خواب میں حکم دیا کہ "ہمارا خرقۂ خاص اور خلافت نامہ شیخ ہندی سلیم چشتیؒ کو مرحمت کر دو۔"

صبح اس حکم کی تعمیل کر دی گئی لیکن بعض مقامی حضرات کو یہ عمل شاق گزرا اور وہ سلیم چشتیؒ کی تاک میں رہنے لگے کہ وہ جیسے ہی اس خرقۂ خاص اور خلافت نامے کو لے کر چلیں گے ان سے ان چیزوں کو جبراً چھین لیا جائے گا۔

آپ کچھ عرصہ بعد بغداد سے چل دیے۔ ابھی وہ کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ چند بدوؤں نے انھیں اپنے محاصرے میں لے لیا۔ آپ نے ان سے دریافت کیا: "تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

انھوں نے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا: "حضرت غوث الاعظمؒ کا خرقہ ہمیں واپس کر دو۔"

اس وقت آپ کے جسم پر وہی خرقہ تھا۔ آپ نے بدوؤں کو مسکرا کر دیکھا اور فرمایا: "اگر تمھیں مذکورہ خرقہ مجھ سے دستیاب ہو جائے تو ضرور لے لو!"

بدوؤں نے کہا: "ہم آپ کے سامان کی تلاشی لیں گے!"

آپ نے زیبِ تن خرقے کو دیکھا اور ہنس کر پوچھا: "کیا تمھیں وہ خرقہ میرے پاس نظر نہیں آتا؟"

بدوؤں نے جواب دیا: "وہ خرقہ یقیناً تمھارے سامان میں بندھا ہوگا ہم اس میں سے نکال لیں گے!"

آپ نے دریافت کیا: "کیا تم لوگ اس خرقے کو اچھی طرح پہچانتے ہو؟"

انھوں نے جواب دیا: "خوب پہچانتے ہیں!"

آپ نے حکم دیا: "اس خرقے کو تم ہمارے سامان سے نکال لو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"
بدوؤں نے آپ کا سارا سامان اُلٹ پلٹ ڈالا لیکن اس میں سے خرقہ نہ نکلا۔ بدوؤں کو حیرت تھی کہ آخر وہ خرقہ گیا کہاں؟"
جب وہ لوگ خرقے کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئے تو آپ نے مسکرا کر فرمایا: "بلا خرقہ؟"
ان لوگوں نے مایوسی سے جواب دیا: "نہیں، کیا وہ تمہارے پاس واقعی موجود نہیں؟"
آپ نے کہا: "وہ ہمارے ہی پاس ہے لیکن تم اسے پا نہیں سکتے۔"
اس کے بعد پوچھا: "کیا تم اس کی آخری بار زیارت کرنا چاہتے ہو؟"
بدوؤں نے جواب دیا: "ہاں، بالکل اور ساتھ ہی ہم یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ اسے آپ سے واپس نہ لیں گے۔"
آپ نے اپنی داہنی آستین ان کے رُوبرُو کر دی، فرمایا: "لو دیکھو اور اسے پہچانو!"
انھوں نے دیکھا خرقہ مبارک کی آستین ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ بدوؤں نے پوچھا: "خرقے کا بقیہ حصّہ کہاں ہے؟"
آپ نے بائیں آستین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "لو ادھر دیکھو، یہ رہی!"
اور اب بائیں آستین بھی صاف نظر آنے لگی تھی، پھر اسی طرح گریبان، دامن اور پھر پورا خرقہ انھیں نظر آنے لگا۔
بدوؤں نے حیرت سے سوال کیا: "حضرت! اگر یہ سارے اجزائے خرقہ آپ کے جسم پر ہی موجود ہیں تو یہ ہمیں پہلے کیوں نہ نظر آیا؟"
آپ نے جواب دیا: "ہم نے اسے اپنے جسم میں سلب کر لیا تھا۔"
بدوؤں نے آپ کی عظمت اور بزرگی کا اپنے دلوں میں اعتراف کیا اور قدموں میں گر کر مُرید ہو جانے کی خواہش کی، آپ نے انھیں اپنا مُرید کیا اور بدوؤں نے انھیں کئی دن اپنا مہمان رکھا۔
آپ وہاں سے چل کر ہندوستان آئے اور سیدھے اجودھن پہنچے بابا فریدؒ کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت غوث الاعظمؒ کا خرقہ وہیں بابا فریدؒ کے مزار پر چھوڑا اور کچھ دن قیام فرما کر سیکری کے لیے روانہ ہوئے راستے میں بھدالی نامی ایک مقام پر آپ نے قیام فرمایا اور وہاں کی مسجد مخدوم شیخ زین العابدین میں ڈھائی سال معتکف رہے۔ آپ کا شہرہ اکبر تک پہنچ چکا تھا اور وہ نہایت بے چینی سے آپ کا منتظر تھا۔
جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ بھدالی میں تشریف فرما ہیں تو اس نے مروارید سے پُر ایک خوان بطور تحفہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا، آپ نے اسے یہ کہہ کر واپس فرما دیا کہ "اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں اسے طالبانِ دُنیا کو بھجوا دو!"



اکبر کو اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش تھی لیکن یہ خواہش کسی طرح پُوری ہی نہ ہوتی تھی۔ مصاحبین خاص نے اسے مشورہ دیا کہ آستانۂ خواجہ معین الدین چشتیؒ سلطان الہند میں حاضری دے کر اپنی خواہش کا اظہار کرو، ممکن ہے پُوری ہو جائے!"
۲۸ سالہ شہنشاہ ہند اکبر ایک سو چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے اجمیر پہنچا اور فاتحہ کے بعد دستِ دُعا اُٹھا کر عرض کیا۔
"اے خواجہ معین الدین! آپ سرچشمۂ اولیائے ہند ہیں۔ مَیں شہنشاہ اکبر عاجزی و انکسار سے یہ درخواست پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہوں، کہ مَیں اب تک اولادِ نرینہ سے محروم ہُوں، میرے بعد بارِ حکومت سنبھالنے والا کوئی بھی نہیں۔ اگر مجھے اولادِ نرینہ کی نعمت سے شاد کام کیا گیا تو مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ آگرے سے اجمیر تک کا فاصلہ پاپیادہ طے کروں گا اور آپ کی نیاز دلواؤں گا۔"
اس دُعا کے بعد رات کو جب یہ مغل فرمانروا سویا تو اس نے خواب میں دیکھا، حضرت خواجہ غریب نوازؒ فرما رہے تھے: "اکبر! سیکری جاؤ، وہاں شیخ سلیم چشتیؒ موجود ہیں وہ ہمارے ہی خاندان سے ہیں اور شیخ الہند ہیں، تم ان سے رجوع کرو، وہ تمہاری مراد پُوری کر دیں گے!"
اکبر اجودھن بھی گیا اور بابا فریدؒ کے مزار پر اولادِ نرینہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہاں سے بھی یہی جواب ملا: "سیکری جاؤ، وہاں ہمارے بھائی سلیم چشتیؒ موجود ہیں، ان سے تمہارے تسکینِ دل کو سکون ملے گا۔"
اکبر سیدھا سیکری روانہ ہو گیا۔
حضرت سلیم چشتیؒ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انھیں اپنے سامنے ہندوستان کا مغل فرمانروا دست بستہ کھڑا نظر آیا۔
آپ نے بے نیازی سے دریافت کیا: "خود کو ظل اللہ کہلانے والا ہمارے روبرو دست بستہ کیوں کھڑا ہے؟"

اکبر نے رقّت سے حالِ دل بیان کیا اور پُوری روداد سنا کر عرض کیا: "اجودھن اور اجمیر کے بزرگوں کی سفارش لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ چاہیں تو میری خواہش پوری فرمادیں، ورنہ دُھتکار دیں۔"

آپ نے دریافت کیا: "تو اولادِ نرینہ کا طالب ہے؟"

"جی ہاں بندہ پرور!" اکبر نے جواب دیا۔ "اور مَیں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنے بیٹے کو آپ کی توجّہ اور تربیت میں دے دُوں گا!"

آپ ذرا سی دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے اور ارشاد فرمایا: "بے منّت بخشنے والا تجھے تین بیٹے دے گا۔"

اکبر نے کہا: "مَیں پہلا بیٹا آپ ہی کے حوالے کر دُوں گا۔ اس کی حیات اور حفاظت آپ ہی کے ذمّے ہوگی۔"

آپ نے کہا: "مبارک باشد، ہم نے بھی اس کو اپنا ہم نام کیا۔"

جب اکبر آگرے سے واپس پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ مریم زمانی امید سے ہے۔ اکبر نے سیکری میں آپ کے حجرے کے قریب ہی سنگِ سُرخ سے ایک شاندار محل تعمیر کرایا اور اسی محل میں مریم زمانی کو منتقل کر دیا گیا۔ اس محل کے دو حصے تھے۔ رنگ محل اور بدیع محل۔ بدیع محل آستانہ حضرت سلیم چشتیؒ سے ملا ہوا تھا۔ اسی بدیع محل میں جہانگیر پیدا ہوا، یہیں اس کی نال گاڑی گئی اور اس کا نام سلیم رکھا گیا۔

اکبر نے اپنی منّت پُوری کی اور آگرے سے اجمیر تک کا سفر پاپیادہ طے کیا، دورانِ سفر اس نے جہاں بھی پڑاؤ کیا وہاں ایک منارہ تعمیر کرایا۔ یہ منارے ابھی تک موجود ہیں۔ اکبر نے ایک منارہ خاص جے پُور میں تعمیر کرادیا تھا اس کا نام ہرن منارہ رکھا تھا۔

واپسی پر حضرت سلیم چشتیؒ کے لیے ایک مکان اور خانقاہ تعمیر کرائی جس کی تاریخِ تعمیر "خانقاہ اکبر" سے نکلتی ہے اور یہیں آپ کی خواہش پر ایک شاندار جامع مسجد بھی تعمیر ہوئی اور شمال مشرق میں ایک شہر آباد کیا گیا جس میں اکبر کے خاص محلات، محلاتِ خواتین و بیگمات، دیوانِ خاص، دیوانِ عام، حوض، چمن، باغ، دفاتر، ٹکسال، عبادت گاہ، دارالمناظرہ، نورتنوں کے مکانات، حکماء کی قیام گاہیں، فیل خانہ، خزانہ، جملہ لوازماتِ شاہی سے متعلقہ عمارتیں یہیں پہاڑی پر تعمیر ہوئیں اور یہ سلسلہ آگرے کے دروازے تک چلا گیا ہے۔ یہیں محلاتِ شاہی کا ہتیاپول نامی دروازہ بھی ہے جس کے دونوں طرف سنگِ سُرخ کے دو ہاتھی ایستادہ ہیں۔

ہارون رشید کے وزیر حسن بن سہل سے ایک چُغل خور مصاحب نے کسی ایسے شخص کی شکایت کرنی شروع کر دی جو سخاوت میں اسراف سے کام لیتا تھا۔ چُغل خور نے کہا: "وہ لوگوں کو بے دریغ بڑی بڑی رقمیں دے ڈالتا ہے، حاجت مندوں کو ان کی ضروریات سے زیادہ دے دیتا ہے۔" پھر کچھ رُک کر بولا: "اسے اسراف نہیں تو اور کیا کہیں گے اور ظاہر ہے کہ اسراف میں کوئی خیر نہیں!"

حسن بن سہل نے کہا: "تم اُلٹی بات کر رہے ہو۔ "اسراف میں کوئی خیر نہیں" کے بجائے تم یہ کہو کہ "خیر میں کوئی اسراف نہیں۔""

کڑاکے کی سردیوں میں مُلا عبدالقادر بدایونی (معتمدِ اکبر) آپ سے ملنے سیکری پہنچا اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شمالی ہند کی ٹھٹھرا دینے والی سردی کا حضرت سلیم چشتیؒ پر کوئی زور نہ چل رہا تھا، آپ باریک ململ کے کرتے میں ملبوس مُلا عبدالقادر سے گفتگو فرماتے رہے۔



اکبر شہزادے سلیم اور مقربینِ خاص کے ساتھ آپ کی خانقاہ میں داخل ہوا اور نیاز مندانہ گفتگو کرتا رہا۔ اس نے دورانِ گفتگو محسوس کیا کہ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اکبر نے اچانک سوال کیا: "حضرت! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کُل کتنی عمر عطا فرمائی ہے؟"

آپ تھوڑی دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر سر اُٹھا کر فرمایا: "وصالِ محبوبِ حقیقی کے دن کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے!" پھر شہزادے سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "لیکن جس دن یہ شہزادہ ہمیں کوئی کلام سنائے گا وہی ہماری رحلت کا وقت ہوگا!"

اکبر نے شہزادے کو حکم دیا: "شیخو بابا! تم منظوم کلام حفظ نہیں کرو گے!" پھر اساتذہ اور اتالیق کے نام فرمان جاری ہوا کہ "شہزادے کو منظوم کلام نہ یاد کرایا جائے!"

اس فرمان کے نفاذ کو دو سال سات ماہ گزر گئے۔ شہزادے کو ہر قسم کی نظم سے دُور رکھا گیا۔

پھر شہزادے کے دل سے حضرت سلیم چشتیؒ کی بات نکل گئی۔

ایک دن شہزادے نے ایک نہایت عمدہ اور جاذبِ نظر لباس پہنا اور بن سنور کر جب وہ کنیزوں کے سامنے سے گزرا تو وہ عورت جو شہزادے کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے رائی نون آتارا کرتی تھی اور شہزادے پر سے صدقات اور خیرات نچھاور کیا کرتی تھی، شہزادے کو ایک طرف لے گئی اور کہا: "صاحب عالم! آپ اس وقت تک یہاں سے کہیں نہ جائیں گے جب تک مَیں آپ کی نظر نہ آتار لوں!"

اس کے بعد اس نے نظر آتاری اور شہزادے سے کہا: "شہزادے! ذرا اس شعر کو تو پڑھنا۔

الٰہی غنچۂ اُمید بکشا گلے از روضۂ جاوید بنما

شہزادے کو یہ شعر بے حد پسند آیا۔ یہ اسے رٹتا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا: "حضورِ والا! آج میری ایک خدمت گار عورت نے مجھے ایک بہترین شعر سنایا ہے۔ ذرا آپ بھی سماعت فرمائیں!"

اس کے بعد فوراً ہی یہ شعر بھی سُنا دیا۔

آپ نے حالتِ اضطراب میں شعر سُنا اور بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شہزادے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ مجرمانہ انداز میں منہ چھپانے لگا۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ اکبر تک نہ پہنچتی۔ وہ پریشان ہو گیا اور شہزادے کو ڈانٹا لیکن اس ڈانٹ سے کیا ہوتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اسی شب آپ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ دُوسرے دن، صبح آپ نے تان سین کو طلب فرمایا اور اس کو گانے کا حکم دیا۔ اس نے آپ کو گانا سُنایا۔ گانا سُن چکنے کے بعد آپ نے متبسم ہو کر فرمایا: "دوستو! وعدۂ وصال آ پہنچا۔ اب ہم رخصت ہو جائیں گے۔"

قریب ہی شہزادہ سلیم بھی موجود تھا جو زار و قطار رو رہا تھا۔

آپ نے شہزادے کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "تم کیوں روتے ہو؟ تم نے وہی کیا جس کا مشیت نے حکم دیا۔" اس کے بعد آپ نے اپنی دستار اُتار کر شہزادے کے سر پہ رکھ دی اور فرمایا: "سلطان سلیم ہمارا جانشین ہے اور ہم اسے خدائے حافظ و ناصر کے سپرد کرتے ہیں۔"

یہ ۲۸، ۲۹ رمضان $\frac{۹۷۹}{۱۵۷۱}$ھ کی درمیانی شب کی بات ہے کہ آپ رحلت فرما گئے۔

آپ کی وفات سے دُور دُور ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ بادشاہ نہایت غمگین ہوا۔ نمازِ جنازہ قاضی القضاۃ، مخدوم الملک مُلا عبداللہ سلطان پوری نے پڑھائی۔ اکبر اپنے جملہ وزراء کے ساتھ کندھا دیتا ہوا پاپیادہ جنازے کے ساتھ چلا۔ ہندوستان کا عظیم فرمانروا اکبر اپنے کاندھے سے بار بار آپ کے جنازے کا بوجھ اٹھاتا، جامع مسجد کے صحن تک لے گیا۔ مسجد کے شمالی گوشے کے وسطِ صحن میں آپ کی قبر کھودی جا رہی تھی۔ پتھریلی زمین کو جب کھودا گیا تو اس میں سے ریتیلی مٹی نکلنی شروع ہوئی۔ صدر الصدور حاجی الحرمین شیخ عبدالنبی بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے حیرت و استعجاب سے وہ مٹی اٹھائی اور اسے تادیر دیکھتے رہے۔ بادشاہ نے پوچھا: "عبدالنبی! اس پہاڑی زمین سے ریگستانی مٹی کیوں نکل رہی ہے؟"

صدر الصدور نے جواب دیا: "قبلۂ عالم! یہ تو مدینہ منورہ کی مٹی نظر آتی ہے!"

جو لوگ حضرت سلیم چشتیؒ سے بہت زیادہ قریب رہے تھے انہیں رسُول اللہ کے اس ارشادِ مبارک کا علم تھا جس میں آپ نے حضرت سلیم چشتیؒ سے وعدہ فرمایا تھا کہ: "تم ہندوستان واپس جاؤ، تم کو وہیں تمہارے وطن میں جلتے دفن کے لیے مدینے کی زمین عطا کی جائے گی"

جو لوگ اس ارشادِ مبارک سے آگاہ تھے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ صدر الصدور نے رقت سے کہا: "ہمیں اس مٹی سے کوئے یار کی بُو محسوس ہوتی ہے۔"

عقیدت مندوں نے تاریخ کے مادے نکالے۔

ایک طرف سے صدائے تاریخ بلند ہوئی: "زخود فانی بحق باقی"
(اپنی ذات سے فنا ہو گئے ذاتِ حق کے ساتھ باقی)

کسی دُوسرے نے کہا: "شیخ ہندی"

تیسرے نے عرض کیا: "شیخ حکا"

لیکن یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ اس نامی گرامی شخصیت کو جتنی شہرت حاصل ہوئی ان کا ذکر اولیائے کرام کے مجموعوں میں نہیں ملتا۔ تاریخیں ان کا ذکر اختصار سے کرتی ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لئے بڑی چھان بین کرنی پڑتی ہے لیکن اُسی قدر یہ ایک زندہ و پایندہ حقیقت ہے کہ جتنی واضح اور غیر مبہم کرامات آپ سے ظاہر ہوئیں ان کی شہادتیں دُنیا کی عظیم شخصیات نے دی ہیں۔



خواجہ باقی باللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا محض تاریکی اور تضادات کا مجموعہ ہے اور یہ چاند، سورج محض روشنی کے وہ استعارے ہیں جو انسان کو اپنے اندر کے اندھیرے دور کرنے پر اکساتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی ایسے ہی انسانوں سے تھا۔ جن کا پیغام اور تعلیمات کے اثرات ایسی ہی تاریکی دور کرنے پر متوجہ کرتے رہے۔ مخلوق خدا کو آپ سے فیض حاصل ہوتا رہا کہ یہی باری تعالیٰ کی منشا تھی۔

اللہ کے پیغام کے امین، روشنی کے مینار ایک ولی کی روداد



سمرقند کے قاضی عبدالسلام خجی اپنے زمانے کے عالم باعمل اہل فضل وصفا اور صاحب وجد وحال بزرگ تھے۔ یہ تلاش معاش میں اپنا وطن چھوڑ کر کابل پہنچے اور وہیں شادی کرلی۔ یہیں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ قاضی عبدالسلام نے اپنے بیٹے کا نام سید رضی الدین محمد باقی رکھ دیا۔ یہ صحیح النسب حسینی سادات کا خاندان تھا۔ بیٹے کی پیدائش 971 بمطابق 1563ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ سن ہجری کا یہ سال تاریخ میں یادگار ثابت ہوگا اور پیدا ہونے والا بچہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے شہرت اور حضرت خواجہ مجدد الف ثانی کے پیر ومرشد ہونے کا شرف حاصل کرے گا۔

قاضی عبدالسلام اپنے بیٹے کی پیشانی بہت غو۔ سے، دیکھتے تھے، انہیں ۔ پیشانی میں ایسا نور دکھائی دیتا جس کی شعاعیں شش

جہت پر محیط تھیں اور جس کی زد میں امیر و غریب، عوام و خواص، راعی و رعایا، حاکم و محکوم اور خورد و کلاں تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتے رہتے۔ "بیوی! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے گویا میرے گھر میں ایک آفتاب اتر آیا ہے اور عنقریب اس کی توانائی اور روشنی سے ایک زمانہ مستفیض ہوگا۔" بیوی اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملا دیتی اور دل سے یہی دعا مانگتی کہ خدا شوہر کی زبان مبارک کرے۔

جب خواجہ محمد باقی پانچ سال کے ہو گئے تو باپ نے کابل کی مشہور درس گاہ خواجہ سعد کے مکتب میں داخل کر دیا۔ یہاں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ضروری مسائل بھی حفظ کرتے رہے۔ دس سال کی عمر میں عربی کی تعلیم شروع کی اور مکتب سے فارغ ہو کر اپنے عہد کے مشہور عالم مولانا صادق حلوائی کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا کی صحبت میں خواجہ محمد باقی کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں۔ استاد کو اپنے ہونہار اور غیر معمولی شاگرد میں معلوم نہیں کیا نظر آیا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر ماوراء النہر چلے گئے۔ وہاں بھی تحصیل علم کا عمل جاری رہا اور تیس سال کی عمر میں خواجہ محمد باقی کا شمار جید علما میں ہونے لگا۔

اب خواجہ محمد باقی کا کسی ایک جگہ دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت تصوف و سلوک کی طرف مائل رہنے لگی اور اس عہد کے نامی گرامی اولیاء کی صحبتوں میں حاضریاں دینے لگے۔ علم تو حاصل کیا ہی تھا اب کمالات باطنی کا اکتساب بھی شروع ہو گیا۔ اس جدوجہد میں انہوں نے بلخ، بدخشاں، ماوراء النہر کے دوسرے شہروں اور ہندوستان کے اکثر مقامات کا سفر کیا۔ خواجہ محمد باقی مراقبے میں چلے جاتے اور اللہ کی یاد میں دنیا و مافیہا کو بالکل بھلا دیتے۔

دوران سفر آپ لاہور پہنچ گئے۔ سچائی کی تلاش میں یہ معلوم نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتے۔ میدان، کوہستان، ویرانہ، قبرستان کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں خواجہ باقی نہ جاتے ہوں۔ آپ کی ماں کابل میں تھیں اور بیٹے کی جدائی کے غم میں آنسو بہاتی رہتی تھیں۔ کسی نے انہیں اطلاع دی کہ ماں میں نے آپ کے بیٹے کو دہلی میں دیکھا تھا۔ کھویا کھویا کسی شے کی تلاش میں گم ادھر ادھر پھر رہا تھا۔

ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے۔ "اے اللہ العالمین! میرے بیٹے پر رحم فرما اور جس شے کی تلاش میں وہ سرگرداں ہے اس سے اس کو نواز دے۔"

دوسری طرف لوگ خواجہ سے کہتے۔ "جناب، آپ کی ماں آپ کے لیے بہت بے قرار رہتی ہے۔ آپ جلد از جلد اس تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔"

خواجہ باقی جواب دیتے۔ "ہاں جب میں اس کو پا جاؤں گا تو ضرور اپنے گھر جاؤں گا۔ ابھی تو اس کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔" لوگ ان پر ہنسنے لگتے۔ جنہیں خواجہ باقی سے دلچسپی ہوتی تھی وہ ان کا پیچھا کرتے اور یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہو جاتے کہ ابھی تو خواجہ باقی آبادی میں ہیں اور کچھ دیر بعد ویرانے میں پہنچ گئے۔ ابھی تو انہیں جنگل میں دیکھا گیا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ قبرستان میں نظر آتے پھر دیکھنے میں آتا کہ کوئی شخص کوہستانی سلسلوں میں محو سفر ہے۔ جب پاس جا کر پہچاننے کی کوشش کی جاتی تو یہ خواجہ باقی نکلتے۔

کسی شخص نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔ "جناب! یہ چکر کیا ہے؟ کیا آپ کے پاؤں میں آبلے نہیں پڑ جاتے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "آبلے پڑ کیوں نہیں جاتے!"

اس شخص نے کہا۔ "اگر آبلے پڑ جاتے ہیں تو آپ یہ صحرا نوردی ترک کیوں نہیں فرماتے؟"

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ "جس کو تم صحرا نوردی کہتے ہو وہ کسی شے کی تلاش کا بامقصد سفر ہے اور اس تلاش میں چونکہ شوق کی آگ مشتعل ہے، اس لیے تکلیفوں اور اذیتوں کا خیال یا احساس تک نہیں ہوتا۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟"

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ "بالکل پوچھ سکتے ہو۔ میں اس کا جواب دوں گا۔"

اس شخص نے کہا۔ "تو آپ سمجھ لیں کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ کس شے کی طلب آپ کو آوارہ و سرگرداں کیے ہوئے ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کسی ولی کامل کی تلاش۔ کسی مرد کامل کی جستجو لیکن یہ کہیں مل ہی نہیں رہا۔"

اس شخص نے کہا۔ "جب وہ ابھی تک نہیں ملا تو آگے کیا امید کہ وہ مل ہی جائے گا۔"

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ "تو اس شوق کو کیا جانے۔ کوشش اور تلاش میرا فرض ہے اب وہ ملے یا نہ ملے یہ میری قسمت۔ اگر میری طلب صادق ہے تو میں اس کو پا کر رہوں گا۔"

اس شخص نے کہا۔ "ایک بات میری بھی مانیے۔ آپ اپنے گھر واپس جائیں جہاں آپ کی ماں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جس

مردِ کامل کی آپ کو تلاش ہے وہ اگر مل بھی گیا تو اس سے آپ کو حاصل کیا ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ناصح تو بہت مل جاتے ہیں لیکن ہمت افزائی کرنے والا ایک بھی نہیں ملتا۔ تیری نصیحتوں کا شکریہ میں تلاش اور جستجو جاری رکھوں گا۔"

اس شخص نے برا سا منہ بنایا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔ "غریب اس کی تلاش میں ہے جس کا وجود ہی نہیں۔ مردِ کامل، اس دنیا میں ایک چیز بھی کامل نہیں پھر یہ مردِ کامل کہاں ملے گا۔ آپ پر اللہ اپنا رحم کرے۔" خواجہ باقی کو اس شخص کے سوال جواب سے بڑی اذیت پہنچی مگر صبر سے کام لیا۔

اس طلب اور جستجو میں آپ کو کیچڑوں اور دلدلوں سے بھی گزرنا پڑا مگر آپ باز نہ آئے۔

ایک دن اسی صحرا نوردی میں انہوں نے ایک ننگ دھڑنگ شخص کو برفانی علاقے میں سفر کرتے دیکھا، اس پر موسم کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ خواجہ باقی اس حیرت انگیز مشاہدے سے متاثر ہو کر اس فقیر کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ "اے اللہ کے والی! میں کچھ عرصے آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔"

درویش نے چونک کر خواجہ باقی کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر اپنی راہ لی۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے چل پڑے۔ درویش نے پلٹ کر خواجہ باقی کو دیکھا اور دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔ گویا وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔ آپ نے اس کا پیچھا کیا اور خود بھی دوڑنے لگے۔ دونوں بھاگتے بھاگتے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد درویش ایک چٹان پر کھڑا ہو گیا اور ایک پتھر تان کر خواجہ کے پاس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

خواجہ باقی کو ڈر لگا کہ کہیں یہ ننگ دھڑنگ شخص انہیں زخمی نہ کر دے۔ انہوں نے دور ہی سے کہا۔ "بابا! میں نے کیا خطا کی ہے جو پتھر تان رکھا ہے؟"

درویش نے غصے میں کہا۔ "تو میرا پیچھا کیوں کرتا ہے؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کا پیچھا نہیں کیا، میں تو آپ کی صحبت میں رہنے کا متمنی ہوں۔"

درویش نے تنک کر کہا۔ "لیکن میں تیری صحبت میں نہیں رہنا چاہتا۔"

خواجہ باقی کو بڑا دکھ پہنچا، بولے۔ "بابا! زبردستی کی بات نہیں ہے میں تو عاجزانہ درخواست کر رہا ہوں۔ اگر آپ صحبت میں رہنے کی اجازت دیں گے تو آپ کے پاس رہ لوں گا ورنہ مجبوری ہے۔"

درویش نے کہا۔ "میں تجھ کو اپنے پاس رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

خواجہ باقی لاجواب ہو کر جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد عرض کیا۔ "اچھا جناب! میں آپ کے پاس نہیں آؤں گا لیکن دور دور رہ سکتا ہوں۔"

درویش نے پوچھا۔ "وہ کیوں...... میں تو تیرے سائے تک سے نفور ہوں۔"

خواجہ باقی نے عرض کیا "میں نے ایک بات آپ کی مان لی ایک بات آپ میری مان لیجیے۔"

درویش نے سکوت اختیار کیا۔ آپ نے اسے درویش کی رضامندی سمجھا اور درویش سے دور دور رہنے لگے۔ اب درویش نے مستقلاً چلنا اختیار کیا...... کبھی تیز تیز اور کبھی آہستہ آہستہ۔ خواجہ باقی عاجز آ گئے لیکن انہوں نے بھی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ اس درویش کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک دن درویش نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ برف پر ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ خواجہ باقی نے بھی اس کی اتباع میں بھاگنا شروع کر دیا لیکن سرد ہوائیں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ گر گئے، درویش نے انہیں مڑ کر گرا ہوا جو دیکھا تو زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ "میرا مقابلہ کرے گا۔ بڑا آیا مقابلہ کرنے والا۔ اب میں دیکھوں گا تو میرا کس طرح پیچھا کرتا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس راہ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر آپ کی صحبت میں رہنا نہیں چھوڑوں گا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔"

درویش نے ہنس کر کہا۔ "اٹھ اٹھ، میں آگے جا رہا ہوں۔ میرا پیچھا کر۔ یوں لیٹے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ شاباش جلدی سے کھڑا ہو جا۔"

خواجہ باقی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ کافی

دیر بعد درویش ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ وہاں ایک درخت کے سوا جو درخت تھے وہ چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کے سائے میں کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ خواجہ باقی درویش سے کچھ فاصلے پر آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔

درویش نے بڑی محبت سے انہیں اپنے پاس بلایا۔ ”وہاں کیوں کھڑا ہے میرے پاس درخت کے سائے میں آجا۔“

خواجہ باقی نے درویش کو سوالیہ اور اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ درویش نے کہا۔ ”میری صورت کیا دیکھتا ہے میں نے کہہ جو دیا کہ میرے پاس آجا۔“

خواجہ باقی ہمت کر کے درویش کے پاس چلے گئے اور اس کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پہلے تو انہیں مسکرا کر دیکھا۔ اس کے بعد ایک زوردار تھپڑ خواجہ باقی کے منہ پر رسید کر دیا۔ خواجہ باقی چکرا کر گر گئے۔ گرتے ہی درویش نے انہیں ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی نے بچنے کی کوشش نہیں کی کہا۔ ”میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ مجھ کو جان سے مار دیں میں اس کو اپنے حق میں اعزاز سمجھوں گا۔“

درویش نے سر پر ایک ہاتھ اور رسید کر دیا اور کہا۔ ”اگر یہ تیرے حق میں کوئی اعزاز ہے تو میں اس اعزاز سے تجھ کو روز ہی نواز سکتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی مار کو بھی اعزاز ہی سمجھ سکتا ہوں۔“

درویش کو ہنسی آ گئی، کہا۔ ”بھائی تو تو مزے کا انسان ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کیا خاک مزے کا انسان ہوں۔“

درویش نے ان کی گدی پر ایک ہاتھ رسید کر دیا اور پوچھا۔ ”کہو بیٹا کیسی رہی، مزہ آیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی ہر مصیبت برداشت کر لوں گا لیکن آپ کی رفاقت نہیں چھوڑوں گا۔“

درویش نے کہا۔ ”تو اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے چلا جا اور جو کرنا ہے اپنے طور پر کر۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں اپنا وقت اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک آپ اپنا وقت برباد کرتے رہیں گے۔“

درویش نے پوچھا۔ ”اچھا بتا تو چاہتا کیا ہے؟“

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ”بابا! مجھے درویش کامل کی تلاش تھی سو وہ آپ کی شکل میں مل گیا۔ اب میں آپ کے ذریعے خدا کو تلاش کروں گا۔“

درویش زور زور سے ہنسنے لگا۔ ”خدا کو...... کس خدا کو...؟ یہ کون ہے......؟ میری تو اس سے ملاقات نہیں ہوئی، ورنہ ہی میں اس سے واقف ہوں۔“

خواجہ کو درویش کی باتیں اچھی نہیں لگیں، بولے۔ ”تعجب ہے کہ آپ خدا کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“

درویش نے کہا۔ ”ہاں میں خدا کے بارے میں ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ اگر وہ کہیں موجود ہے تو اس سے ملاقات ہونا چاہیے تھی مگر ہمیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو یہ کہتا کہ اس نے خدا کو دیکھا یا اس سے ملاقات کی ہے اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ نہیں ہے...... لاالہ۔“

خواجہ باقی کے دل پر چوٹ سی لگی کہ جس شخص کے پیچھے انہوں نے اتنا وقت برباد کیا وہ کیسی کافرانہ اور ملحدانہ باتیں کر رہا ہے۔

درویش نے کہا۔ ”اب تو تجھے میری حقیقت معلوم ہوئی۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

خواجہ باقی نے یوں محسوس کیا گویا اندر سے کوئی انہیں سمجھا رہا ہے کہ خواجہ باقی درویش کی باتوں میں قطعی نہ آنا۔ یہ فرقہ ملامیہ سے تعلق رکھتا ہے جو ایسی روش اختیار کرتے اور ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دنیا ان سے دور دور رہے۔ یہ بھی تجھے بھگانے کی خاطر ایسی باتیں کر رہا ہے۔ خواجہ باقی نے کہا۔ ”بابا! میں نے ایک بار جب یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا تو میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ مجھے آپ سے کچھ ملتا ہے یا نہیں، میں بہرحال آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔“

درویش آگ بگولا ہو گیا۔ ”او سگِ دنیا، لالچی انسان! تیری سمجھ میں میری باتیں کیوں نہیں آ رہی ہیں۔ کیا میں سمجھانے میں ناکام رہا ہوں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں سگِ دنیا بھی ہوں اور لالچی انسان بھی مگر میں رہوں گا آپ کے ساتھ ہی۔“

درویش نے چڑ کر کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو آ میرے ساتھ چل، میں بھی تیری ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”بسم اللہ، میں تیار ہوں۔“

درویش پہلے تو تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ آپ نے بھی اسی کی طرح چلنا شروع کر دیا پھر درویش نے بھاگنا شروع کر دیا آپ بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگے۔ درویش بھاگتے بھاگتے ایک مکان میں گھس گیا۔ خواجہ باقی نے بڑی ہمت کی کہ مکان میں داخل ہو جائیں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑی اور دروازے پر بیٹھ کر درویش کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

بڑی دیر ہو گئی مگر درویش باہر نہیں نکلا۔ خواجہ باقی کو شبہ گزرا کہ کہیں یہ مکان درویش کے کسی رشتے دار کا تو نہیں کیونکہ اگر یہ کسی غیر کا گھر ہوتا تو درویش کو دھکے دے کر نکالا جا چکا ہوتا۔ خواجہ باقی نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ خواجہ باقی نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک جوان مشتعل نمودار ہوا اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تمہیں کس سے ملنا ہے؟“

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ”تقریباً ایک گھنٹا پہلے اس مکان میں ایک درویش داخل ہوا تھا۔ میں اس کے انتظار میں باہر کھڑا ہوں۔“

جوان نے طنزاً کہا۔ ”بھائی کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ یہاں تو کوئی درویش نہیں آیا اور پھر وہ یہاں کیا لینے آئے گا۔ کہاں وہ درویش اور کہاں یہ میرا گھر۔ اس کا میرا گھر سے کیا تعلق۔“

خواجہ باقی کو بڑا دکھ ہوا کہ درویش انہیں دھوکا دے کر چلا گیا۔ اب وہ مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے قہقہہ لگایا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہی درویش کھڑا ہنس رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بس دیکھ لیا تیرا عشق، تیری طلب صادق، میں نے تو تیرا ساتھ چھوڑا نہیں اور تو ہے کہ میرے بغیر واپس جا رہا ہے۔“

خواجہ باقی تیزی سے درویش کی طرف مڑے اور فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ انہیں دل کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ ”خواجہ باقی! درویش کو پہچاننے کی کوشش کر، یہ تجھے آزمائش میں ڈال رہا ہے۔“

یہ درویش کے پاس گئے اور کہا۔ ”بابا! مجھے پریشان نہ کیجیے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔“

درویش نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ”ہوں..... تو میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑے گا۔ میں پتھر مار مار کر تیری جان لے لوں گا۔ آخر تو سمجھتا کیا ہے خود کو۔“

خواجہ باقی نے درویش کی ایک نہ سنی اور اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ درویش نے پتھر اٹھا کر مارنا شروع کر دیے۔ خواجہ باقی کا سر اور جسم کے مختلف حصے لہولہان ہو گئے۔ درویش انہیں زخمی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ درویش بھاگ کر ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے ساتھ ہی اندر چلے گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ درویش چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے خواجہ باقی کو دیکھتے ہی کہا۔ ”خواجہ محمد باقی آگے آؤ میرے قریب۔“

خواجہ باقی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن وہ درویش کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

درویش نے چوکی چھوڑ دی اور خواجہ باقی کو حکم دیا۔ ”باقی باللہ چوکی پر بیٹھ جاؤ۔“

خواجہ باقی نے پوچھا۔ ”باقی باللہ..... یہ کیا فرمایا آپ نے۔ باقی باللہ کون؟“

درویش نے جواب دیا۔ ”تو ہے باقی باللہ۔ میں نے تجھ کو خواجہ باقی باللہ کر دیا۔“

خواجہ باقی کو درویش کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہا۔ ”بابا! کہاں تو آپ مجھ سے بیزار تھے اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھے باقی باللہ کا لقب مرحمت فرما رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟“

درویش نے کہا۔ ”خواجہ باقی! جب تو میرے پاس آیا تھا میں نے تجھے پہچان لیا تھا لیکن میں تجھ کو پختہ کرنا چاہتا تھا۔ تیرے ایمان اور تیرے یقین کو قلندرانہ کافرانہ باتوں سے پرکھنا چاہتا تھا۔ تیری طلب صادق کی آزمائش مقصود تھی پھر میں نے تجھے گالیاں دیں اور پتھروں سے لہولہان کر دیا اور اس طرح میں تیرے پائے ثبات کی استقامت دیکھ رہا تھا۔ تو سارے ہی امتحانات سے بخیر و خوبی گزر گیا اور اس کا مستحق ٹھہرا کہ میں تجھے باقی باللہ کے لقب سے نواز دوں۔“

خواجہ نے وفورِ جذبات میں کہا۔ ”میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔“

درویش نے کہا۔ ”شکریہ میرا نہیں اپنے رب کا ادا کر۔“

خواجہ باقی باللہ درویش کے اصرار پر چوکی پر بیٹھ گئے۔ درویش نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر خواجہ باقی باللہ کو دعائیں دیں اور پھر جھونپڑی کے کسی گوشے سے مٹھائی لا کر خواجہ باقی کا منہ میٹھا کیا۔ اس کے بعد درویش نے انہیں اپنی صحبت میں

اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ خواجہ باقی کو چند دنوں میں ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ درویش کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ اس نے ریاضت اور مجاہدے کی ایسی تربیت دی کہ خواجہ باقی کا باطن منور ہو گیا۔ ایک دن درویش نے ان سے کہہ دیا کہ "بابا باقی باللہ! میری ذات سے تمہیں جو فیضان حاصل ہو رہا ہے، اس میں تمہاری اماں کی دعاؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔"

خواجہ باقی نے پوچھا۔ "میری ماں کی دعاؤں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "باقی باللہ! تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے اور دن رات تیرے حق میں یہ دعا کر رہی ہے کہ خدا تجھ کو تیرے مقصد کی حصولیابی میں جلد از جلد کامیاب کرے۔" خواجہ باقی باللہ کو رونا آ گیا۔ انہیں اپنی ماں کی یاد آ گئی تھی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد درویش نے آپ کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ لاہور واپس پہنچے اور لوگوں میں گھل مل گئے۔ انہیں اپنی ذات میں نمایاں تغیر محسوس ہونے لگا تھا پھر یہ باتیں دوسرے بھی محسوس کرنے لگے۔

ایک مسجد میں آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو شخص محو نماز تھا اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر کسی کی نظریں پڑ رہی ہیں لیکن پھر یہ سوچ کر اس واہمے کو دل سے نکال دیا کہ ان کے سامنے جو شخص بھی ہوگا اس کی پشت سامنے ہوگی لیکن کچھ ہی دیر بعد اس شخص نے پھر یہی کیفیت محسوس کی۔ بے اختیار اس کی نظریں اپنے سامنے کھڑے ہوئے خواجہ باقی باللہ پر پڑیں اور وہ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ خواجہ باقی باللہ اس کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ قبلہ رو تھا مگر پشت سے وہ کس طرح دیکھ رہے تھے۔ اس کیفیت کو اس نے دیکھ تو لیا مگر بیان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ناقابل فہم بات اس کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

نماز پڑھ چکنے کے بعد یہ شخص خواجہ باقی باللہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ "حضرت! میں آپ سے اس حد تک واقف ہوں کہ آپ غیر ملکی ہیں۔ کیا ہیں، کون ہیں میں نہیں جانتا مگر کچھ ایسی بات بھی ہے جو میرے لیے معما ہے اور میں اگر چاہوں بھی تو اس کو پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میرا نام خواجہ محمد باقی ہے، سمرقند میرا وطن ہے۔ میں خود کابل میں پیدا ہوا۔ تلاش حق میں سیاحت کر رہا ہوں۔ مرد کامل کی تلاش مجھے ادھر ادھر بھگائے پھر رہی ہے، اس کے علاوہ کیا جاننے کی خواہش ہے بیان کرو تا کہ اس کو بھی بیان کر دیا جائے۔"

اس شخص نے رک رک کر کہا۔ "خواجہ محترم! جب آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے میں آپ کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوچھوں، اپنا مفہوم کس طرح واضح کروں؟"

آپ نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا۔ "اے شخص! جو کچھ تو نے دیکھا اس کو اپنے تک ہی رکھ۔ چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کیا پوچھنے والا ہے۔"

اس شخص نے کہا۔ "جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ سے میں کیا پوچھنے والا ہوں تو آپ اس کا تسلی بخش جواب دے کر میری پریشانی دور کر دیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! ریاضت اور مجاہدے کے بعد اگر خدا کی مہربانی شامل حال ہو جائے تو ایسا وقت آ جاتا ہے کہ انسانی سینہ جوش انوار سے ابلنے لگتا ہے اور یہ نور ہر بن مو سے ابلنے، چھلکنے لگتا ہے جس سے دیکھنے والا یہی محسوس کرتا ہے کہ اس کو دیکھا جا رہا ہے۔"

وہ شخص خاموش ہو گیا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے اس شخص سے کہا۔ "کیا تو نماز کے لیے مسجد چلے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ضرور چلوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر آ میرے ساتھ چل۔" یہ دونوں ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آج وہ آپ کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ نماز پڑھنے کے دوران اس شخص نے آپ کے سینے سے نکلتی ہوئی ایسی آواز سنی کہ کانپ گیا۔ دل دہل گیا، بہ مشکل نماز ادا کی اور آپ سے پہلے ہی مسجد سے نکل گیا۔

جب آپ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو اس شخص کو منتظر پایا۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، کس کا انتظار ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آج میں کل سے زیادہ پریشان ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "وہ کیوں، خیریت تو ہے، وجہ؟"

اس نے جواب دیا۔ ”محترم خواجہ! کل تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آپ پشت سے مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن آج میں نے آپ کے اندر سے کچھ عجیب وغریب آوازیں سنیں، ایسی آوازیں کہ میرا دل دہل گیا۔ آخر یہ کیا ہے..... آپ کیا ہیں اور یہ سب آپ ہی کے ساتھ کیوں پیش آرہا ہے؟“

آپ نے سر جھکالیا۔ کچھ دیر خاموش رہے اس کے بعد فرمایا۔ ”اے شخص، کیا میں نے یہ بات کل ہی نہیں بتادی تھی کہ میرا سینہ جوشِ انوار سے ابل رہا ہے۔ یہ ابال جو آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہی تو نے سن لی اور اس سے بلاوجہ پریشان ہو رہا ہے۔“

وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور رقت زدہ لہجے میں درخواست کی۔ ”محترم خواجہ! آپ مجھے شرفِ بیعت سے سرفراز فرمائیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس لائق نہیں ہوں۔“

اس شخص نے مزید اصرار کیا مگر آپ انکار ہی کرتے رہے اور بالآخر آپ نے لاہور کو چھوڑ دیا اور ماوراءالنہر واپس چلے گئے۔ وہاں ماں بھی کابل سے پہنچ چکی تھیں۔ ماں نے بیٹے کو سینے سے لگالیا اور آپ ماں کے سینے سے لگے خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔

آپ کو یہاں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگا کہ کسی بزرگ کے دستِ حق کی ظاہری بیعت بہت ضروری ہے اس کے بغیر منزل پانا مشکل ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں بہت سارے بزرگوں کی بابت سوچا لیکن کسی کی طرف طبیعت نہیں راغب ہوئی۔ آخر اس عہد کے نامور ترین صوفی خواجہ امکنگی پر نظرِ انتخاب پڑی اور انہیں شدت سے ایسا لگا کہ خواجہ موصوف انہیں بلا رہے ہیں۔ آپ نے عالمِ تصور ہی میں جواب دیا۔ ”پیرومرشد! میں آیا۔ آپ میرا انتظار کیجیے۔“

ایک دن آپ علی الصباح اٹھے اور نمازِ فجر ادا کر کے خواجہ امکنگی کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ وہاں خواجہ امکنگی پہلے ہی سے آپ کے منتظر تھے۔ وہ اپنی خانقاہ سے باہر نکلے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آؤ خواجہ باقی باللہ۔ اب تک کہاں رہے؟“

خواجہ باقی باللہ نے جواب دیا۔ ”جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میں باقی باللہ ہوں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں ابھی تک کہاں تھا؟“

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ ”باقی باللہ! میں نے جو پوچھا ہے اس کو تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

خواجہ باقی باللہ نے اپنی پوری داستان انہیں سنادی اور کہا۔ ”بس اس درویش نے میری کایا پلٹ دی اور اب میں جو کچھ ہوں اسی درویش کا فیض ہے۔“

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ ”ہاں وہ شخص تیری تربیت کی خاطر ادھر بھیجا گیا تھا، اس نے اپنا فرض بہت اچھی طرح پورا کیا۔“

خواجہ باقی باللہ نے عرض کیا۔ ”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ کو کسی دستِ حق پرست کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میں بیکار محض ہوں۔“

خواجہ امکنگی نے فرمایا۔ ”خواجہ باقی باللہ! تو میری خانقاہ میں شب وروز رہ سکتا ہے۔ تو جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے مل جائے گا انشاءاللہ۔“ خواجہ باقی باللہ اسی وقت خانقاہ میں داخل ہو گئے۔

خواجہ امکنگی نے خواجہ باقی باللہ کو اپنے مریدوں میں شامل کرلیا..... اب تو ان کی خوشی کی انتہائی نہ رہی۔ یہ شب وروز خواجہ امکنگی کے پاس رہتے رہے۔ آخر ایک دن خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ ”پیرومرشد! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اب مجھے کہاں رہنا چاہیے؟“

خواجہ امکنگی نے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”فرزندِ من! تو ہندوستان واپس جا، وہاں بڑی ضرورت ہے۔ خدا تیری مدد کرے گا۔“

خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ ”مجھے کب روانہ ہو جانا چاہیے؟“

خواجہ امکنگی نے جواب دیا۔ ”میں تو کہتا ہوں تو اسی وقت ہندوستان چلا جا ویسے تیری مرضی، میں حکماً یا جبراً تجھے نہیں بھیج رہا ہوں۔“

خواجہ باقی باللہ یہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ماں نے پوچھا۔ ”کہو بیٹا! کیا خبر لائے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ماں! میں ہندوستان واپس جا رہا ہوں کیونکہ.....“

ماں نے بات کاٹ دی۔ پوچھا۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہ تو ہندوستان کیوں جا رہا ہے، وہاں تجھ کو کس نے بھیجا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ماں یہ میرے پیرومرشد کا حکم ہے، ماں میں سب کچھ ٹال سکتا ہوں لیکن اپنے پیرومرشد کا کہنا

نہیں ٹال سکتا۔"

ماں رونے لگیں، بولیں۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ایک بار پھر تجھ سے جدا ہو جاؤں گی۔ افسوس کہ میں تجھ کو روک بھی نہیں سکتی کیونکہ تجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے نہیں میرے لیے مانگا ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "ماں، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹے! میں نے خدا سے یہ دعا مانگ رکھی ہے کہ تو میرے بیٹے محمد باقی کے لیے وہی کر، جو اس کے حق میں بہتر ہو کیونکہ میں اس میں خوش ہوں، جو میرے بیٹے کے لیے بہتر ہو۔"

ماں کے پاس سے رخصت ہو کر خواجہ باقی باللہ دوبارہ اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ "حضرت! میں نے اپنی ماں سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اب جو میں نے خود کو ٹٹولا تو میں نے اپنے آپ کو اس لائق نہیں پایا، اب میں اس پس و پیش میں ہوں کہ ہندوستان جاؤں یا نہ جاؤں۔"

خواجہ امکنگی نے فرمایا "یہ وسوسۂ شیطان ہے۔ تمہیں ہندوستان جانا ہے کیونکہ یہ حکم ربی ہے۔ تم اس سلسلے میں استخارہ دیکھ لو، خدا کی مرضی واضح ہو جائے گی۔"

خواجہ باقی باللہ نے اپنے پیر کے مشورے پر استخارہ دیکھا۔ انہوں نے عالم رویا میں دیکھا ایک طوطا ان کے سامنے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا اگر یہ طوطا شاخ سے اڑ کر ان کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جائے گا تو میں اس کا یہ مفہوم لوں گا کہ ہندوستان کا سفر خدا کی مشیت ہے۔ ابھی آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ طوطا اڑا اور آپ کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنا لعاب دہن طوطے کی چونچ میں ڈال دیا اور طوطے نے آپ کے منہ میں شکر ڈال دی، یہ شکر وہ کہاں سے اور کس طرح لایا تھا، کچھ پتا نہ تھا۔

آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ طوطا خالص ہندوستانی پرندہ ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ میرا ہند جانا حکم ربی ہے، لعاب دہن کا یہ مطلب ہے کہ میں ہندیوں کو اپنی باتوں سے حق کی طرف لے آؤں گا اور طوطے کے شکر دینے کا یہ مطلب ہے ہندیوں کی طرف سے مجھ کو جو جواب ملے گا وہ بہت خوشگوار ہوگا۔

خواجہ باقی باللہ نے اپنا خواب خواجہ امکنگی سے بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "عزیز من! طوطا خالص ہندی پرندہ ہے، ہند میں کوئی شخص تجھ سے روحانی فیض حاصل کرے گا اور تو اس سے فیض یاب ہوگا۔"

آپ نے اسی وقت سفر کی تیاری شروع کر دی اور کچھ دنوں بعد آپ کابل پہنچ گیا آپ کی جائے مولد اور وطن تھا، کچھ دن کابل میں رہ کر آپ نے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور میں قیام فرمایا۔ لاہور کے علما اور فضلاء نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا، آپ نے اس شہر میں ایک سال قیام فرمایا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ اس دوران آپ نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ آپ سے پہلے آپ کی شہرت دہلی پہنچ چکی تھی۔

آپ جس قافلے میں سفر کر رہے تھے اس میں ایک شخص پیدل چل رہا تھا۔ آپ کچھ دور تک تو گھوڑے پر سوار رہے لیکن پھر اس پر سے اتر پڑے اور اس شخص کو اپنا گھوڑا پیش کر دیا۔

اس نے کہا۔ "میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ گھوڑے پر تو میں بیٹھوں اور آپ پیدل چلیں۔ مجھے معاف رکھیے اور مجھ پر رحم کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ حکم ربی ہے۔ تو اس پر بیٹھ جا.... میں گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔"

اس شخص نے شرما کر عرض کیا۔ "حضرت! میں یہ جرأت کس طرح کروں، لوگ طعنے دے دے کر مجھ کو ہلاک کر دیں گے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اس کا حل نکال لیا ہے تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میں اپنے چہرے پر چادر ڈال لوں گا اور تیرے گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔ اس طرح کوئی مجھ کو پہچان بھی نہ سکے گا۔"

آپ نے اس شخص کو اتنا مجبور کیا کہ وہ آپ کی بات ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے اس شخص کو اپنے گھوڑے پر بٹھا دیا اور اپنے منہ پر چادر ڈال کر خود پیدل چلنے لگے۔ جب منزل قریب آنے لگی تو آپ نے اس شخص کو گھوڑے سے اتار لیا اور اس پر خود سوار ہو گئے۔ منزل پر قیام کیا اور اس شخص سے کہا۔ "ایسا میں نے اس لیے کیا ہے کہ قافلے کے لوگ یہ نہ جان سکیں کہ میں نے پیدل سفر کیا ہے۔"

منزل پر قیام کے بعد جب پھر قافلہ روانہ ہوا تو آپ نے وہی طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ دلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ قیام کہاں فرمائیں۔ آپ نے دریائے جمنا کے کنارے قلعہ فیروز آباد کی عظیم الشان مسجد کو اپنے لیے پسند فرمایا۔ یہ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔

آپ کی شہرت پروقار انداز میں اس طرح پھیلی جیسے سورج کی کرنیں اس کے طلوع ہونے کے بعد چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ یہ شہرت چھوٹی بستیوں سے بڑی بستیوں تک اور وہاں سے امراء اور شاہی محلات میں داخل ہو گئی۔ یہ دور اکبری کا واقعہ ہے۔ اکبری دور کا وہ حصہ جس میں شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی۔ مغل فرماں روا اکبر کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ بادشاہ خود اپنے عہد کا مجتہد ہے اور اس کو کسی سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں۔ اکبر نے ملحدانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ آپ نے اپنے معتقدوں، نیازمندوں اور مریدوں کو شریعت کی پابندی اور سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی بار بار نصیحت فرمائی اور انہیں پراثر تحریروں سے اسلامی ذمے داریوں کا احساس دلایا۔ آپ کے نیازمندوں اور عقیدت مندوں میں جو لوگ شامل ہوئے تھے ان میں شیخ فرید بخاری، عبدالرحیم خانخاناں، مرزا قلیج خان، صدر جہان جیسے امرائے شاہی بھی شامل تھے۔

آپ اس عہد کے علماء اور دین دار لوگوں کو سنت نبوی ﷺ اور شریعت مصطفوی ﷺ کی پابندی پر آمادہ اور مجبور کرتے رہتے تھے، اپنے مریدوں کو مرید کرنے سے پہلے شریعت کے احیا اور تبلیغ پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور کسی کسی کو تو بڑے اصرار اور طویل آزمائش کے بعد مرید کرتے تھے۔

1008ھ بمطابق 1599ء میں خواجہ باقی کی خدمت میں سرہند سے ایک ایسا شخص دہلی آیا جس کے چہرے اور باتوں سے آدمی مرعوب اور دم بخود رہ جاتا تھا۔ یہ شخص "حج بیت اللہ" کے لیے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ دہلی میں قیام کیا تو کسی نے اس شخص سے خواجہ باقی باللہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ بزرگ شریعت محمدی ﷺ اور سنت نبوی ﷺ کے زبردست نائب اور مبلغ ہیں، یہ صاحب اشتیاق ملاقات میں قلعہ فیروز آباد کی مسجد میں خواجہ باقی کے پاس پہنچ گئے اور اجازت لیے بغیر اندر چلے گئے۔ اس وقت خواجہ باقی باللہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔

آنے والا ایک طرف اطمینان سے بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا کچھ دیر بعد باقی باللہ نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پوچھا۔ "کہو، کہاں سے آنا ہوا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جناب! میں سرہند سے آیا ہوں اور "حج بیت اللہ" کو جا رہا ہوں، میں نے لوگوں سے آپ کا ذکر سنا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا چیز تھی جو مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی۔"

خواجہ باقی باللہ نے کہا۔ "بیٹھو، ہم آپس میں تبادلۂ خیال کیوں نہ کریں۔"

یہ شخص آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں اتنے گھل مل گئے کہ جیسے ازل سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ سرہند سے آنے والا شخص آپ سے درخواست کر رہا تھا کہ "آپ مجھے بیعت فرمائیں۔"

خواجہ باقی باللہ نے فرمایا۔ "ایک شرط پر مرید کروں گا۔"

سرہندی نے پوچھا۔ "کون سی شرط؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے بعد تم میری اولاد کی تربیت کرو گے۔"

سرہندی نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "تب پھر آجاؤ، بسم اللہ، دیر کس بات کی ہے۔"

آپ نے اس سرہندی کو اپنا مرید کر لیا بعد میں یہ سرہندی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ "میں نے استخارے میں جس ہندی طوطے کو دیکھا تھا اور جس کی چونچ میں، میں نے لعاب دہن ڈالا تھا اور طوطے نے میرے منہ میں شکر ڈال دی تھی وہ شیخ احمد تم ہو۔ تم مجھ سے روحانی تربیت حاصل کرو گے اور میری اولاد تم سے روحانی فیض حاصل کرے گی۔"

اس کے بعد شیخ احمد سرہندی حج کرنے چلے گئے۔

وہ انوار کا سیل جو سینے میں موجزن تھا اور ہر بن مو سے اٹھنے لگا تھا ہرگز ہو کر آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ آپ اپنی نظریں نیچی رکھتے اور کسی شے یا شخص کو بغور نہ دیکھتے کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ چیز یا شخص اس کا متحمل نہ ہو سکے گا۔

آپ کی خانقاہ میں آنے جانے والوں کا ہجوم رہنے لگا لیکن ان میں ملاقات کم ہی سے ہوتی تھی۔

ایک دن ایک فوجی سردار آپ کے پاس آیا۔ دروازے پر آپ کا خادم کھڑا تھا۔ فوجی سردار نے خادم سے پوچھا۔ ''کیا خواجہ صاحب اندر موجود ہیں؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''ہاں جناب موجود ہیں، جائیے۔ مل لیجیے جا کر۔''

فوجی نے اپنے گھوڑے کی لگام خادم کو تھمائی اور خود اندر چلا گیا۔ خواجہ باقی اس وقت اندر موجود نہیں تھے۔ کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے۔ فوجی اندر بیٹھ کر آپ کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد آپ واپس آئے اور اپنے خادم کو اس حال میں کھڑا دیکھا کہ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی اور گھوڑا بار بار دم ہلا ہلا کر پاؤں پٹخ رہا تھا، آپ نے خادم سے پوچھا۔ ''یہ کس کا گھوڑا ہے؟''

خادم نے بے اختیار آپ کی طرف دیکھا، آپ بھی اس سے پوری طرح متوجہ تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو خادم تڑپ گیا، گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔ گریبان چاک کر ڈالا اور لباس کو تار تار کر کے جسم سے دور کر دیا۔ آپ نے گھبرا کر پوچھا تو یہ کیا کر رہا ہے؟ ہوش میں آ۔''

خادم نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور بار بار یہی رٹ لگائے رکھی۔ ''ہائے مار دیا۔ ہائے قتل کر دیا۔ ہائے میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟''

آپ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''اے شخص ہوش میں آ، تجھ کو میری عدم موجودگی میں محتاط رہنا تھا، مجھ سے نظریں نہیں ملانا چاہیے تھیں۔''

خادم نے ناچنا شروع کر دیا۔ خانقاہ کے لوگوں نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد یہ شخص ایک طرف چلا گیا۔ آپ نے اس کی تلاش میں آدمی چھوڑے مگر اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس کی کئی دن تک تلاش جاری رہی مگر اس کا دور دور تک پتا نہ تھا اور وہ ایسا لاپتا ہوا کہ پھر کہیں نظر ہی نہ آیا اور ہمیشہ کے لیے ناپید ہو گیا۔ آپ کو اس کی گمشدگی کا دکھ ہوا۔

کئی روز بعد جمعے کے دن آپ نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ اس وقت بھی سیلِ نو۔ آنکھوں میں مرتکز تھا اور آپ قوت میں پہاڑ ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اس وقت امام خطبہ شروع کر چکا تھا۔ آپ اگلی صف میں چلے گئے۔ امام نے خطبہ پڑھتے پڑھتے آپ کی طرف دیکھا، آپ نے بھی اسے دیکھا۔ امام کی حالت غیر ہو گئی وہ لڑکھڑا کر پیچھے گر گیا اور چیخنے چلانے لگا۔

کچھ دیر لوگوں نے انتظار کیا کہ امام ہوش میں آئے تو بقیہ خطبہ پورا کرے مگر اس کو ہوش نہ آیا۔ آخر نمازیوں نے ایک دوسرا خطیب کھڑا کر دیا۔ اس نے خطبہ پڑھا اس کے بعد نماز ادا کی گئی۔

آپ رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ کئی گھنٹے بعد جب بستر پر آئے تو انہوں نے اپنے بستر پر ایک بلی کو سوئے ہوئے دیکھا۔ آپ نے یہ سوچ کر اس کو نہیں بیدار کیا کہ وہ آپ ہی بیدار ہو جائے تو بہتر ہے مگر کافی دیر تک انتظار کے بعد جب بلی اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تو آپ بستر سے الگ سردی میں کھڑے رہے۔ فجر کی اذان کے بعد بلی چلی گئی لیکن آپ بستر میں جانے کے بجائے مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نمازِ فجر ادا کی۔ خواجہ باقی اپنی ذات سے جانور تک کو اذیت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

☆☆☆

آپ اپنے معتقدین میں بیٹھے کسی مسئلے پر غور و خوض فرما رہے تھے کہ چند مہمان اندر داخل ہوئے۔ آپ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے، یہ گرمی کے دن تھے۔ آپ نے مہمانوں کو خانقاہ میں ٹھہرایا۔ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ مہمان بھوکے تھے آپ کچھ دیر تو مہمانوں سے باتیں کرتے رہے مگر پھر مہمانوں نے کھانے کی خواہش کی۔ آپ نے خادم سے پوچھا۔ ''بول، کھانے کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ کہاں سے کیا جائے؟''

خادم نے عرض کیا۔ ''جنابِ والا! یہیں پڑوس میں ایک نانبائی رہتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں؟''

آپ نے خادم کو اجازت دے دی۔ ''جا، چند روٹیاں اور نہاری لے آ جو معاوضہ مانگے گا دے دیا جائے گا۔''

خادم فوراً بھاگا بھاگا نان بائی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''بھائی! ہمارے پیر و مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاں چند مہمان آ گئے ہیں اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے پیر و مرشد نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ چند روٹیاں اور نہاری لے آؤں۔ تیری بڑی مہربانی ہو گی اگر نہاری اور روٹیوں کا انتظام کر دے گا۔''

نانبائی نے پوچھا۔ ''میں یہ چیزیں ضرور فراہم کیے دیتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ تمہارے پیر و مرشد مجھ کو اس کا معاوضہ کیا دیں گے؟''

خادم نے عرض کیا۔ ''جو مانگو گے، دے دیں گے۔''

نانبائی نے کہا۔ ”اگر میں تمہارے پیرومرشد سے دہلی کی حکومت مانگوں، تو؟“

خادم نے جواب دیا۔ ”میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا دے سکیں گے اور کیا نہیں دے سکیں گے۔ مگر انہوں نے مجھ سے کہا یہی تھا کہ تم نہاری اور روٹیوں کے معاوضے میں جو چیز مانگو گے تمہیں دی جائے گی۔“

نانبائی نے کہا۔ ”لیکن تمہاری بات پر کس طرح یقین کرلوں، میں تو یہ وعدہ خواجہ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

خادم نے کہا۔ ”تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ تم نہاری اور روٹیاں لے کر میرے ساتھ چلو، میں اگر یہی بات ان کی زبان سے کہلوادوں تو تم کھانے کی چیزیں انہیں دے دینا لیکن اگر وہ حیض بیض کریں تو تمہیں اس کا اختیار ہوگا کہ کھانے کا سامان انہیں دو یا نہ دو۔“

نانبائی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، تمہاری تجویز مناسب ہے۔“

نانبائی نے روٹیاں تیار کیں اور بچی ہوئی نہاری میں سے کئی آدمیوں کے لیے نہاری نکالی اور دونوں چیزیں لے کر خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

آپ نے خادم سے پوچھا۔ ”کیا کھانے کا سامان مل گیا؟“

خادم نے جواب دیا۔ ”جی پیرومرشد مل گیا مگر کھانے کے ساتھ ہی نانبائی بھی آگیا، وہ اس کے معاوضے میں معلوم نہیں کیا لینا چاہتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس کو بٹھاؤ، ابھی اس کی بھی سن لوں گا۔“

نانبائی نے عرض کیا۔ ”جناب! میں اس شرط پر کھانے کا سامان لے کر آیا ہوں کہ آپ اس کا وہ معاوضہ ادا کریں گے جس کا میں مطالبہ کروں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے یہ وعدہ کیا تھا اور اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔“

نانبائی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آگئی۔ پوچھا۔ ”کیا سچ؟ میں جو معاوضہ مانگوں گا ملے گا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا۔“

نانبائی نے روٹیاں اور نہاری آپ کے حوالے کردی اور سرشار لہجے میں بولا۔ ”بجا! میں آپ سے ایک ایسی چیز مانگوں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی اور پھر میں دیکھوں گا کہ خواجہ باقی باللہ اور ایک نانبائی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔“

خواجہ باقی باللہ نے اپنے مہمانوں کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ ان سب نے اس لذیذ کھانے کو بڑے شوق سے کھایا۔ نانبائی ایک طرف بیٹھ گیا اور مہمانوں کی فراغت کا منتظر رہا۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ نے نانبائی کو اپنے پاس بلوایا اور پوچھا۔ ”ہاں تو بتا کہ تجھ کو کھانے کے معاوضہ میں کیا دے دیا جائے؟“

نانبائی نے عرض کیا۔ ”کیا اجازت ہے کہ میں جو چاہوں مانگ لوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بات کو طول نہ دے، جو کچھ مانگنا ہے مانگ، میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔“

نانبائی آپ کی شکل دیکھنے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد بولا۔ ”آپ مجھ کو بھی اپنے جیسا بنا دیجیے۔“

آپ پریشان ہوگئے اور نانبائی سے کہا۔ ”بھائی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو اس کے علاوہ کچھ مانگ لے۔“

نانبائی نے شکایتاً کہا۔ ”واہ جناب! میں نے جو مانگ لیا، مانگ لیا۔ میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے جو کچھ بھی تجھے دینے کا وعدہ کیا تھا، اس پر اب بھی قائم ہوں اور قائم رہوں گا لیکن میری خواہش ہے کہ تو اس کے علاوہ کچھ مانگ لے۔“

نانبائی نے عرض کیا۔ ”میں کچھ اور کیوں مانگ لوں، آخر اس میں کیا مضائقہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس میں مضائقہ یہ ہے کہ جو کچھ تو مانگ رہا ہے وہ حیثیت سے زیادہ ہے۔ جس برتن میں جتنی سمائی ہوتی ہے اگر اس میں اس سے زیادہ بھر دیا جائے تو اس کے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ یا تو زیادہ شے چھلک کر بہہ جائے گی یا برتن ہی ٹوٹ جائے گا۔“

نانبائی نے کہا۔ ”جناب آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں جو کچھ مانگ رہا ہوں، مجھ کو وہی ملنا چاہیے ورنہ جانے دیجیے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے، میں صبر کرلوں گا۔“

آپ نے سکوت اختیار کیا۔ کچھ دیر بعد فرمایا۔ ”افسوس کہ میں تیرا دشمن نہیں ہوں لیکن تو بضد ہے تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا

کروں گا۔"

نانبائی بے حد خوش تھا، بولا۔ "مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

خواجہ باقی باللہ حجرے میں جاتے ہوئے بولے۔ "میرے پیچھے پیچھے آجا۔"

نانبائی ان کے پیچھے پیچھے حجرے میں داخل ہوگیا۔ خادم اور مہمان دونوں کی تکرار اور بحث مباحثے کو بڑے غور سے سنتے رہے تھے، اب وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ دیکھیے ہوتا کیا ہے؟

کچھ دیر بعد حجرے کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے دو خواجہ باقی باللہ نمودار ہوئے، شکل صورت، لباس، وضع قطع کسی بات میں سرمو فرق نہ تھا۔ ہاں بس چلنے میں فرق تھا۔ انداز میں فرق تھا۔ ایک تو ہوشیار تھا دوسرا مدہوش اور بے خود تھا۔ وہ پاؤں کہیں رکھتا مگر پڑتا کہیں تھا۔ دوسروں نے انہیں اس طرح پہچانا کہ جو ہوشیار تھا وہ خواجہ باقی باللہ تھے اور جو مدہوش اور بے خود تھا وہ نانبائی تھا۔

نانبائی باہر آتے ہی ڈھیر ہوگیا۔ خواجہ باقی باللہ نے اس کے سرہانے کھڑے ہوکر فرمایا۔ "اے شخص! کیا میں نے تجھ کو آگاہ نہیں کردیا تھا کہ برتن میں اس کی سمائی سے زیادہ بھر دیا جائے وہ چھلک جاتا ہے یا برتن ٹوٹ جاتا ہے چنانچہ تو چھلک بھی رہا ہے اور ٹوٹ جانے کا بھی احتمال ہے۔"

مہمانوں نے کہا۔ "خواجہ! اس کے لیے کچھ کیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اب میں کیا کرسکتا ہوں جو کچھ ہونا تھا ہوچکا، اللہ اس پر رحم کرے۔"

نانبائی کی حالت سکر و بے ہوشی تین دن قائم رہی۔ اس عجیب و غریب واقعے کی اتنی شہرت ہوئی کہ دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ تین دن بعد نانبائی چل بسا، برتن ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

آپ نے دو شادیاں کیں، دونوں سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ آپ نے بڑے لڑکے کا نام خواجہ عبیداللہ رکھا جو بعد میں خواجہ کلاں کہلائے، دوسرے کا نام خواجہ عبداللہ رکھا جو خواجہ خورد کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ اگر دل کو اطمینان، یکسوئی اور حضور قلب سے ہمکنار کرنا ہے تو بقدر ضرورت پاکیزہ اور حلال کھانا چاہیے، فضول اور بیہودہ بات چیت سے بچا جائے اور دنیا کے طالبوں سے دوری اختیار کی جائے۔

کسی نے پوچھا۔ "اگر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ ذکر میں گزار دوں تو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تو ہزار سال ذکر کرتا رہے مگر تیرا کھانا حلال مال کا نہ ہو تو یاد رکھ تیرا روحانی مقصد کبھی بھی حاصل نہ ہوگا۔"

طبیعت میں سادگی اتنی تھی کہ کتنا ہی ناپسندیدہ کھانا مسلسل کھلایا جاتا آپ کو کھانے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا اور کھاتے رہتے۔ یہی حال لباس کا تھا۔ جیسا مل جاتا پہن لیتے۔ لیکن بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔

ایک دن آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کو جمع کرکے فرمایا۔ "لوگو عجیب بات ہے کہ میں نے مراقبے میں دیکھا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا کوئی نامی گرامی شخص رحلت کرگیا ہے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "کیا مراقبے میں آپ نے اس بزرگ کی صورت دیکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اس کی صورت بھی دیکھی ہے لیکن اس کو پہچان نہیں سکا۔"

سنیچر کے دن 25 جمادی الآخری 1012ھ کو عصر کے بعد قلعہ فیروز شاہ میں آپ... بلند آواز میں اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہوگئے۔ اور دو تین گھڑی کے بعد آپ اسی عالم میں عالم قدس چلے گئے۔ آپ کا مزار قبرستان قدم شریف میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اب یہ جگہ درگاہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے وفات سے پہلے ہی یہ وصیت کردی تھی کہ آپ کے مزار پر چھت، گنبد یا قبر نہ تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔

آپ کی تاریخ وفات۔ "بحر معرفت بود" 1012ھ اور "نقشبند وقت" 1012ھ سے نکلتی ہے۔

ماخذات

سفینۃ الاولیاء شہزادہ داراشکوہ، طبقات الکبریٰ علامہ شعرانی، تذکرۃ الاولیاء شیخ فرید الدین عطار، انوار اولیاء رئیس احمد جعفری، خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری

عارفِ حق

ضیا تسنیم بلگرامی

حق پر اڑنے اور لڑنے کے لیے انسان کو جن مصمم ارادوں اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں... اور جنہیں یہ دولت مل جائے وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں... آپ کا تعلق بھی انہی محبوب انسانوں میں سے تھا جنہیں عبادت وریاضت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہوجاتا ہے۔

اللہ کے ایک نیک بندے کے سچے قول و فعل اور کھری میزان کا قصہ



تھا۔ چنگیز خاں مر چکا تھا مگر اس کے بیٹے تولی خاں کا بیٹا ہلاکو خاں قتل و خون ریزی میں اس کی نیابت کر رہا تھا۔ وہ تیاں شاں سے بلخ کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ راستے میں ہلاکو خاں کے خونخوار دستے آگ و خون کا کھیل کھیلتے سروں کے مینار کھڑے کرتے ہوئے فتح مندی کے نشے سے بدمست ہو رہے تھے۔ بلخ کے صلح پسندوں نے ترک مکانی کیا نامور فاروقی خاندان نے بھی سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا۔ برصغیر میں یہ عہد خلجی تھا۔ علاؤالدین خلجی کا زمانہ، بادشاہ کو ان مہاجروں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند دن مہمان رکھ کر اودھ میں ردولی کی جاگیر عطا کر دی۔

یہ خاندان ردولی میں بس گیا۔ فکر معاش سے آزادی اور منگولوں کی دستبرد سے دوری نے انہیں علمی میدانوں میں گامزن کر دیا۔ زہد و تقویٰ میں بھی ان کا کوئی شریک نہ تھا۔ نالۂ نیم شبی اور گریۂ سحر گاہی کی تپش نے انہیں کندن کر دیا تھا۔ اس خاندان کا ایک سات سالہ لڑکا احمد اس وقت اپنی ماں کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا جب انہوں نے اس کو نصف شب کے بعد اپنے پیچھے تہجد کی نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ احمد اپنے ماحول سے بے نیاز، دنیا سے غافل انتہائی انہماک سے تہجد کی نماز اس طرح ادا کرتا کہ اس طرح کوئی بڑا بھی نہ پڑھتا ہوگا۔ ماں اپنے بیٹے کو کئی ہفتے اس حال میں خاموشی سے دیکھتی رہی۔ احمد پوری رات مصروف عبادت رہتا اور صبح فجر کی نماز پڑھ کر تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو جاتا۔ عبادت گزار ماں کا دل اپنے بیٹے کی عبادت گزاری سے، بہت خوش تھا مگر اس خوشی میں یہ تشویش بھی موجود تھی کہ اس نوعمری میں اس کو اتنی شدید ریاضت نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیٹے احمد کو سمجھائیں اور شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑی۔ اس کم ہمتی میں خدا کا خوف بھی شامل تھا اور اپنے بیٹے کی نظر میں شرمندہ ہو جانے کا تکلیف دہ احساس بھی۔

ایک دن بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا احمد آج کی رات آرام کرے گا لیکن بیٹے کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے عشا کی نماز بھی پڑھی اور پھر تہجد کے لیے بھی کھڑا ہو گیا۔ ماں کو خود بھی تہجد پڑھنا تھی اس نے چار رکعتوں کے بعد اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹول کر بخار کی حدت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پورا جسم بخار کی گرمی سے تپ رہا تھا۔ وہ بیٹے کے داہنی طرف بیٹھ کر سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد احمد نے جیسے ہی سلام پھیرا۔ ماں نے کرب سے کہا۔ ”بیٹے احمد! تو تو بخار میں تپ رہا ہے۔“

احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ہاں ماں، آج شام ہی سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! میں ڈرتی ہوں، کہیں تجھے چکر نہ آ جائے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں، اب اتنا تیز بخار بھی نہیں کہ مجھے چکر آ جائے۔“

ماں نے اصرار کیا۔ ”بیٹے احمد! اگر تو میری بات مانے تو میں تجھے یہی مشورہ دوں گی کہ تو آج کی رات آرام کر لے۔“

لیکن احمد نے ناگواری سے پوچھا۔ ”ماں! اگر میں آرام کر لوں گا تو اس سے مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ صبح ہوتے ہوئے تیری طبیعت سنبھل جائے گی اور بخار اتر جائے گا۔“

احمد نے کہا۔ ”ماں! اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مجھ کو شب بیداری میں کیا مزہ ملتا ہے۔ ماں! اس میں ایک نشہ ہے، سوز ہے، لذت ہے ناقابل بیان لذت۔ اگر میں اس لذت سے محروم کر دیا جاؤں تو بیمار پڑ جاؤں گا۔ یہی وہ لذت ہے جو مجھے ہر شب بیدار رکھتی ہے۔ گر مجھ سے یہ لذت چھین لی جائے تو میں کچھ بھی نہیں رہوں گا۔ میں خالی اور محروم رہ جاؤں گا ماں۔“

ماں نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔ ”بیٹے احمد! میں اس لذت اور سوز سے واقف ہوں جس کا تو ذکر کر رہا ہے لیکن میرے لال ابھی تو سات سال کا ہے۔ ابھی تو تجھ پر نماز بھی فرض نہیں نہ کہ تہجد کی نماز۔ اتنی کم سنی میں اتنی شدید محنت، بخدا میرا دل کانپتا رہتا ہے، میں اندر ہی اندر لرزتی رہتی ہوں خدا کے لیے اپنے آپ پر اور مجھ پر رحم کر۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں میری بھی یہی دعا ہے کہ خدا آپ پر رحم فرمائے اور مجھ پر بھی۔ رہی یہ بات کہ ابھی میں سات سال کا ہوں اور ابھی مجھ پر نماز کی ادائیگی فرض نہیں ہے تو میری فکر مجھے کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں ماں کہ انسان جب عدم سے وجود میں آتا ہے اور نیست سے ہست میں قدم رکھتا ہے تو اس پر اپنے رب کی بندگی فرض ہو جاتی ہے۔“

ماں اپنے سات سالہ بچے کی زبان سے حکمت و معرفت کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بچے کو اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ اچھی طرح یاد ہے، الست بربکم۔“

یہ کہتے کہتے وہ سجدے میں گر گئیں اور بڑی دیر تک رو رو کر اپنی نادانی اور سہو کی اپنے رب سے معافی مانگتی رہیں۔ وہ

گڑگڑا کر اپنے رب سے کہہ رہی تھیں۔"خدایا! میں نادان ہوں، مجھ کو اپنے بیٹے کے مرتبے کا علم نہیں تھا۔ یہ میری کتنی بڑی چوک تھی کہ میں اس کو تیرے ذکر سے محروم کر دینا چاہتی تھی۔ میں اسے تیری بندگی سے روکنے کی غلطی کر رہی تھی۔ مجھے معاف کر دے اور میرے بیٹے کے دل سے اس کدورت کو دور کر دے جو اس وقت کی باتوں سے پیدا ہو گئی ہو گی۔"

بیٹا ماں کی گریہ وزاری سن رہا تھا۔ جب ماں نے سجدے سے اپنا سر اٹھایا تو اس نے عاجزی سے عرض کیا۔"ماں! آپ اتنی غمزدہ کیوں ہیں، میں اور میرا خدا دونوں ہی آپ کے اس جذبے سے واقف ہیں جو ممتا کا جذبہ کہلاتا ہے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا اپنی ممتا کے زیرِ اثر فرمایا۔ اگر میرے اور آپ کے درمیان رب کی ذات نہ ہوتی تو میرے لیے آپ کا حکم ماننا ہی عبادت قرار پاتا۔"

ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور فرطِ جذبات سے رونے لگیں، احمد کا دل بھی بھر آیا۔ وہ بھی رونے لگا۔ روتے روتے دونوں ہی ہلکان ہو گئے اور دل کو دبانے والے بوجھ نے آنسوؤں کی شکل میں بہہ کر انہیں ہلکا کر دیا۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد پھر ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی۔ ماں ایک بار پھر بیٹے کی صحت کی طرف سے فکرمند ہو گئیں۔ احمد کی عبادت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو تہجد، دن کو ذکرِ الٰہی۔ آرام کا کوئی وقت ہی نہ تھا۔ ماں کو ہر وقت یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس محنتِ شاقہ کا ان کے بیٹے احمد کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ ان دونوں میں اس موضوع پر کئی بار گفتگو بھی ہوئی، دونوں ہی دلیلوں اور نظیروں سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور تقریباً ہر بار بیٹے کی پُراثر باتوں نے ماں کو لاجواب اور جذباتی کر دیا۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر تھا لیکن وہ بھی بھی بیٹے کی دلیلوں سے اپنی وہ فکر دور نہیں کر سکیں جو انہیں اپنے بیٹے کی صحت کی طرف سے مستقلاً لاحق ہو چکی تھی۔

ماں نے اپنے شوہر کو بھی اس معاملے میں شریک کر لینا چاہا اور زور دے کر مجبور کیا کہ وہ احمد پر دباؤ ڈال کر شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

لیکن سلجھے ہوئے باپ نے ہر بار یہی کہا کہ"بیوی! میں بندے اور اس کے رب کے تعلقات میں کیونکر دخل دے سکتا ہوں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کو کرنے دو۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے اور میرا تو خیال ہے کہ احمد مادر زاد ولی ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے کوئی غیر معمولی طاقت اس سے یہ کراتی ہے۔"

بیوی نے کہا۔"آپ میرے دل میں جھانک کر دیکھ لیں میں اپنے بیٹے کو شب و روز بیدار نہیں دیکھ سکتی۔ خدانخواستہ اس کو کچھ ہو گیا تو؟"

شوہر نے جواب دیا۔"بیوی! اس کو کچھ نہیں ہو گا، خدا اس کا محافظ ہے۔ یاد رکھو، خدا کسی بھی شخص سے اس کی استطاعت اور صلاحیت سے زیادہ کام نہیں لیتا۔ احمد جو کچھ کر رہا ہے خدا نے اس میں اتنی صلاحیت اور استطاعت رکھ دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ راتوں کو اپنے گرم گرم بستر میں دبکا آرام کر رہا ہوتا۔"

لیکن ماں کو قرار نہیں آیا اور وہ سیدھی بیٹے کے پاس پہنچ گئیں بولیں۔"بیٹے احمد! افسوس کہ میں ایک بار پھر وہی فرسودہ موضوع لے کر آ گئی ہوں۔"

بیٹے نے لاتعلق نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے یا اللہ یا اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ ماں کچھ دیر خاموش کھڑی بیٹے کی کیفیت ملاحظہ کرتی رہی۔ آخر کچھ دیر بعد کہا۔"بیٹے احمد! میں نے کیا کہا؟ میں کچھ کہہ رہی ہوں، کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

بیٹے نے نفی میں سر ہلا دیا۔"مجھے کچھ پتا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

ماں نے جواب دیا۔"میرے لال! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تو اس کم سنی میں اتنی زیادہ عبادت نہ کر، ورنہ تیری صحت جواب دے جائے گی عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"

بیٹے نے کہا۔"خوب خوب! کیا فرمایا آپ نے عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں میں نے یہی بات کہی ہے کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"

بیٹے نے مسکرا کر عرض کیا۔"ماں زندگی کا کوئی بھروسا نہیں پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے، اگر آپ کسی طرح مجھ کو لمبی عمر کا یقین دلا دیں اور یہ ثابت کر دیں کہ میں طویل عرصے تک زندہ رہوں گا تو میں شب بیداری ختم کیے دیتا ہوں۔"

ماں نے جواب دیا۔ ”یہ یقین تو کوئی ولی بھی نہیں دلا سکتا۔ پھر میں کس طرح دلاؤں۔“

”تب پھر آپ خاموش رہیے ماں! مجھ کو عبادت سے نہ روکیے اگر میں نے ایسا کیا تو میں یادِ حق سے بہت دور ہو جاؤں گا اور اگر ایسا ہوا ماں تو آپ یقین کیجیے کہ میں بھی شاید یہ ہمت بھی نہ کر سکوں کہ اپنی شب بیداری سے باز آ جاؤں۔ کیا میں نے شب بیداری کی لذتوں سے آپ کو آگاہ نہیں کیا؟ کیا آپ میری وہ بات چیت بھلا چکی ہیں؟ شاید نہیں، اگر میں آپ کی سیدھی سچی بات مان بھی لوں تو اس سے آپ کے حصول صحت کے علاوہ اور کیا فائدہ پہنچے گا۔“

بیٹے نے لاجواب کر دیا تو ماں نے ایسا سکوت اختیار کیا کہ پھر زندگی بھر اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔

دہلی میں احمد کے بڑے بھائی شیخ تقی الدین مستقل رہ رہے تھے، ان کی علمی قابلیت کا بڑا شہرہ تھا گھر میں شیخ تقی الدین کا بڑا ذکر رہتا۔ ماں اکثر کہتی رہتیں کہ اگر میرا بیٹا تقی الدین کے گھر میں ہوتا تو احمد کو شاندار تعلیم دلواتی۔ شیخ احمد ان کی باتیں بغور سنتے اور اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے سراپا شوق بن جاتے لیکن یہ شوق پرواز سے محروم ہی رہتا۔ چھوٹے سے دل و دماغ میں شوق اور ولولے کی لہریں اٹھتی بیٹھتی رہتی تھیں لیکن ان لہروں نے طوفان کی شکل ایک عرصے تک نہیں اختیار کی۔ ان کے دل و دماغ مختلف طور پر ایسی تجاویز اور تدابیر پر غور کرتے رہتے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ بھائی تقی الدین سے ملاقات کس طرح کی جائے۔

شب و روز کی عبادت میں سوز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ شیخ احمد سوچتے رہتے کہ آخر میں اپنی عبادت اور ریاضت میں کس کی راہنمائی اختیار کروں۔ جب ماں کو اس الجھن کا پتا چلا تو وہ شیخ احمد کے پاس جا بیٹھیں اور پوچھا۔ ”بیٹے! کیا بات ہے آج کل تو پریشان کیوں رہتا ہے؟ کسی سے کوئی جھگڑا یا کوئی رنجش؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں ایسی کوئی بات نہیں؟“

ماں نے پوچھا۔ ”پھر تو فکرمند اور اداس اداس کیوں رہتا ہے؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”ماں! بات یہ ہے کہ میں عبادت ریاضت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہوں کہ طمانیت قلب حاصل کروں لیکن روح کی تشنگی دور ہی نہیں ہوتی، پیاس بجھتی ہی نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس کرتا رہتا ہوں، آخر ایسا کیوں ہے؟“

ماں نے کہا۔ ”احمد! ابھی تیری عمر ہی کتنی ہے، کل بارہ سال۔ اس عمر میں تو نے جو کچھ بھی حاصل کر لیا ہے، بہت ہے رہا تشنگی کا مسئلہ تو یہ ہمیشہ باقی رہے گی۔“

لیکن بیٹے کو ماں کی باتیں مطمئن نہ کر سکیں، اضطراب اور اضطرار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انہوں نے ماں سے پوچھا۔ ”ماں! دہلی میں بھائی تقی الدین کیا کر رہے ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! تقی الدین ایک عالم فاضل انسان ہیں، معلوم نہیں کہاں کہاں سے طالبانِ علم اس کے پاس پہنچ کر تحصیلِ علم کرتے ہیں۔ اس کی علمیت مسلمہ ہے، شک و شبہے سے بالاتر۔“

شیخ احمد نے کہا۔ ”پھر تو ماں میں دہلی جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ بھائی تقی الدین میری تشنگی دور کر دیں گے۔“

ماں نے تشویش ظاہر کی۔ ”لیکن بیٹے ایک بارہ سالہ لڑکا اتنا لمبا سفر کیونکر کرے گا۔ میرا تو یہ سوچ کر ہی دل بیٹھا جاتا ہے کہ تو تنہا یہ سفر کس طرح کرے گا؟“

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ”ماں! میں سفر کے لیے آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔ تلاشِ فضل اور طلبِ علم میں اس فاصلے کی اہمیت ہی کیا ہے، مجھ سے پہلے تو ایک ملک سے دوسرے ملک تک کے سفر کیے گئے ہیں۔“

ماں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی آخر کچھ دیر بعد ہتھیار ڈال دیے، اور دہلی جانے کی اجازت دے دی۔

شیخ احمد ایک قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہ قافلہ مغربی حصوں میں جا رہا تھا۔ شب و روز کی صعوبتیں جھیلتے، مصیبتیں اٹھاتے آپ دہلی میں داخل ہو گئے۔ تلاش کرتے ہوئے اپنے بھائی شیخ تقی الدین کے پاس پہنچ گئے۔ شیخ احمد اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ ان کے بھائی کا دہلی میں بڑا شہرہ تھا اور ہر شخص ان کا نام عزت و احترام سے لیتا تھا۔ بڑے بھائی نے ایک بارہ سالہ اجنبی لڑکے کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو یہ گمان گزرا کہ یہ بھی کوئی طالب علم ہے جو ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے آیا ہے۔ شیخ احمد نے بھی اپنے بھائی کی یہ کیفیت محسوس کر لی کہ وہ انہیں پہچان نہیں سکے، انہوں نے سکوت اور تامل اختیار کیا۔

شیخ تقی الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ”صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''حضرت! میرے پاس آپ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں آپ کی خدمت میں کیوں آیا ہوں؟''

تقی الدین نے اس عجیب و غریب لڑکے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ بولے۔ ''آدمی تو اچھے لگتے ہو۔ اچھا اگر تم یہ نہیں بتانا چاہتے کہ کہاں سے آئے ہو تو کوئی حرج نہیں، میرے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ تم مجھ سے تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔''

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ''جناب! میں پانچ چھ سال سے ایک اندرونی کرب میں مبتلا ہوں، اگر آپ اس کو دور فرما دیں تو میں آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا۔''

بڑے بھائی نے پوچھا۔ ''تمہارا قیام کہاں ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہاں میں ایک لاوارث ہوں، مجھ کو تو رہنے کے لیے ٹھکانا بھی درکار ہے، میں اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔''

تقی الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے تم کو اپنے رہنے کا انتظام خود ہی کرنا چاہیے۔ میرے پاس اتنی گنجائش کہاں کہ طلبہ کی اقامت کا انتظام بھی کروں۔''

شیخ احمد نے معصومیت سے کہا۔ ''نہ صرف یہ کہ آپ مجھے پڑھائیں گے اور اقامت کا انتظام بھی کریں گے بلکہ کھانے پینے کی ذمے داری بھی قبول کرنا ہوگی۔''

تقی الدین نے ایسا عجیب طالب علم پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ذرا تلخی سے کہا۔ ''میاں صاحبزادے یہ تو بتاؤ تمہارے ماں باپ کیسے ہیں جو انہوں نے تم کو تنہا دہلی چلا آنے دیا۔ آخر تم کسی خوشحال گھرانے ہی سے تعلق رکھتے ہو گے ورنہ غریب انسان تو یہاں تک آنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''جنابِ والا! آپ مجھ سے بحث تو کیجیے نہیں بس یہ بتا دیجیے کہ آپ مجھ کو میری عائد کردہ شرطوں پر پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟''

تقی الدین نے تھکے ہارے لہجے میں کہا۔ ''میں انکار نہیں کر سکتا۔ اگر تو نادار ہے تو میں تیرے قیام و طعام کی ذمے داری بھی اپنے ہی سر لے لوں گا۔ تو میرے پاس ہی رہ جا۔''

شیخ احمد نے خوش ہو کر عرض کیا۔ ''بھائی صاحب! مجھ کو آپ سے یہی امید تھی۔ ماں نے آپ کو بہت بہت پوچھا ہے اور یہ معلوم کیا ہے کہ آپ ردولی کب تشریف لا رہے ہیں؟ وہ آپ کو یاد کر کے اداس ہو جاتی ہیں۔''

تقی الدین نے شیخ احمد کے چہرے پر اپنے باپ کا عکس دیکھ لیا۔ بے اختیار اٹھے اور بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ بولے۔ ''احمد! تو نے کمال کر دیا، کیا تجسس پیدا کیا۔ واہ واہ خوب!''

شیخ احمد نے حرفِ مدعا گوش گزار کیا۔ ''بھائی صاحب! میں ایک عرصے سے مضطرب اور پریشان ہوں کہ میں اپنی روح کی پیاس کس طرح بجھاؤں۔ اپنی تشنگی کس طرح دور کروں؟''

بھائی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت تیری رہائش کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ اور کروں گا۔'' شیخ احمد وہیں بیٹھ گئے اور تقی الدین ان کے قیام اور طعام کا انتظام کرنے چلے گئے۔ رات ہو گئی تو شیخ احمد کو تشویش ہوئی کہ یہ بھائی کہاں چلے گئے؟ آخر وہ نصف شب کو واپس آئے تو بہت خوش خوش، بولے۔ ''احمد! افسوس کہ میں اپنے مدرسے میں تجھ کو نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ایک دوسری جگہ کا انتظام کر لیا ہے۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے۔ میں کہیں کسی گوشے میں پڑا رہتا۔''

بھائی نے کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی عزت و احترام سے رہے گا۔ تو خرچ اور مصارف کی تو بات ہی نہ کر اس کو مجھ پر چھوڑ دے۔''

احمد نے پوچھا۔ ''بھائی صاحب! پھر مجھے کون سا وقت مرحمت فرمائیں گے؟''

بھائی نے جواب دیا۔ ''ہر وقت، کسی بھی وقت تجھ کو تو میں اپنے بھائی کی حیثیت سے تعلیم دوں گا۔''

احمد کو بڑے بھائی کے پاس قیام و طعام کی سہولتیں مل گئیں اور جب انہیں پہلے دن بڑے بھائی نے پڑھانا شروع کیا تو شیخ احمد نے ان سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔

تقی الدین نے کہا۔ ''احمد! تو مجھ سے پڑھنے آیا ہے یا سوالات کرنے؟''

احمد نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! علم وہی نہیں ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے بلکہ میں جو علم حاصل کرنا چاہتا ہوں شاید وہ اس درس گاہ سے نہیں ملے گا۔''

بڑے بھائی نے کہا۔ ''میاں صاحبزادے! مجھ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ میری تدریس میں کوئی مخل ہو، مجھ کو اپنی مرضی کا نصاب پڑھانے سے روکا جائے۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''اور بھائی صاحب! مجھ کو بھی یہ قطعاً ناپسند ہے کہ کوئی معلم میرے اندر کی بے چینی نہ دور کر سکے، روح کی تشنگی نہ بجھا سکے۔ میں یہاں علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے نہیں آیا۔ میں اپنی روح کو تسکین اور آسودگی دینا چاہتا ہوں۔''

تقی الدین نے افسوس سے کہا۔ ''احمد! افسوس کہ میں ظاہری علوم تو پڑھا سکتا ہوں علوم باطنی میں، میں تقریباً کورا ہوں۔''

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ''پھر مجھے بھی افسوس ہے کہ میں یہاں علومِ ظاہری حاصل کرنے نہیں آیا۔ میری بیماری علومِ باطنی سے دور ہوگی۔ میرے لیے آپ کا مدرسہ کارآمد نہیں۔''

تقی الدین نے پوچھا۔ ''پھر کیا ارادے ہیں؟''

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ''میں کسی مرشد کامل کی تلاش میں ہوں اور میں اس کی جستجو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔ بھائی صاحب بس، ایک رات۔ اس سے زیادہ نہیں۔ میں آپ کے سرمعیت نہیں بننا چاہتا۔''

بھائی کی محبت انہیں روکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کہا۔ ''احمد! تم یہیں میرے پاس ہی رہو۔ اگر تمہیں کسی مرشدِ کامل کی تلاش ہے تو میں خود بھی تمہارا ساتھ دوں گا اور اس کو تلاش کر کے دم لوں گا۔''

''بھائی صاحب!'' چھوٹے بھائی نے کہا۔ ''صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں جو آگ میرے سینے میں روشن ہے آپ اس سے محروم ہیں اور جب آپ کے دل میں مرشدِ کامل کے لیے تڑپ ہی نہیں تو اس کو تلاش کہاں اور کس طرح کریں گے؟''

بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ''پھر بھی تو رات بھر اس سلسلے میں غور کر میرا خیال ہے تجھ کو میرے پاس سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔ کسی ٹھکانے کو مرکزی حیثیت دینا ہی پڑے گی کیونکہ بے گھر و بے در انسان منزلِ مقصود نہیں پا سکتا۔''

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ''اپنی اپنی سوچ، اپنی اپنی فکر کی بات ہے کیونکہ مرشدِ کامل کی تلاش میں جب تک آدمی بے گھر اور بے در نہیں ہوگا اپنی منزل نہیں پا سکتا۔''

بڑے بھائی نے رعب سے کہا۔ ''میں کہتا ہوں سوچنے میں حرج ہی کیا ہے؟ بے سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا کسی طور مناسب نہیں۔''

شیخ احمد خاموش ہو گئے جس کا بڑے بھائی نے یہ مطلب لیا کہ شاید ان کی بات مان لی گئی ہے۔

شیخ احمد بستر پر گئے تو ان کے ذہن میں مرشد کامل کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے رہے معلوم نہیں کب تک جاگتے رہے۔ اس کیفیت میں انہیں نیند آگئی۔ سوتے میں انہیں کسی کی آواز سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ''میاں صاحبزادے! آپ کی منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ پانی پت جائیے اور قطب ربانی سے بیعت ہو جائیے۔''

شیخ احمد نے سراپا شوق بن کر سوال کیا۔ ''ان قطب ربانی کا نام؟ میں پانی پت میں انہیں کہاں تلاش کروں گا؟''

جواب ملا۔ ''آپ پانی پت جائیں تو سہی۔ اللہ نے چاہا تو ان تک پہنچ کر ہی قدم رکیں گے۔''

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی اور دیر تک اس خواب پر غور کرتے رہے، کبھی فیصلہ کرتے کہ پانی پت فوراً ہی چلے جانا چاہیے اور کبھی تساہل سے سوچتے کہ کہیں یہ وسوسۂ شیطانی تو نہیں جو ہر جویائے حق کی راہ روکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن صبح ہوتے ہوتے شیخ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں بہر حال پانی پت پہنچنا ہے۔

وہ علی الصباح اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ بڑے بھائی کو پتہ نہ چلا کہ شیخ احمد کہاں چلے گئے۔

دوسری طرف قطب ربانی شیخ جلال الدین کبیرالاولیا کشفِ باطن سے اس مادرزاد ولی کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے۔ انہیں شیخ احمد کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اس لیے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ''لوگو! ہمارے پاس ایک مہمانِ خاص آ رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔''

مریدوں نے جواب دیا۔ ''حضرت! ہم سب ہر طرح حاضر ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، بجا لائیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سامنے کھلی جگہ میں چولہے روشن کیے جائیں اور ان پر دیگیں چڑھا دی جائیں لطیف و لذیذ کھانے پکوائے جائیں۔''

ایک مرید نے بصد ادب عرض کیا۔ ''حضرت! یہ سب ابھی ہوا جاتا ہے مزید اور کچھ؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اور دوسرے مریدوں سے کہہ دو کہ خانقاہ کے در پر حسین اور خوبصورت گھوڑے ساز و سامان سے لیس کر کے کھڑے کر دیے جائیں۔''

ایک مرید نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ''حضرت! یہ انتظام بھی ہو جائے گا بس حضور کے ارشاد کے مطابق میں پندرہ بیس ہاتھی کھڑے کر دوں گا۔ اسی تعداد میں گھوڑے بھی کھڑے کر دیے جائیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کھڑے کر دیے جائیں نہیں، جو کچھ ہونا ہے فوراً ہی ہونا ہے اس لیے ان پر فوراً عمل درآمد ہوگا۔''

مرید ادھر ادھر پھیل گئے۔ کسی نے چولہے جلائے۔ کسی نے دیگوں میں مال ڈالا اور کسی نے ہاتھی گھوڑے اپنے قبضے میں کیے اور انہیں خانقاہ کے دروازے پر سجا کر کھڑا کر دیا۔ جب قطب ربانی کو اس کا علم ہوا کہ ہاتھی اور گھوڑے در پر کھڑے کر دیے گئے ہیں تو آپ ان کے معائنے کو نکل کھڑے ہوئے اور خانقاہ کے در پر شاندار منظر دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور مریدوں سے فرمایا۔ ''لوگو! میرا ایک بارہ تیرہ سال کا مہمان آ رہا ہے اس طرح میں اس کو مرعوب کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ چند باتوں کا تمہیں بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

مریدوں نے بیک آواز سوال کیا۔ ''کن باتوں کا حضرت، ارشاد!''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آنے والے مہمان کی تلخ نوائی اور صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے اگر میرا مرید کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو تم لوگ اس کا کوئی خیال نہ کرو گے۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت، یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم آپ کے مہمان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کریں گے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

آپ اندر جاتے ہوئے بولے۔ ''اچھا میں اندر جا رہا ہوں، میرا مہمان بس آیا ہی چاہتا ہے، تم لوگ اس کو سنبھالنا۔''

مرید خاموش ہو گئے اور آپ اندر تشریف لے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد شیخ احمد خانقاہ کے در پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت ساری دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے لذیذ کھانوں کی نکلنے والی خوشبو سے گرد و پیش کی فضا مہک رہی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے سامنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں دیکھیں، یہ دونوں مویشی نہایت شان سے کھڑے گویا کسی کے منتظر تھے۔ شیخ احمد کو ذرا سی دیر کے لیے یہ شبہ گزرا کہ یہ مکان قطب ربانی کا ہی ہے یا کسی امیر کبیر شخص کا۔ وہ انہی وسوسوں میں مبتلا تھے کہ ایک مرید نے چند قدم چل کر کسی مرید سے پوچھا۔ ''بھائی! پیر و مرشد اندر تشریف رکھتے ہیں کیا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''تو کیسا مہمل سوال کر رہا ہے۔''

دوسرے مرید نے کہا۔ ''مہمل سوال؟ کیا کہا تم نے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''آج کل بھی اگر......''

آپ چند قدم آگے بڑھے اور دونوں سے سوال کیا۔ ''حضرات! میں ایک پردیسی انسان ہوں، یہاں کے ماحول اور لوگوں سے قطعاً ناواقف ہوں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس امیر کا محل ہے؟''

ایک مرید نے ادھر ادھر دیکھ کر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''میاں صاحبزادے، آپ کس محل کی بات کر رہے ہیں؟ کون سا محل؟ یہاں تو کوئی محل نہیں ہے۔''

شیخ احمد نے خانقاہ اور اس کے در پر موجود شان و شکوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس محل اور اس کے ساز و سامان کی بابت پوچھ رہا ہوں۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! یہ محل نہیں ایک خانقاہ ہے حضرت جلال الدین کبیر الاولیا کی خانقاہ۔''

آپ نے طنزاً فرمایا۔ ''تو یہ خانقاہ ہے۔ خوب، میں تو اس کو محل سمجھ بیٹھا تھا۔ کیا خانقاہیں ایسی ہوتی ہیں؟ درویش کی خانقاہ لیکن ٹھاٹ باٹ شاہانہ محل جیسے فقیر کی کٹیا جس پر شاہی قصر کا گمان ہوتا ہے۔''

مرید نے کہا۔ ''صاحبزادے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

آپ نے جوش میں فرمایا۔ ''میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اندر میرا ضمیر اس محل کو کٹیا کہنے پر آمادہ ہی نہیں۔''

مرید نے انہیں ایک بار پھر سمجھایا۔ ”صاحبزادے! یہ قطب ربانی کی خانقاہ ہے، آپ یہاں سے واپس جا کر پچھتایئے گا۔“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”میں سکونِ قلب کی تلاش میں ہوں، میں طمانیت کی جستجو میں ہوں اور جہاں یہ ساز و سامان موجود ہو، وہاں سکون اور طمانیت کا کیا کام؟“
مرید نے بے بسی سے عرض کیا۔ ”آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو جی میں آئے کریں۔“
شیخ احمد نے اسی وقت اس در کو چھوڑ دیا اور پانی پت سے نکل جانے کے ارادے سے سارا دن پیدل ہی سفر کرتے رہے یہاں تک...... کہ وہ شام تک ایک دوسری آبادی میں داخل ہو گئے۔ ایک درخت کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ رات سر پر کھڑی تھی۔ پریشان تھے کہ شب بسری کہاں ہوگی۔ انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ”بھائی ذرا سننا تو۔“
راہ گیر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”پانی پت سے۔“
راہ گیر مسکرایا۔ ”پانی پت سے، واللہ طبیعت تو ٹھیک ہے جناب کی؟“
آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں اس میں طبیعت کی خرابی یا صحت یابی کو کیا دخل؟ میں پانی پت سے چلا آرہا ہوں۔“
راہ گیر نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! اس وقت آپ پانی پت ہی میں تشریف فرما ہیں پھر پانی پت سے آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“
شیخ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن پھر اس شبے میں پڑ گئے کہ شاید وہ راستہ بھول کر پانی پت ہی میں چلتے پھرتے رہے ہیں راہ گیر نے جاتے جاتے کہا۔ ”صاحبزادے اب آپ گھر جائیں کیونکہ یہ پردیس نہیں آپ کا اپنا وطن پانی پت ہے۔“
شیخ احمد خاموش رہے اور پوری رات اس درخت کے نیچے گزار دی۔
صبح طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد آپ دوبارہ چل کھڑے ہوئے اور نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے دن بھر سفر کرتے رہے۔ شام سے پہلے ہی وہ پانی پت سے دور جا چکے تھے۔ نئی آبادی، نئے نئے اجنبی سے مکانات، غیر مانوس کھیت غرضیکہ ماحول کی ہر شے نئی اور اجنبی تھی۔ یہ ایک محل کے سائے میں جا کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ اگر کوئی نظر آجائے تو اس سے شب بسری کے لیے جگہ مانگی جائے۔ راستے میں ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا، یہ اپنی جگہ سے اٹھے اور گھڑسوار کی راہ میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے گھوڑا روک دیا اور گھوڑے کی پشت ہی سے سوال کیا۔ ”کیوں صاحبزادے کیا بات ہے؟“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”مجھے جانا تو بہت دور ہے لیکن سردست میں پانی پت سے بھاگ جانا چاہتا ہوں اور خدا کا شکر ہے میں اس میں کامیاب ہو گیا۔“
گھڑسوار ہنسا۔ ”خوب یعنی آپ پانی پت سے تشریف لائے ہیں اور پانی پت ہی میں کھڑے یہ سوال کر رہے ہیں۔ خوب۔ خوب۔“
شیخ احمد نے گھبرا کر گھڑسوار کا جواب دہرایا۔ ”یعنی اس وقت میں پانی پت میں ہوں؟ وہ پانی پت جس کو میں نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں؟ اس وقت بھی میں اسی پانی پت میں موجود ہوں؟ یہ معاملہ کیا ہے اور یہ مجھ سے کون مذاق کر رہا ہے؟“
گھڑسوار نے آپ کو حیرت و استعجاب سے دیکھا اور اپنی راہ لی۔
شیخ احمد کو ضد ہو گئی خود سے بولے۔ ”احمد! کچھ بھی ہو، میں پرکار کی طرح ساری عمر یوں ہی کوشش جاری رکھوں گا اور دیکھوں گا کہ کس طرح اس پرکار سے نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔“
انہوں نے پوری رات محل کی دیوار کے سائے میں گزار دی اور علی الصباح ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک نہایت سرگرمی سے سفر کرتے رہے لیکن دھوپ کی تمازت نے انہیں آرام کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک خشک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ تنے سے ٹیک لگا کر ماضی حال اور مستقبل کی سیر کرنے لگے۔ اتنے میں اچانک آواز سنائی دی۔ ”اے بھائی تمہیں کہاں جانا ہے؟“
آواز درخت کے اوپر سے آرہی تھی چنانچہ انہوں نے اوپر درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خوب صورت نوجوان اچھے لباس میں کلگی ٹوپی پہنے بیٹھا تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ نوجوان اس جگہ تھوڑی دیر پہلے تو نہیں تھا۔ اب یہ کہاں سے آگیا۔
نوجوان انہیں حیرت زدہ اور متفکر دیکھ کر مسکرایا اور طنزیہ کہا۔ ”لڑکے تو اتنا پریشان کیوں ہے۔ کیا ہوا؟“
شیخ احمد نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”ارے بھائی یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں یہاں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

شیخ احمد نے کہا۔ "بھائی! میں منزل کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کدھر کو جانا ہے؟"

نوجوان ہنس دیا۔ مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ "معلوم نہیں میں تمہیں کیا کہوں، خوش قسمت یا بدقسمت۔ تم وہ شخص ہو جو منزل پر پہنچ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے، تم نے تو اپنا راستہ جلال الدین کے در پر پہنچ کر ہی گم کر دیا۔"

شیخ احمد نے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "بھائی! میں ہی نہیں ایک زمانہ یہی کہے گا۔" پھر...... سامنے آتے ہوئے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں سے بات کرو اللہ نے چاہا تو یہ بھی میری تائید کریں گے۔"

شیخ احمد دونوں کی طرف بڑھے۔ یہ دونوں نہایت ستھرے کپڑوں میں ملبوس انہی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ شیخ احمد ان کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر سوال کیا۔ "صاحبان! مجھے کدھر جانا چاہیے۔ میرا راستہ کدھر ہے؟"

ان دونوں نے یک آواز جواب دیا۔ "راستہ کھونے کے بعد راستہ پوچھ رہے ہو؟ کیا جلال الدین قطب ربانی کا در تیری منزل نہیں تھا؟ تو نے تو اپنا سارا راستہ خود ہی کھو دیا۔"

شیخ احمد شرمسار و شرمندہ درخت کی طرف مڑے اور درخت پر بیٹھے ہوئے نوجوان کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن اب درخت پر کوئی بھی نہ تھا۔ ادھر سے مڑ کر دونوں اجنبیوں کی طرف بڑھے لیکن اب وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ یہ خجل و شرمندہ ہو کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

آخر اٹھے اور پانی پت کی طرف چل پڑے لیکن راستے میں ندامت اور شرمندگی نے انہیں نڈھال کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئے اور بڑی دیر تک یوں ہی پڑے رہے لیکن ہوش میں آتے ہی وہ پانی پت کی طرف چل نکلے۔

ابھی آستانہ دور ہی تھا کہ وسوسوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں، انہیں کون ورغلا رہا تھا۔ دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تجربے اور ثبوت کے بغیر میں انہیں کس طرح ولی کامل اور قطب ربانی مان لوں پھر کسی نے دل سے یہ مشورہ دیا کہ "شیخ احمد! ذرا ان قطب ربانی کا امتحان تو لے لے۔"

اس آواز سے شیخ احمد نے سوال کیا۔ "میں ان کا کیا امتحان لوں؟"

جواب ملا۔ "جب تو ان کے سامنے پہنچے تو اپنے دل میں دو خواہشیں لیے ہو کہ حضرت قطب ربانی اپنے سر کی ٹوپی اپنے پیر کی قبر سے مس کر کے تیرے سر پر رکھ دیں اور اس کے بعد شیرینی عطا فرما دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو واقعی قطب ربانی ٹھہریں گے ورنہ کچھ بھی نہیں۔"

چنانچہ شیخ احمد اپنے دل میں دونوں خواہشیں لیے ہوئے قطب ربانی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ خادم سے پوچھا۔ "کیوں بھائی، قطب ربانی تشریف رکھتے ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

خادم نے جواب دیا۔ "قطب ربانی اس وقت اپنے پیر کے مزار پر کھڑے فاتحہ پڑھ رہے ہیں، اگر ان سے ملاقات کا اتنا ہی شوق ہے تو اندر مزار کے پاس چلے جاؤ اسی وقت ملاقات ہو جائے گی۔"

شیخ احمد اسی وقت مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت قطب ربانی فاتحہ پڑھ کر واپسی کا ارادہ کر رہے تھے، اپنے سامنے شیخ احمد کو کھڑے دیکھا تو مسکرا دیے۔ پوچھا۔ "تو تم ابھی تک پانی پت میں ہی موجود ہو؟"

شیخ احمد کے دل پر چوٹ لگی بولے۔ "حضرت میں خطاکار ہوں۔"

حضرت قطب ربانی نے فرمایا۔ "تم پرکار کی طرح عمر بھر چکر لگانے کا عہد کر چکے تھے؟"

شیخ احمد تڑپ کر بولے۔ "مجھ سے غلطی ہوئی میں شرمندہ ہوں۔ مجھ کو اور زیادہ شرمندہ نہ کیجیے۔"

جواب میں قطب ربانی نے کلاہ سر سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھر اس کو مزار سے چھوا کر شیخ احمد کے سر پر رکھ دی۔ دوسرے ہاتھ میں روٹی اور حلوا تھا فرمایا۔ "یہ کلاہ اپنے سر پر رہنے دے اور روٹی اور حلوا کھا لے۔"

شیخ احمد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "حق حق حق۔"

اور بے اختیار قطب ربانی کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے۔ قطب ربانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بڑی دعائیں دیں۔

حضرت قطب ربانی انہیں اپنے ساتھ خانقاہ میں لے گئے اور اپنے ہاتھوں سے سر کے بال کاٹ دیے اور باقاعدہ اپنا مرید کر لیا۔ کچھ دیر بعد دسترخوان بچھا اور اس پر کئی قسم کے کھانے سجا دیے گئے۔

شیخ احمد نے ہر کھانے میں تامل سے کام لیا۔

قطب ربانی نے دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے شیخ احمد، کھاتے کیوں نہیں؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”حضرت میری کیا مجال جو کھانے سے گریز کروں لیکن اندر دل میں معلوم نہیں کون ہے جو مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں کھانا کھانا چاہتا ہوں لیکن دل سے آواز آ رہی ہے کہ خبردار، محتاط جو کچھ بھی کھانا سوچ سمجھ کر کھانا، کھانے کی طرف سے ہر طرح اطمینان کر کے۔“

اس کے بعد شیخ احمد نے کئی بار حق حق کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے وسوسے کا علاج کرتا ہوں، تمہارے دل کو ہاں اور نہیں کے وسوسوں سے پاک کرتا ہوں۔“

شیخ احمد نے عجز وانکسار سے فرمایا۔ ”خدا کے لیے جلدی کیجیے ورنہ میں بیمار پڑ جاؤں گا۔“

قطب ربانی نے تیز تیز نظروں سے شیخ احمد کو گھورا اور تحکمانہ فرمایا۔ ”شیخ احمد! ان موجود کھانوں میں جو ناپسند ہوں، انہیں چھوڑ دو بقیہ کھالو۔“

شیخ احمد کو یوں محسوس ہوا گویا ان کا دل وسوسوں سے پاک ہو چکا ہے، انہوں نے بے ساختہ ”حق حق“ کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے فرمایا۔ ”شیخ احمد، یہ تو حق حق کا نعرہ کیوں لگا رہا ہے؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”مجھ کو حق حق سے سکون ملتا ہے۔“

قطب ربانی نے ارشاد فرمایا۔ ”اب آج سے تو شیخ احمد کے ساتھ ساتھ عبدالحق بھی ہے۔ یہ نام تیرے ساتھ ابھار رہے گا۔ اب تو عبدالحق ہے اور ہمیشہ عبدالحق ہی رہے گا۔“

اس کے بعد سے وہ واقعی عبدالحق ہی ہو گئے۔

کچھ عرصہ پیر ومرشد کے پاس رہ کر انہوں نے سیاحت اختیار کی۔ قطب ربانی نے بھی اس کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ یہ پانی پت سے ردولی پہنچے، ماں اپنے بیٹے کی یاد میں سوگوار ہو رہی تھیں۔ اچانک بیٹے کو سامنے دیکھ کر بے چین ہو گئیں اور دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔

بعد میں ماں نے پوچھا۔ ”کیا تیرے بھائی تقی الدین نے تیری مدد کی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ذرا بھی نہیں کیونکہ بھائی تقی الدین علوم ظاہری کا درس تو دے سکتے ہیں علوم باطنی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔“

ماں نے شفقت سے پوچھا۔ ”پھر تو نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”پھر میں نے اپنے بھائی کی قیام گاہ چھوڑ دی اور مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پانی پت کا پتا بتایا گیا تھا چنانچہ جب میں پانی پت پہنچا اور وہاں قطب ربانی کے در پر ہاتھیوں اور گھوڑوں کا ہجوم دیکھا تو میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ آخر یہ کیسا پیر ہے جو اس کروفر اور شان وشوکت سے رہتا ہے۔ میں نے اس خانقاہ میں دوبارہ جانا بھی گوارا نہ کیا اور پانی پت کو چھوڑ دیا۔ سارا دن چلتا رہا اور بعد میں یہ معلوم ہوا کہ میں پانی پت ہی میں عمر بھر گردش کرتا رہوں گا کسی پرکار کی طرح۔“

ماں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

شیخ احمد نے سب کچھ تفصیل سے بتا کر عرض کیا۔ ”ماں اب میں بہت شرمندہ بھی ہوں اور مطمئن بھی۔“

ماں نے ایک بار پھر بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑی دعائیں دیں۔ اس کے بعد شیخ احمد سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور کئی سال تک سیاحت کرتے رہے۔ پانی پت میں پیر ومرشد کی طبیعت بہت نازک ہو گئی اور انہیں اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ اپنے بیٹے شیخ احمد عارف کو بلا کر فرمایا۔ ”بیٹے عارف! اب میں عنقریب اپنے خالق کے پاس چلا جاؤں گا۔“

قطب ربانی کے صاحبزادے رونے لگے کہا۔ ”باوا جان! خدا آپ کو ہزاروں سال زندہ وسلامت رکھے آپ ایسی بات نہ کیجیے۔“

شیخ عارف کی باتیں آپ نے بڑے انہماک سے سنیں اور فرمایا۔ ”فرزند! میرے بعد شیخ احمد جو اب عبدالحق ہو چکا ہے تیرے پاس آئے گا تو میرے سارے تبرکات اس کے حوالے کر دے گا، کیونکہ وہی میرا خلیفہ اور سجادہ نشین ہوگا۔“

بیٹے کو رونا آئے چلا جا رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”باوا جان آپ ایسی باتیں نہ کیجیے میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔“

باپ نے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ ”بیٹے! تو آنسو نہیں بہائے گا کیونکہ رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا میری ساری وصیتیں اور نصیحتیں تو نے سن لی ہیں؟“

بیٹے نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”میں نے آپ کی نصیحتیں اور وصیتیں اچھی طرح سن لی ہیں اور اللہ نے چاہا تو میں

ان پر پورا اتروں گا۔''

اس کے چند دن بعد حضرت قطب ربانی نے وصال فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ احمد پانی پت واپس پہنچے۔ مرحوم قطب ربانی کے صاحبزادے شیخ عارف نے بصد ادب و احترام تبرکات ان کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ''حضرت! پدر مرحوم فرما گئے ہیں کہ ان کا سلسلہ آپ ہی سے جاری ہوگا۔ آپ ان کے جانشین ہیں۔ چنانچہ ان کے سارے تبرکات پیش خدمت ہیں قبول فرمایئے۔''

شیخ احمد نے تبرکات لے کر پیرومرشد کے فرزند شیخ عارف پر توجہ دینا شروع کر دی اور تعلیم و تربیت دے کر انہیں مرتبہ کمال کو پہنچا دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے ردولی کے لیے رخت سفر باندھا۔ شیخ عارف نے سوگوار ہو کر دریافت کیا۔ ''حضرت! میرے لیے کیا ارشاد ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مرشد زادے! تم میرے خلیفہ اور جانشین ہو۔ چاہو تو ردولی چلو، ورنہ یہیں رہ جاؤ۔''

مرشد زادے نے عرض کیا۔ ''میں آپ کے ساتھ ردولی چلوں گا کیونکہ آپ کے بغیر میرا وجود ہی کیا۔''

آپ مرشد زادے کے ساتھ ردولی تشریف لے گئے گھر کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ والدین میں سے کوئی بھی بقید حیات نہ تھا۔ ردولی چند مکانوں کی ایک بستی کا نام تھا اور نہ ہر طرف جنگل و بیابان تھا۔ آپ اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے۔ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کی صحبت میں ردولی کا قیام اختیار کیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔

آپ کے حجرے میں نہ تکیہ تھا نہ بستر۔ جسم پر ایک خرقہ تھا جس پر بے شمار پیوند لگے ہوئے تھے۔ شیخ عارف نے ایک عرصہ بعد آپ کو یاد دلایا۔ ''حضرت! کامل تیس سال گزر چکے ہیں کہ آپ کا سر تکیے کی لذت سے نا آشنا ہے۔ اب ضعیفی میں تو سر کو آرام دے دیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تکیہ ایک ہی ذات کا کافی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور تکیے کی کیا ضرورت۔ اور اس تکیے میں جو لذت ہے اس کا بیان کرنا ہی کیا۔''

شیخ عارف نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کا لباس بھی پیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور ان کی کثرت سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ لباس کا اصل کپڑا کون سا ہے۔''

آپ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''مجھے اپنے لباس کی نہیں اپنی شناخت منظور ہے، اگر یہ شناخت میں نہ حاصل کر سکوں تو پھر میرے پاس رہے گا کیا لیکن اب میری شناخت میں یہ لباس بھی شامل ہو چکا ہے۔''

اس کے بعد آپ پر محویت طاری ہو گئی اور دنیا فراموش ہونے کے ساتھ ساتھ خود فراموشی میں ایسے گم ہوئے کہ سب کچھ بھلا دیا۔ وہ ذات واحد میں گم ہو چکے تھے، جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے باقاعدگی سے تشریف لے جاتے اور ردولی اتنی ترقی کر چکا تھا کہ وہاں کئی مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں اور ایک جامع مسجد بھی بن چکی تھی۔ آپ ہمیشہ جامع مسجد ہی میں نماز پڑھتے تھے لیکن خود ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جامع مسجد کہاں ہے۔

مرید اور رشتے دار آپ کی خدمت میں حاضریاں دیتے لیکن آپ کو دنیا سے بے نیاز اور گم دیکھ کر واپس چلے جاتے۔ آپ کسی سے مخاطب ہوتے نہ کسی کا مخاطب کرنا پسند فرماتے۔ دنیا فراموشی کا یہ عالم تھا کہ رشتے دار ان کے سامنے کھڑے ہوتے مگر آپ انہیں پہچاننے سے قاصر رہتے۔

ایک دن تو بہ ظاہر فراموشی حد کمال کو پہنچ گئی۔ آپ کا ایک انتہائی قریبی رشتے کا نوجوان اس زعم میں آپ کے پاس پہنچا کہ آپ اس کو تو پہچان ہی لیں گے۔ آپ نے اپنے روبرو ایک سایہ سا محسوس کیا پوچھا۔ ''بھائی! تم کون ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں۔''

آپ نے حیرت سے کہا۔ ''میری بہن کا بیٹا، یہ کیا ہوتا ہے؟''

بھانجے نے جواب دیا۔ ''بہن کا بیٹا بھانجا ہوتا ہے، آپ کی بہن کا بیٹا۔''

آپ نے بدستور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میری بہن کا بیٹا! میرا بھانجا، میں تیری بات نہیں سمجھا، میرا وقت کیوں ضائع کرتا ہے اپنی راہ لے اور میرے سامنے سے ہٹ جا۔''

بھانجے نے پھر عرض کیا۔ ''میں خود کو پہچان کرائے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے جو ہو جائے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر جلدی پہچان کرا دیں، تجھے نہیں پہچان سکا۔''

بھانجے نے پوچھا۔ ''کیا آپ اپنی بہن کو بھول گئے؟''

آپ نے ذہن پر زور دیا، فرمایا۔ ”بہن؟ یہ کوئی چیز ہوتی تو ضرور ہے۔ ذرا اس کا اتا پتا تو بتا۔ ممکن ہے اس طرح میں اسے پہچان لوں۔“

بھانجے نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”حد ہے تو گویا آپ نے اپنی بہن ہی کو بھلا دیا۔ اس بہن کو جو آپ کی ماں اور باپ کی بیٹی تھی۔ آپ کے والدین کی بیٹی آپ کی بہن۔“

آپ نے ذرا سکوت اختیار کیا اور پھر فرمایا۔ ”میرے والدین کی بیٹی؟ ہاں ایک تھی تو ضرور لیکن آج کل وہ ہے کہاں؟ وہ کہاں چلی گئی۔ شاید بچپن میں اس کا میرا کچھ ساتھ بھی رہا ہے۔“

بھانجے نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”بے شک بے شک آپ نے درست فرمایا۔ اب آپ نے پہچان لیا، بالکل صحیح پہچانا۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”تو تو میری بہن کا بیٹا ہے لیکن وہ میری بہن ہے کہاں؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ اللہ کو پیاری ہو چکیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب کو وہیں جانا ہے بس اللہ ہی باقی رہے گا۔“

بھانجے نے عرض کیا۔ ”حضرت! ایسی خود فراموشی بھی کس کام کی کہ بہن اور بھانجے تک کو بھلا دیا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کوئی کام کی بات کرنا ہو تو کر، وقت ضائع نہ کر۔“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

آپ بدستور حق حق فرماتے رہے، اس طرح گویا انہوں نے بھانجے کی آواز سنی ہی نہیں۔

بھانجے نے ایک بار پھر عرض کیا۔ ”حضرت! کچھ میری بھی سنیے، میں کچھ عرض کر رہا ہوں۔“

آپ نے بھانجے کو غور سے دیکھ کر سوال کیا۔ ”کیا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”ہاں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں، میں بہت پریشان ہوں میرے حق میں دعا فرما دیجیے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”لیکن تم ہو کون؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”میں ہوں آپ کا بھانجا۔“

آپ نے ذہن پر زور دے کر پوچھا۔ ”بھانجا۔ یہ بھانجا کیا ہوتا ہے؟“

بھانجے نے زچ ہو کر عرض کیا۔ ”بھانجا بہن کا بیٹا ہوتا ہے۔“

آپ نے ذہن پر مزید زور دیا۔ ”بہن کا بیٹا؟ یہ بہن کیا ہوتی ہے؟“

بھانجے نے عاجز آ کر جواب دیا۔ ”حضرت! ابھی ابھی بہن کا مطلب سمجھا چکا ہوں اور آپ پھر پوچھ رہے ہیں کہ بہن کیا ہوتی ہے اب میں ہار کیا بتاؤں کہ بہن کیا ہوتی ہے۔“

آپ نے ”حق حق“ کا نعرہ لگایا۔ بولے۔ ”ہاں بتا بتا یہ بہن کیا چیز ہوتی ہے؟“

بھانجے نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو اپنے والدین کا علم ہے؟ آپ کی ایک ماں تھی ایک باپ تھا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”ہاں تھے تو سہی، پھر؟“

بھانجے نے کہا۔ ”ان کا ایک بیٹا تھا جو آپ ہیں اور ایک بیٹی تھی وہ بیٹی آپ کی بہن تھی میں اس کا بیٹا ہوں۔“

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ”سمجھا سمجھا۔ بالکل سمجھ گیا۔“

بھانجے نے فوراً عرض کیا۔ ”میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں، میرے حق میں دعا کیجیے۔“

آپ پھر ”حق حق“ کہنے لگے فرمایا۔ ”دعا کروں گا ضرور کروں گا، تیرے لیے بھی۔ بہن کے لیے بھی، سب کے لیے دعا کروں گا۔“

اس کے بعد آپ جتنے دن بھی رہے خود فراموشی میں رہے۔ آخر اسی حال میں 15 جمادی الثانی 837ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ آپ کا سن وفات، عارف حق احمد عبدالحق بحق، سے نکلتا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے مرشد زادے عارف خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے ان کے بعد یہ خلافت محمد بن عارف کو منتقل ہوئی اور پھر یہ خلافت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو ملی اور ان سے یہ سلسلہ پورے برصغیر میں پھیلتا چلا گیا۔

شیخ بدرالدین اسحاق

ضیاء الدین بلگرامی



دہلی کے مشہور بزرگ شیخ بدرالدین کے والد کا نام علی اور دادا کا نام اسحاق تھا لیکن آپ کے دادا کا نام آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا اور باپ کا نام بس تذکرہ اور سوانح میں محفوظ ہو کر رہ گیا۔

انہوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس زمانے میں حصولِ علم کے علاوہ فنِ سپاہ گری بھی شرفا میں عام تھا۔ بدرالدین نے اس فن میں بھی کمال حاصل کیا۔ دورانِ تعلیم چند ایسے مسائل بھی سامنے آئے کہ اُن کا بخوبی اور اطمینان بخش علم حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ بدرالدین نے ان مسائل کو علمائے عصر کے سامنے رکھا اور ان کا جواب مانگا۔ ان علما نے تسلی بخش جواب دینے کے بجائے انہیں باتوں میں الجھانے اور بہلانے کی کوشش کی لیکن آپ ان علما کے جوابات سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے ہمدردوں سے مشورۃً پوچھا "دوستو! کیا میں ان مسائل کے جوابات سے محروم رہوں گا؟"

ایک مخلص اور سمجھ دار دوست نے جواب دیا: "نہیں بھائی بدرالدین! تم اپنے مسائل کے جوابات دہلی میں نہیں بخارا میں پاؤ گے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تم بخارا کوچ کر جاؤ۔"

بدرالدین کے دل پر دوست کے مشورے نے بڑا اثر کیا۔ آپ نے رختِ سفر باندھا اور بخارا کے لیے عازمِ سفر ہو گئے۔

دورانِ سفر آپ نے اجودھن میں قیام کیا۔ اجودھن میں بھی آپ کا ایک دوست رہتا تھا۔ آپ نے اسی دوست کے ہاں قیام کیا۔

جب یہ دونوں ایک ہی دسترخوان پر کھانے میں مشغول تھے تو دوست نے پوچھا "یار میرے! تم نے دہلی کیوں چھوڑ دیا؟ دہلی میں کیا کمی پائی تھی تم نے؟"

بدرالدین نے جواب دیا: "دہلی میں کوئی کمی نہیں محسوس کی میں نے مگر میں کچھ عرصے سے چند مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ دہلی بھر میں ایک عالم بھی مجھے ایسا نہیں ملا کہ وہ مجھے مطمئن کر سکتا۔"

دوست نے پوچھا: "تو کیا تم نے بخارا جانے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "میں نے برِصغیر سے مایوس ہونے کے بعد بخارا جانے کا ارادہ کیا ہے۔"

دوست نے کہا: "مگر دوست! اجودھن میں ایک بزرگ ہیں بابا فرید مسعود گنج شکر۔ تم بخارا جانے سے پہلے ایک بار اُن سے ضرور مل لو۔"

بدرالدین نے کہا: "لیکن میں اُن سے کیوں ملوں۔ جب میں جانتا ہوں کہ برِصغیر میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو میرے مسائل کے جواب دے سکے تو میں ان بزرگ سے مل کر اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔"

دوست نے اصرار کیا: "دوست! تم اپنا وقت نہیں ضائع کرو گے بلکہ تم اُن سے مل کر بے حد خوش ہو گے میرے کہنے سے تم

سے ایک بار مل ضرور لو۔"

بدرالدین دوست کے اصرار پر مجبور ہو گئے، بولے "تم کہتے ہو تو میں مل لوں گا لیکن میں دل سے نہیں ملوں گا۔ طوعاً و کرہاً مل لوں گا۔"

بدرالدین اپنے دوست کے ساتھ بابا فرید کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں ایک ہجوم دیکھا۔ یہ لوگ بابا فرید کے شوقِ دیدار میں ان کی چوکھٹ کے در پر پڑے ہوئے تھے۔ اس ہجوم کے لوگ اپنے لباس اور وضع قطع سے مختلف ملکوں کے معلوم ہوتے تھے۔ بدرالدین غیر ملکی مشتاقانِ دید کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئے۔ ایک غیر ملکی سے پوچھا "حضرت! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "بغداد سے۔"

بدرالدین نے حیرت سے پوچھا "مگر کیوں؟ کیا بغداد میں بڑا درویش نہیں ملا؟"

بغدادی مہمان نے بدرالدین کو حیرت سے دیکھا "جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "میرا نام بدرالدین ہے اور میں دہلی کا رہنے والا ہوں۔"

بغدادی جوان نے کہا "تب پھر میں آپ کی لاعلمی پر افسوس کروں گا۔ برادرِ عزیز! جن بزرگ کی چوکھٹ پر اس وقت ہم بیٹھے ہیں یہ یکتائے عصر ہیں۔ ان کا اس وقت کوئی ثانی نہیں۔"

بدرالدین نے اس بار خاموشی اختیار کی مگر انہوں نے اس بغدادی جوان سے جو کچھ سنا تھا وہ حیرت انگیز تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے غیر ملکی بوڑھے سے پوچھا "جناب آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

غیر ملکی بوڑھے نے جواب دیا "مصر سے۔"

انہوں نے پوچھا "کیوں؟ حضرت ان بزرگ میں کیا خاص بات ہے جو آپ لوگ اتنی دور سے ان کی ملاقات کو تشریف لائے ہیں، حالانکہ میں خود دہلی کا رہنے والا ہوں لیکن اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے ایک دوست کے اصرار پر ان سے ملنے آ گیا ہوں۔"

مصری بوڑھے نے بدرالدین کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا "تب پھر تو میں یہ کہوں گا کہ تو بدقسمت ہے ورنہ بابا فرید جیسا درویش اس دور میں کہیں ملنے سے رہا۔"

یہ باتوں میں مشغول تھے کہ ایک شخص اندر سے نمودار ہوا اور آواز دی۔ "بدرالدین اسحاق کس کا نام ہے؟"

بدرالدین اسحاق آگے بڑھے اور عرض کیا "بندے کو بدرالدین اسحاق کہتے ہیں۔"

اس شخص نے جواب دیا "میرے ساتھ اندر تشریف لے چلیں آپ کو بابا یاد فرما رہے ہیں۔"

بدرالدین اسحاق کا دوست باہر ہی رہ گیا اور آپ اندر چلے گئے۔ اس وقت بابا فرید تنہا بیٹھے تھے۔ اور ان کے پاس کتاب نام کا ایک کاغذ بھی نہیں تھا۔

بابا فرید نے بدرالدین کی طرف نظر بھر کے دیکھا تو وہ کانپ گئے۔ انہیں ایسا لگا گویا وہ کسی بادشاہ کے سامنے پیش کر دیے گئے ہیں۔ بابا فرید نے پوچھا "تو دہلی سے یہاں تک آیا اور مجھ سے ملے بغیر ہی بخارا چلا جانا چاہتا تھا۔ خوب۔ ہمیں بھی تو مہمان نوازی کا موقع دیا ہوتا۔ اور رہ گیا یہ خیالِ خام کہ بعض مشکل مسائل کے جوابات بخارا کے عالم ہی دے سکتے ہیں، تو یہ تیرا وہم ہے۔"

اس کے بعد آپ نے باری باری ان مشکل مسائل کا ذکر کیا اور ان کی وضاحت اور تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ بدرالدین کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے، فرمایا "بدرالدین! اب تو کہیں نہیں جائے گا، یہیں میرے ساتھ رہے گا۔"

بدرالدین پسینے سے شرابور ہو چکے تھے، کہا "بابا! میں اپنی نادانی اور کم علمی پر شرمندہ ہوں۔"

بابا نے فرمایا "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کم علمی اور نادانی میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اب بدرالدین اسحاق اجودھن میں مستقلاً رہنے لگے۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ وہ اکثر رویا کرتے تھے۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئیں اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ آنکھیں خراب ہونے لگیں۔

بابا فرید کی مرید خواتین میں ایک ایسی خاتون بھی تھیں جو آنکھوں کا علاج سرمے سے کیا کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے بدرالدین سے کہا۔ "بھائی بدرالدین! میں آنکھوں کا علاج بہت اچھا کرتی ہوں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری آنکھیں خراب ہوتی جا رہی ہیں۔"

بدرالدین نے جواب دیا "وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ حضرت یعقوبؑ کی طرح گریۂ پیہم نے میری آنکھوں کو خراب کر دیا ہے۔ نہ رونا میرے بس کی بات ہی نہیں۔"

بڑی بی نے مشورہ دیا "لیکن اگر تم چند گھنٹے کی خاموشی اختیار کرو تو میں انہیں ٹھیک کر سکتی ہوں۔"

بدرالدین نے جواب دیا "اے کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔"

آپ کی اس حالت میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ بابا فرید آپ کو اس حالت میں دیکھتے تو کچھ بھی نہ کہتے۔

ایک دن آپ نے یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

پیشِ صلابتِ عشقش روح نطق می زند اے ز ہزار صعوہ کم پس تو نوا چہ می زنی

(اس کے عشق کے غم میں روح تک خاموش ہے۔ اے انسان! تیری ہستی ایک ممولے کے ہزارویں حصے سے بھی کمتر ہے پھر تو نالہ کیوں کرتا ہے۔)"

آپ نے اس شعر کا ورد صبح شروع کیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرا اور شعر بار بار زبان پر آتا رہا، آپ کی حالت بھی غیر ہوتی چلی گئی۔ عالمِ شوق اور تحیر میں آپ کو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ پورا دن اسی حال میں گزر گیا۔ شام کو بابا فرید نے انہیں حکم دیا "بدرالدین! اِس وقت امامت تم کرو گے، میں تمہارے پیچھے نماز پڑھوں گا۔"

بدرالدین مجبور ہو گئے اور امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

تکبیرِ تحریمہ کے بعد آپ نے قرأت کے بجائے مذکورہ بالا شعر پڑھنا شروع کر دیا اور کچھ دیر بعد بے ہوش ہو کر گر گئے۔ بابا فرید نے انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ دوسرے مقتدی دل برداشتہ تھے۔ انھوں نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا۔ "یہ بدرالدین تو اس لائق ہی نہیں رہ گئے کہ انہیں امام بنایا جائے۔"

دوسرے شخص نے کہا "ذرا دیکھو تو قرآنی آیات کے بجائے فارسی کا شعر پڑھ رہے تھے نماز میں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

بابا فرید نے ہوش میں آنے کے بعد بدرالدین سے پوچھا "بدرالدین! یہ تجھ کو کیا ہو گیا ہے؟"

بدرالدین رو رہے تھے، بولے "بابا! پتہ نہیں مجھ کو کیا ہو گیا ہے۔"

بابا فرید نے حکم دیا "پھر سے نماز پڑھا۔ مگر خبردار اس بار جو تُو نے کوئی شعر پڑھا۔"

بدرالدین امامت کے لیے کھڑے ہو گئے اور بمشکل تمام نماز پڑھائی۔ اس بار نہ تو انھوں نے کوئی شعر پڑھا اور نہ ہی اُن سے کسی قسم کا سہو ہُوا۔

اِس واقعے نے بڑی شہرت اختیار کی اور لوگوں کا ہجوم آپ کی زیارت کے لیے جمع ہونے لگا۔

❁

بابا فرید گنج شکر کی مہربانیاں اور نوازشیں اپنے عروج پر تھیں۔ بدرالدین اسحاق نے اجودھن میں وہ مقام اور مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ حد اور بس۔ ایک دن بابا فرید نے آپ سے فرمایا "بدرالدین! میں آج سنتِ رسول مقبولؐ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

بدرالدین اسحاق نے عرض کیا "پیر و مرشد! آپ کی پوری زندگی سنتِ رسولؐ کے مطابق ہے۔"

بابا فرید نے فرمایا "ہاں، مگر میں آج جس سنت پر عمل کرنے والا ہوں، اس کا تعلق میری بیٹی اور تم سے ہے۔ جس طرح رسول مقبولؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے سلسلے میں حضرت علیؓ سے خود بات کی تھی، اسی طرح آج میں اپنی بیٹی کے سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری بیٹی کا نام بھی بی بی فاطمہ ہے۔"

بدرالدین اسحاق پر کپکپی طاری ہو گئی، جواب دیا "پیر و مرشد! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، میں اس قابل کہاں!"

بابا فرید نے بدرالدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے سہلاتے ہوئے فرمایا "تم اس قابل ہو، میں جانتا ہوں تم اس قابل ہو۔ اگر تم اس قابل نہ ہوتے تو میں یہ بات ہی نہ کرتا۔"

بدرالدین اسحاق نے اعتماد سے پُر آواز میں کہا "آپ نے مجھ پر اعتماد فرمایا۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

بابا فرید نے فرمایا "شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ رسم نہایت سادگی سے آج ہی انجام پا جائے۔"

بدرالدین اسحٰق نے ایک عذر پیش کیا "حضرت! میں ایک نادار پردیسی ہوں شادی کہاں سے کروں گا کیونکہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ پھر شادی کے مصارف کس طرح اور کون اٹھائے گا؟"

بابا فریدؒ نے تلخی سے کہا "نادان! میں نے کہہ جو دیا کہ جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہو گا۔"

بدرالدین نے دبی زبان میں عرض کیا "جیسی پیر و مرشد کی مرضی، یہ خاکسار کیا عرض کرے۔"

بابا فرید نے ایک سادہ سی تقریب میں اپنی بیٹی کا ہاتھ بدرالدین اسحاق کے ہاتھ میں دے دیا۔ شرفِ دامادی عطا فرمانے کے بعد انہیں اپنی

خلافت بھی بخش دی۔ لوگوں کو بدرالدین اسحاق کی خوش نصیبی پر رشک ہو رہا تھا۔

بابا فرید نے اپنے بیٹے شیخ یعقوب اور نواسے شیخ علاء الدین کو آپ کے حوالے کر دیا اور فرمایا "ان دونوں کو کلام اللہ تم پڑھاؤ گے"

آپ نے جواب دیا "بسر و چشم"

بابا فرید نے فرمایا "ہم نے تم کو دامادی اور خلافت سے سرفراز فرمایا ....."

بدرالدین اسحاق نے جواب دیا "لیکن میں خود کو آپ کا خادم سمجھتا ہوں اور انشاء اللہ زندگی بھر آپ کی خدمت کروں گا"

بابا فرید نے آپ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بڑی دعائیں دیں اور اس موقع پر آپ نے اپنے غلام اخی مبارک کو بدرالدین اسحاق کے حوالے کر دیا۔ اخی مبارک خانقاہ میں جہازی کے نام سے مشہور تھے۔

٭

بابا فرید کی خدمت میں بیعت کے لیے آنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان میں معمولی اور غیر معمولی دونوں ہی قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی بیٹھا نظر آیا جس کی بڑی مونچھ اور پُرشکوہ چہرے نے دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ بابا فرید نے پوچھا "تُو یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "حضرت! میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ میں دیپال پور کا مقطع دار ہوں اور میرا نام ملک شرف الدین کبرا ہے"

بابا فرید نے فرمایا "کیا مجھ سے بیعت ہونا ضروری ہے؟"

ملک شرف الدین نے جواب دیا "بابا! میرے آنے کا مقصد تو یہی ہے"

بابا فرید نے مولانا بدرالدین اسحاق کو آواز دی "ذرا میرے پاس تو آنا..."

بدرالدین اسحاق بابا فرید کے سامنے ادب سے کھڑے ہو گئے، فرمایا "ارشاد پیر مرشد۔ خادم حاضر ہے"

بابا فرید نے فرمایا "دیپال پور کا مقطع دار ملک شرف الدین کبرا حاضر ہے، اس کو بیعت کر لو"

ملک شرف الدین کو مولانا بدرالدین اسحاق نے تجسس اور شوق کی نظروں سے دیکھا اور انکساری سے عرض کیا "حضرت! آپ کی موجودگی میں میں انہیں بیعت کر لوں؟"

بابا فرید نے فرمایا "ہاں، یہ میرا حکم ہے"

مولانا بدرالدین اسحاق نے ملک شرف الدین کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کیا تو بھی آمادہ ہے کہ میں تجھے مرید کر لوں؟"

ملک شرف الدین نے عرض کیا "شیخ! جب بابا فرید نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں پیر مرشد مولانا بدرالدین اسحاق کا مرید ہو جاؤں تو اس سے مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے"

مولانا بدرالدین اسحاق نے ملک شرف الدین کو اپنا مرید کر لیا اور رخصت ہوتے وقت فرمایا "ملک شرف الدین! ہر شخص کے پیچھے حاسدوں اور اہل شماتت کی قطار لگی ہوتی ہے تیرے پیچھے بھی یہ لوگ موجود ہیں، ان سے ہوشیار رہنا"

ملک شرف الدین نے ہنستے ہوئے کہا "پیر مرشد! میں لوگوں سے ہوشیار رہتا ہوں۔ میں انسانی جبلت سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔ انشاء اللہ یہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے"

مولانا نے فرمایا "میں نے تجھ سے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔ بس انسان کو ذرا احتیاط ضرور کرنا چاہیے"

ملک شرف الدین دیپال پور واپس چلا گیا۔

وہ اس منصب پر کئی سال قائم رہا۔

اُن دنوں بادشاہ اپنے ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ شاہی سواری دیپال پور سے گزری۔ دیپال پور کے حاکم اور دوسرے منصب داروں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی اور دیپال پور کے نظم و نسق پر گفتگو چھڑ گئی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ملک شرف الدین سے حسد رکھتے تھے۔ بادشاہ نے ان سب کو باری باری شرفِ ملاقات بخشا اور شاہی منصب داروں کے بارے میں ان سے بات کرنے لگا۔

ایک منصب دار نے عرض کیا "حضور والا! اور تو سب ٹھیک ہے لیکن یہاں کا مقطع دار صحیح نہیں ہے"

بادشاہ نے پوچھا "اس کا نام؟"

منصب دار نے جواب دیا "ملک شرف الدین کبرا"

بادشاہ نے ایک دوسرے منصب دار کو طلب کیا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔

بادشاہ نے اس کو اسی وقت معزول کر دیا اور حکم دیا کہ اسے دیپال پور سے دور کسی جگہ قید کر دیا جائے۔
شاہی حکم کی دیر تھی کہ سپاہیوں نے ملک شرف الدین کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کہا "ملک شرف الدین! آپ کو بادشاہ نے معزول کیا اور دیپال پور سے باہر قید کرنے کا حکم دیا ہے....!"
ملک شرف الدین نے پریشانی سے پوچھا "مگر میری خطا؟ میرا گناہ؟"
سپاہیوں نے جواب دیا "شاہی منصب داروں نے آپ کی بابت بادشاہ کو یہ بتایا ہے کہ آپ صحیح آدمی نہیں ہیں۔"
ملک شرف الدین نے اپنے آس پاس دیکھا، اس کے اپنے آدمی حیرت زدہ اور پریشان سے کھڑے اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ملک شرف الدین اپنے آدمیوں کی نظر میں خوار ہو رہا تھا، اس نے ایک آدمی کو آواز دی "فخر الدین!"
یہ آدمی آگے بڑھا، بولا "جی میرے آقا۔"
ملک شرف الدین نے پوچھا "آج کل کس چیز کی فصل ہے؟"
فخر الدین نے جواب دیا "خربوزوں کی۔"
ملک شرف الدین نے نرمی سے کہا "اب چونکہ میں خود معزول ہو چکا ہوں اس لیے تجھ کو کوئی حکم تو دے نہیں سکتا۔ ہاں، میری تجھ سے ایک درخواست ہے۔ تو بہت سارے خربوزے لے کر پیر مرشد بدر الدین اسحاق کی خدمت میں چلا جا، اور انہیں میرا پورا واقعہ بتا کے دعا کی درخواست کر ـــ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"
فخر الدین نے جواب دیا "بہتر ہے میں آج ہی ان کی خدمت میں خربوزے لے کر چلا جاؤں گا۔"
دیپال پور سے مولانا بدر الدین اسحاق کا مسکن زیادہ دور نہیں تھا۔ فخر الدین نے بہت سارے خربوزے لیے اور آپ کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔
جب فخر الدین آپ کی خدمت میں پہنچا تو وہاں آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ فخر الدین نے ملک شرف الدین کا سارا حال سنایا اور آپ کی خدمت میں خربوزے پیش کرتے ہوئے کہا "پیر مرشد! مجھ سے تو اپنے آقا کی بے بسی دیکھی نہ گئی اور میں خربوزے لے کر فوراً ہی یہاں چلا آیا۔"
مولانا بدر الدین اسحاق کو بہت غصہ آیا، جوش میں فرمایا "بادشاہ نے کسی تحقیق اور تفتیش کے بغیر اتنا بڑا حکم دے دیا؟ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟"
حاضرین مجلس میں قاضی صدر الدین حاکم اجودھن بھی تشریف فرما تھے، وہ بادشاہ کے خوف سے آپ کی باتوں کی تائید نہیں کر سکتے تھے سو آپ کی باتیں سن کر چپ رہے۔
آپ نے پھر فرمایا "ملک شرف الدین کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔"
قاضی صدر الدین پھر خاموش رہے۔
آپ نے غصہ میں فرمایا "قاضی! میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تو میری تائید کر یا تردید، تو خاموش کیوں ہے؟"
قاضی نے جواب دیا "حضرت! آج پوری دنیا میں ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ ہے۔"
آپ نے فرمایا "میں پوری دنیا کی بات نہیں کر رہا۔ اپنے بادشاہ اور ملک شرف الدین کی بات کر رہا ہوں۔"
قاضی نے جواب دیا "اپنا بادشاہ تو بہت منصف مزاج اور نیک دل ہے، پھر معلوم نہیں کس طرح ملک شرف الدین کے خلاف معزولی اور قید کا حکم جاری کر دیا۔"
مولانا نے ذرا سی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا، ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کچھ سوچ رہے تھے، کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور افسوسناک لہجے میں کہا "بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی! ابھی ابھی میں نے ملک شرف الدین کو اس حال میں دیکھا کہ کئی سپاہیوں نے اسکو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور وہ اس کو دیپال پور کے باہر کہیں لے جا رہے ہیں۔"
ملک شرف الدین کا خادم فخر الدین روہانسا ہو گیا، بولا "میں نے اسی حال میں چھوڑا تھا اپنے آقا کو۔"
مولانا بدر الدین اسحاق نے خربوزوں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "صدر الدین! ان خربوزوں کو حاضرین مجلس میں تقسیم کر دو۔"
صدر الدین نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور خربوزوں کو حاضرین میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔
جب یہ تقسیم کرتے کرتے مولانا کے پاس پہنچے اور مولانا کے حصے کے خربوزے ان کے سامنے رکھ دیے تو آپ نے فرمایا "صدر الدین!

شرف الدین کا حصہ بھی یہیں میرے حصے کے پاس رکھ دو۔"

صدرالدین نے ملک شرف الدین کا حصہ بھی اُن کے پاس رکھ دیا۔ آپ نے ان خربوزوں کے پاس اپنے سر کی پگڑی بھی اتار کر رکھ دی اور فرمایا۔ "میں ملک شرف الدین کا انتظار کروں گا۔ آپ اپنے حصوں کے خربوزے یہاں کھائیں یا گھر لے جائیں لیکن میں ملک شرف الدین کے ساتھ کھاؤں گا اور اسی وقت اپنی پگڑی بھی اپنے سر پر رکھوں گا۔"

صدرالدین نے پوچھا۔ "حضرت! آپ اپنی دستار کو کب تک اپنے سر پر نہیں رکھیں گے، ملک شرف الدین کا کیا بھروسا۔ نماز کے اوقات میں آپ کیا کریں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ایک معاملہ ہو گیا ہے، میں نے اپنے رب سے کہہ دیا ہے کہ تو میری دستار کا بھرم رکھ لے، اب دیکھنا یہ ہے کہ میرے رب کو میرا کتنا خیال ہے۔"

حاضرینِ مجلس حیران تھے کہ مولانا کو یہ کیا ہو گیا ہے، ملک شرف الدین کی اتنی جلدی رہائی ممکن ہی نہیں۔

آپ نے ملک شرف الدین کے ذکر کو ترک کیا اور اللہ کے نیک بندوں کی باتیں شروع کر دیں۔

ملک شرف الدین کا خادم پریشان تھا کہ مولانا نے اس کے آقا کو بھلا دیا اور دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس نے ذرا جرأت سے کام لیا، کہا۔ "حضرت! میرے آقا کا کیا ہو گا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں کیا جانوں کیا ہو گا۔ غیب کا علم خدا کو ہے، اُس سے پوچھ کہ تیرے آقا کا کیا ہو گا۔"

پھر آپ نے صبر کے فضائل بیان کیے۔ "لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ صبر کیا ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "صبر نام ہے اللہ کی دی ہوئی مصیبتوں کو سکون کے ساتھ برداشت کرنا اور کوئی گلہ نہ کرنا۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں صرف اتنے ہی معنی کافی نہیں ہیں۔ یاد رکھو دین کے جتنے مقامات ہیں اُن کی تنظیم تین امور سے ہوتی ہے۔ معارف، احوال اور اعمال۔ معارف (علوم) درخت ہیں۔ احوال اس کی شاخیں اور اعمال اس کا پھل ہیں۔ صبر کی تنظیم بھی انہی تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ صبر سے پہلے بہت سی چیزوں کا علم و یقین بہت ضروری ہے۔ اس علم سے استقلال اور مضبوط حالت پیدا ہوتی ہے۔ اس حالت کا پھل صبر ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھو کہ ایک شخص پر ظلم کیا گیا۔ مظلوم میں اتنی قوت ہے کہ وہ بدلہ لے لے، اگر اور کسی طرح نہیں تو وہ بددعا تو کر سکتا ہے مگر اس نے اپنے معاملے کو خدا پر چھوڑ کر صبر اختیار کیا۔ ایک شخص سے سب کچھ چھن گیا اور وہ بالکل تہی دست اور مفلوک الحال ہو گیا۔ اس افلاس اور تہی دستی نے اس کے دل کو مضطرب اور بے چین کر دیا مگر زبان پر لفظ صبر اور شکر کا وِرد جاری ہو گیا، کیا یہ صبر ہے؟ نہیں یہ نہ تو صبر ہے اور نہ شکر۔"

کسی نے پوچھا۔ "کیا صبر و شکر کا اطلاق جانوروں پر بھی ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں! فرشتوں اور جانوروں کو صبر کی تکلیف سے معاف رکھا گیا ہے لیکن انسان میں چونکہ ملکیت اور بہیمیت کو یکجا کر دیا گیا ہے اس لیے اسے بعض کاموں کا حکم دیا گیا ہے اور بعض سے منع کیا گیا ہے۔" پھر آپ نے اس کی یوں وضاحت فرمائی۔ "امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں صبر کی یوں وضاحت فرمائی ہے۔ اگر پیٹ اور شرم گاہ کو حرام اور مکروہ سے بچانے میں صبر ہو تو اس کا نام عفت ہے اور صحت، قوت اور فارغ البالی کی حالت میں صبر کا نام ضبطِ نفس ہے۔ اگر صبر جنگ اور مقاتلہ کی حالت میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے۔ اگر غیظ و غضب کی حالت میں صبر ہو۔ یعنی غصہ پی لیا جائے تو اس کا نام حلم ہے۔ اگر آفاتِ ارضی و سماوی کی حالت میں صبر کیا جائے تو اس کا نام سعۃ الصدر (کشادہ دلی) ہے۔ اگر کسی کے راز کو مخفی رکھنے میں صبر ہو تو اس کا نام کتمان السر (اخفائے راز) ہے۔ اگر مباحات اور غیر ضروری سامانِ عیش و عافیت سے صبر ہو تو اس کا نام زُہد ہے۔ اگر کم سامانِ زندگی پر صبر ہو تو اس کا نام قناعت ہے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ھوالصبر (ایمان صبر ہے)۔"

مجلس میں واہ وا، سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

آپ نے فرمایا۔ "رسول اللہ ﷺ کے مقام اور مرتبے سے کون واقف نہیں لیکن آپ ﷺ کے حلم اور انکسار کا یہ حال تھا کہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کے پاس لایا گیا۔ وہ آپ ﷺ کے رعب سے لرزہ براندام ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا۔ "اے شخص! تو سکون سے بیٹھ جا۔ تو مجھ سے خوفزدہ کیوں ہے؟ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قبیلہ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں اس عورت کا بیٹا جو دھوپ میں سوکھا ہوا نمکین گوشت کھایا کرتی تھی۔"

حاضرینِ مجلس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور بعض تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ مولانا بدرالدین اسحاق کی آواز بھی بھرا چکی تھی۔ آپ نے اپنی تقریر جاری رکھی، فرمایا۔ "ایک دوسرا واقعہ حضرت عمرؓ کا ہے۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ کو ایک دن اس حال میں دیکھا کہ مشک

آپ کی گردن میں پھنسی ہوئی تھی اور آپ لوگوں کو پانی دیتے پھر رہے تھے۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا "امیرالمومنین! یہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا "میرے نفس میں خود پسندی آگئی تھی اس لیے میں نے سوچا اسے ذلیل کیوں نہ کیا جائے۔"

فخرالدین آپ کی وعظ و تقریر میں گم ہوگیا۔ اس نے اپنے آقا ملک شرف الدین کو بھی بھلا دیا۔ آپ تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح بولتے رہے کہ اچانک ایک طرف سے "السلام علیکم یا حاضرینِ مجلس" کی صدا بلند ہوئی۔ لوگوں نے مڑ کر دیکھا تو مجلس میں ملک شرف الدین داخل ہو رہے تھے۔ شرف الدین کا خادم فخرالدین دوڑ کر اپنے آقا سے لپٹ گیا۔

مولانا بدرالدین اسحاق بھی ملک شرف الدین کو اپنی مجلس میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، فرمایا "شرف الدین! ادھر میرے پاس آؤ۔ میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

ملک شرف الدین آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

آپ نے پوچھا "وہ تیرے مقدمے اور قید کا کیا ہوا؟"

ملک شرف الدین نے جواب دیا "حضرت! مجھے زیادہ واقعات کا تو علم نہیں مگر لوگوں نے مجھے بتلایا کہ جب میں دیپال پور سے باہر کسی قید خانے کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو بادشاہ کو خلوت میں اس کے بعض با اثر مصاحبین نے یہ سمجھایا کہ شرف الدین کے حاسدوں نے جھوٹ بول کر اس کو معزول کرایا ہے ورنہ شرف الدین بہت اچھا آدمی ہے۔ بادشاہ کے دل پر مصاحبین کی باتوں کا اثر ہوا اور اس نے ایک دوسرا فرمان جاری کر دیا۔ "ملک شرف الدین کو اس کے عہدے پر بحال کیا جاتا ہے اور اس کی سزا معاف کی جاتی ہے۔"

کسی مصاحب نے ادب سے عرض کیا "حضور والا! جب ملک شرف الدین نے کوئی خطا کی ہی نہیں تو سزا کی معافی کیسی؟"

بادشاہ نے معافی کی جگہ لفظ موقوف لکھوا دیا۔

ملک شرف الدین نے کہا "بادشاہ کے گھڑسوار اس فرمان کے ساتھ میرے پاس پہنچے اور مجھے آزاد کرا دیا۔ میں آزاد ہوتے ہی اپنے گھر جانے کے بجائے سیدھا آپ کی خدمت میں چلا آیا۔"

آپ نے حاضرین سے فرمایا "کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں خربوزے ملک شرف الدین کے ساتھ کھاؤں گا اور اسی وقت اپنی اتری ہوئی دستار اپنے سر پر رکھوں گا۔"

آپ نے دستار دوبارہ اپنے سر پر رکھ لی اور ملک شرف الدین کے ساتھ خربوزے کھانے لگے۔

❖

اجودھن میں بابا فرید کی خانقاہ کے مطبخ کا بڑا خرچ تھا۔ اس کو ایک باضابطہ نظام کے تحت چلایا جاتا تھا۔ اس میں لکڑی کا بڑا صرفہ تھا۔ مریدین باری باری اجودھن کے آس پاس کے جنگلات جاتے اور لکڑیاں لایا کرتے تھے۔ مولانا بدرالدین اسحاق بھی اپنی باری پر یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ چنانچہ ایک دن جب آپ کی باری آئی تو بابا فرید کے دو صاحبزادے بھی آپ کے ساتھ چلنے پر مصر ہوئے۔ آپ نے انہیں ساتھ چلنے سے منع فرمایا۔ "اگر آپ دونوں ہمارے ساتھ چلیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی لیکن میں جنگل میں آپ دونوں کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

صاحبزادوں نے پوچھا "مگر کیوں؟ ہمارے ساتھ چلنے میں آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

آپ نے فرمایا "جنگلوں میں درندے ہوتے ہیں اس لیے میں آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے جا کر کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہتا۔"

لیکن دونوں صاحبزادگان کا ساتھ چلنے کا اصرار اپنی جگہ برقرار رہا۔ آپ مجبور ہوگئے اور دونوں کو اپنے ساتھ لے لیا۔

راستے میں ایک صاحبزادے نے مولانا سے کہا "حضرت! آپ تو باباکے مرید اور خلیفہ ہیں، ایک دور کے بزرگ سیدی احمد کے مریدوں میں یہ کرامت دیکھنے میں آئی کہ وہ شیر پر سوار ہو کر سانپ کو کوڑے کے طور پر استعمال کرتے تھے، کیا آپ میں ایسا کمال نہیں ہے؟"

مولانا بدرالدین اسحاق نے فرمایا "صاحبزادگان! آپ کو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

ایک نے پوچھا "کیوں؟ ہمیں اس طرح کیوں نہیں سوچنا چاہیے؟"

مولانا نے جواب دیا "اس لیے کہ کرامت اور خوارق عادات واقعات قابل توجہ نہیں بلکہ اولیاء اللہ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہوتی ہے کہ اتباع سنت اور شریعت میں کتنا کامیاب رہا۔"

آپ کی یہ بات دونوں صاحبزادگان کی سمجھ میں نہیں آئی، ایک نے کہا "وہ کس طرح؟"

آپ نے فرمایا۔" آپ دونوں نے حضرت جنید بغدادی کا نام تو سنا ہی ہوگا؟"
دونوں نے بیک ساتھ جواب دیا۔" ہاں، خوب سنا ہے، وہ سرخیلِ کاروانِ تصوّف تھے۔"
مولانا نے جواب دیا۔" انہی حضرت جنید بغدادی کی خانقاہ میں ایک شخص اس غرض سے آکر مقیم ہوا کہ وہ آپ کی کوئی کرامت دیکھے۔ حضرت جنید بغدادی کے مرید اس شخص کی غرض و غایتِ آمد سے لاعلم تھے۔ یہ شخص اپنا پورا خرچ آپ کرتا تھا۔ خانقاہ سے کچھ بھی نہ لیتا تھا۔ مریدوں نے پوچھا۔" کیا تم یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو؟"
اس نے جواب دیا۔" نہیں میں تعلیم حاصل کر چکا ہوں۔"
مریدوں نے پوچھا۔" تب پھر کیا تم علمِ تصوّف حاصل کرنا چاہتے ہو؟"
اس نے جواب دیا۔" مجھے یہ شوق بھی نہیں۔"
کئی ماہ کے قیام کے بعد جب وہ شخص جانے لگا تو حضرت جنید بغدادی کو اس بات کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔" عزیزِ من! تم اس خانقاہ میں کئی ماہ مقیم رہے، اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم نے خانقاہ کا کوئی احسان بھی نہیں لیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تم حصولِ تعلیم بھی نہیں چاہتے تھے اور اب اپنی آمد کا مقصد بتلائے بغیر واپس جا رہے ہو۔ کیا جانے سے پہلے تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم یہاں کیوں آئے تھے اور اب واپس کیوں جا رہے ہو؟"
اس شخص نے جواب دیا۔" حضرت! میں نے آپ کی بابت یہ سنا تھا کہ آپ بہت بزرگ آدمی ہیں۔ میں آپ کے پاس کئی ماہ اس لیے رہا کہ آپ سے کوئی کرامت صادر ہو اور میں دیکھوں مگر افسوس کہ میں مایوس واپس جا رہا ہوں۔"
جنید بغدادی نے پوچھا۔" اب میں تجھ سے کچھ پوچھوں گا کیا تو سچ بولے گا؟"
اس نے جواب دیا۔" میں سچا اور صاف گو انسان ہوں، آپ پوچھیں ان شاء اللہ میں سچ بولوں گا۔"
جنید بغدادی نے پوچھا۔" تم کئی ماہ سے قریب رہے، تم نے مجھے کوئی ایسا کام کرتے دیکھا جو سنت کے خلاف ہو؟"
اس نے جواب دیا۔" میں نے آپ کو کوئی ایسا کام کرتے نہیں دیکھا جو سنت اور شریعت کے خلاف ہو۔"
جنید بغدادی نے فرمایا۔" بھائی! تم اس سے بڑی اور کیا کرامت دیکھتے۔"
اس شخص نے پوچھا۔" سنت اور شریعت کا تعلق تو رسولِ مقبولﷺ سے ہے، پھر آپ کا سب سے بڑا معجزہ کیا ہوا؟"
جنید بغدادی نے جواب دیا۔" قول و فعل میں مطابقت۔ آپﷺ زندگی بھر اس معجزانہ عمل پر کاربند رہے۔"
اس شخص نے آپ کا فرطِ عقیدت سے ہاتھ چوم لیا۔ کہا۔" بیشک آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل درست ہے۔"
یہ واقعہ سنانے کے بعد مولانا بدرالدین اسحاق نے دونوں صاحبزادگان سے پوچھا۔" اب آپ دونوں مجھے یہ بتائیں کہ بابا فرید کی پوری زندگی سنت کے اتباع میں گزر رہی ہے یا نہیں؟"
دونوں نے جواب دیا۔" بیشک! بابا پوری طرح متبعِ سنت و شریعت ہیں۔"
مولانا بدرالدین اسحاق نے فارسی کا شعر پڑھا

بیرونِ قبر لافِ کرامت چہ میزنی! ایماں اگر بہ گور بری صد کرامت است

(قبر سے باہر کرامت کی ڈینگ کیا مارتا ہے؟ اگر تو قبر میں اپنے ساتھ ایمان لے جائے تو یہ سب سے بڑی کرامت ہے)
دونوں صاحبزادگان آپ کے اس جواب سے لاجواب ہو گئے۔
مولانا بدرالدین اسحاق نے مزید فرمایا۔" مخدوم زادوں کو اپنے والدِ محترم اور ان کے مریدوں کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ نہیں ہے، بھی ورنہ ایسی زبان سے ایسی باتیں نہ نکالتے۔"
اسی طرح باتیں کرتے ہوئے یہ تینوں جنگل میں داخل ہو گئے۔ مولانا بدرالدین اسحاق نے لکڑیاں توڑنا اور جمع کرنا شروع کر دیں۔ ابھی انہیں جنگل میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں مخدوم زادے چوکنا ہو کر آہٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن مولانا اپنے کام میں مشغول رہے۔ دونوں صاحبزادوں نے جھاڑیوں کے اندر سے ایک شیر کو نمودار ہوتے دیکھا۔ دونوں کی دہشت سے حالت ہی غیر ہو گئی۔ انہیں بچاؤ کا اور کوئی طریقہ تو سمجھ میں آیا نہیں، دونوں تیزی سے درخت پر چڑھ گئے۔ اور اوپر سے چیخ کر مولانا کو مطلع کیا۔" قبلہ استادِ محترم! مولانا! شیر۔ بھاگیے۔"
آپ نے اپنا کام چھوڑ کر شیر کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑا آپ کو گھور رہا تھا۔ آپ نے دونوں مخدوم زادوں کو آواز دی۔

"آپ دونوں نیچے آ جائیے۔ یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"
لیکن اُن دونوں کا ڈر سے بہت برا حال ہو چکا تھا، جواب دیا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! ہم تو آپ کی طرف سے خوفزدہ اور فکرمند ہو رہے ہیں۔"
مولانا شیر کے قریب چلے اور اپنی آستین اس کے منہ پر مار کے بولے۔ "یہ تجھے اس وقت کیا سوجھی جو میرے مخدوم زادوں کو خوفزدہ کر دیا۔ تو یہاں سے چپ چاپ چلا جا۔"
شیر کتے کی طرح دُم ہلانے لگا۔ دونوں صاحبزادگان حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپ نے اُن دونوں کو ایک بار پھر نیچے آنے کی ہدایت کی لیکن وہ نیچے نہیں آئے اور یہی کہتے رہے۔ "جب تک یہ شیر موجود ہے ہم نیچے نہیں اتریں گے۔"
آپ نے شیر کو غصّے میں مخاطب کیا اور کہنے لگے۔ "کیا تو نے نہیں سنا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جب تک تو یہاں موجود ہے دونوں مخدوم زادے نیچے نہیں اتریں گے اس لیے میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو یہاں سے دفعان ہو جا۔"
شیر پالتو کتے کی طرح کھڑا بدستور اپنی دم ہلا رہا تھا۔ جب آپ نے اس کو دفعان ہو جانے کا حکم دیا تو وہ جدھر سے آیا تھا، اسی طرف چلا گیا۔ اب آپ نے صاحبزادگان سے کہا۔ "شیر چلا گیا، اب تو آپ دونوں نیچے آ جائیں۔"
ان دونوں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ بمشکل نیچے اُترے اور آپ سے درخواست کی کہ اب جنگل میں رُکنے کی کوئی ضرورت نہیں، گھر واپس چلیے، ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔
مولانا نے فرمایا۔ "بظاہر تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن آپ کی اگر یہی مرضی ہے تو ہم گھر واپس چلے چلیں گے۔"
دونوں مخدوم زادے درخت سے اُترے اور آپ ان دونوں کو لے کر گھر واپس ہوئے۔ آپ کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا بھی رکھا ہوا تھا۔
دونوں مخدوم زادے اپنی بزدلی پر پشیمان تھے اور مولانا کی کرامت کے معترف ہو چکے تھے، راستے میں کہا۔ "مولانا! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اتنی بڑی کرامت کا ظہور آپ کی ذات سے بھی ہو سکتا ہے بہرحال ہم آئندہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں کریں گے۔"

❁

مولانا بدرالدین اسحاق کی صحبت میں جو لوگ بیٹھا کرتے تھے اُن میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ وہ جب بھی اجودھن جاتے مولانا کے پاس زیادہ رہتے۔
ایک دن مولانا کی صحبت میں کافی عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ آپ اپنے حجرے میں بیٹھے کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔ نمازِ مغرب کا وقت قریب آتا جا رہا تھا اور مولانا کے لکھنے پڑھنے کا انداز یہ بتاتا تھا کہ وہ جب تک اپنا خط پورا نہ لکھ لیں گے نمازِ مغرب کے لیے نہیں اٹھیں گے۔ آپ کے ایک مرید نے عرض کیا۔ "حضرت پیر و مرشد! مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"
آپ نے ایک دوسرے مرید سے فرمایا۔ "تو چھت پر چلا جا اور دیکھ کر بتا کہ آفتاب کیا کہتا ہے؟"
وہ مرید چھت پر چلا گیا اور واپس آ کر بتایا۔ "آفتاب غروب ہونے ہی والا ہے۔"
آپ نے بات سنی اَن سنی کر دی اور خط لکھنے میں مشغول رہے۔
کچھ دیر بعد ایک دوسرا مرید اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ "پیر و مرشد نماز کا وقت تنگ ہے یہ خط تو آپ بعد میں بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر مغرب کی نماز قضا ہو گئی تو؟"
آپ نے خط لکھتے لکھتے ایک مرید کو حکم دیا۔ "فرید! جا چھت پر چلا جا اور دیکھ کہ سورج کے غروب ہونے میں ابھی کتنی دیر ہے۔"
فرید نامی مرید چھت پر گیا اور واپس آ کر جواب دیا۔ "حضرت! آفتاب تو قریب الغروب ہے، اب وقت نہیں رہا۔"
آپ بدستور خط لکھتے رہے فرمایا۔ "میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ میں پورا خط لکھ کر ہی یہاں سے اٹھوں گا۔ اس سے پہلے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
شیخ نظام الدین اولیاء بھی بہت بے چین ہو رہے تھے، انہوں نے مولانا سے فرمایا۔ "مولانا! اب وقت نہیں رہا چلیے مغرب کی نماز ادا کیجیے اس کے بعد کوئی اور کام کیجیے۔"
مولانا نے اسی طمانیت سے جواب دیا۔ "اچھا چھت پر جا کے آفتاب کی حالت تو دیکھ لو، وہ کیا کہتا ہے۔"
نظام الدین اولیاء بھاگے بھاگے چھت پر گئے اور واپس آ کر جواب دیا۔ "مولانا اب وقت نہیں رہا چلیے فوراً مغرب کی نماز ادا کیجیے، اس کے بعد کوئی اور کام کیجیے۔"

مولانا نے جواب دیا "اگر سورج کو غروب ہونے کی اتنی ہی جلدی ہے تو وہ غروب ہو جائے لیکن میں نے اپنی بابت جو فیصلہ کیا ہے اس پر کاربند رہوں گا۔ میں جب تک اپنا خط پورا نہیں کر لوں گا نہیں اٹھوں گا۔"

حاضرین مجلس کا حال بہت برا ہو رہا تھا۔ آپ حسب معمول اپنے خط میں مشغول رہے کچھ دیر بعد جب آپ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو ایک مرید کو حکم دیا کہ جا چھت پر چلا جا اور آفتاب کی طرف دیکھ کر بتا کہ اب اس کے غروب ہونے میں کتنی دیر ہے؟

حاضرین کے منہ لٹکے ہوئے تھے، ایک نے مایوسی سے جواب دیا "پیر مرشد! اپنا تو خیال یہ ہے کہ نماز گئی، آفتاب غروب ہو چکا ہو گا آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ کتنا اندھیرا پھیل چکا ہے۔"

آپ نے حکم دیا "میں کیا کہہ رہا ہوں، جا چھت پر جا اور دیکھ کر بتا کہ ابھی آفتاب کے غروب ہونے میں اور کتنی دیر ہے؟"

مرید بے دلی سے چھت پر چلا گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آفتاب ابھی موجود تھا۔ وہ نیچے آیا اور اعلان کیا "پیر مرشد! آفتاب ابھی موجود ہے۔"

"آپ نے فرمایا "میں نہ کہتا تھا کہ جب تک میں اپنا صفحہ پورا نہ کر لوں گا، آفتاب غروب نہیں ہو گا۔"

آپ نے امامت فرمائی اور بقیہ نے اقتدا کی اور سب نے نماز مغرب ادا کی۔

❁

آپ کاموں میں بہت زیادہ مشغول تھے۔ اسی مشغولیت کے عالم میں بابا فرید نے آپ کو آواز دی "مولانا بدرالدین!"

مولانا اپنے شیخ کی آواز سن نہیں سکے اور بدستور اپنے کام میں مشغول رہے۔

بابا فرید نے دوبارہ آواز دی۔ "مولانا بدرالدین! ذرا میرے پاس تو آنا۔"

لیکن مولانا پھر نہ سن سکے۔

بابا فرید نے تیسری بار آواز دی "مولانا بدرالدین! یہ کیسی مصروفیت ہے کہ تم نے اپنے دل سے میرا خیال ہی نکال دیا۔"

اس بار مولانا نے آپ کی آواز سن لی۔ سارے کام چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ گئے اور خوشامدانہ عرض کیا "پیر مرشد! میں شرمندہ ہوں کہ آپ کی آواز نہیں سن سکا۔"

بابا فرید بہت دل برداشتہ تھے، فرمایا "تمہیں ایسا نہیں کرنا تھا۔"

مولانا نے درخواست کی "غلام معافی کا خواستگار ہے۔"

بابا فرید نے انہیں کوئی کام نہیں بتایا اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ مولانا ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے رہے۔ بابا فرید نے کچھ دیر بعد فرمایا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

لیکن یہ نہیں گئے۔ کچھ دیر بعد بابا نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پھر فرمایا "کیا تم نے سنا نہیں، اب تم جا سکتے ہو۔"

مولانا بابا فرید کے سامنے سے ہٹ گئے اور ملول اور افسردہ ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ آپ کئی دن تک اسی حال میں رہے اسی دوران دہلی سے خواجہ نظام الدین اجودھن پہنچے اور مولانا کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے فرمایا "مولانا! یہ عجیب بات ہے کہ جب میں کسی مشکل میں پھنس جاتا ہوں تو پہلے میں بابا فرید کو، اس کے بعد آپ کو وسیلہ بنا کر خدا سے رحم کی درخواست کرتا ہوں کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ میرے حق میں دعا فرماتے۔"

مولانا روہانسے ہو گئے، جواب دیا "بابا نظام! ان دنوں میں خود بڑی مشکل میں ہوں، مجھے پتہ نہیں کہ بابا فرید نے میری نعمت سلب کر لی یا میں اب بھی اسی مقام فیض پر فائز ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے بابا فرید کے پکارنے اور اپنے کام میں مشغول ہونے کا پورا واقعہ سنا دیا۔ فرمایا "بابا نظام! یہ ایسا دکھ ملا ہے جو جیتے جی کانٹے کی طرح دل میں چبھا رہے گا۔"

بابا خواجہ نظام الدین نے فرمایا "واہ مولانا محترم! وہ کتنی بڑی نعمت آپ کے پاس تھی جو سلب ہونے کے بعد بھی آپ میں اتنی موجود ہے۔"

بابا فرید کی مجلس میں ہم عصر بزرگان دین کے تذکرے ہو رہے تھے، خواجہ نظام الدین نے دوران ذکر ایک ایسے بزرگ کا قصہ سنایا جو اس وقت حیات نہیں تھے، ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ بابا فرید کے پاس مولانا بدرالدین اسحاق بھی تشریف فرما تھے۔

بابا فرید نے پوچھا "جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کی حالت کیا تھی؟"

حضرت محبوب الٰہی نے جواب دیا "پیر مرشد! کچھ نہ پوچھیے، ان کی وفات سے عبرت ہوئی۔"

بابا فرید نے پوچھا: "وفات کے وقت اُن کے نماز ادا کرنے کی کیا کیفیت تھی؟"

محبوبِ الٰہی نے جواب دیا: "وفات سے پہلے ان کی تین دن کی نمازیں قضا ہو گئی تھیں۔"

بابا فرید خاموش ہو گئے۔ لیکن مولانا بدرالدین اسحاق نے فرمایا: "یہ اچھا نہیں ہوا۔"

محبوبِ الٰہی کا خیال تھا کہ بابا فرید اس خبر پر کوئی تبصرہ کریں گے لیکن وہ خاموش رہے۔

اسی دوران بابا فرید بیمار پڑ گئے۔ ان کے پہلو اور جوڑوں میں شدید درد اٹھنے لگا تھا۔ مولانا بدرالدین ہر وقت آپ کے پاس موجود رہتے۔ پھر جب آپ پر غشی طاری ہونے لگی تو مریدوں اور ارادت مندوں میں کہرام مچ گیا۔ اسی تکلیف کے عالم میں بابا فرید نے نمازِ عشا ادا کی اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو حاضرین سے پوچھا: "کیا میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟"

مولانا بدرالدین نے جواب دیا: "جی پیر مرشد! آپ نے ابھی بے ہوش ہونے سے پہلے ہی نمازِ عشا ادا فرمائی ہے۔"

بابا فرید نے فرمایا: "لیکن میں ایک بار پھر نمازِ عشا ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اور آپ نے ایک بار پھر نمازِ عشا ادا فرمائی اور پھر بے ہوش ہو گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد آپ نے حاضرینِ صحبت سے پوچھا: "کیا میں نے نمازِ عشا پڑھ لی ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا: "ایک بار نہیں، آپ نے دو بار عشا کی نماز ادا فرمائی ہے۔"

بابا فرید نے فرمایا: "لیکن میں ایک بار پھر نمازِ عشا ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اور آپ تیسری بار نمازِ عشا ادا فرمانے لگے۔ اسی عالم میں آپ کا وصال ہو گیا۔

بابا فرید کی جگہ اُن کے صاحبزادے شیخ بدرالدین سلیمان نے سنبھالی اور مولانا بدرالدین اسحاق ان کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

لیکن اب بابا فرید جیسی بات نہیں رہی تھی۔ شیخ بدرالدین سلیمان کے آس پاس جو لوگ رہنے لگے تھے، انھیں مولانا سے حسد تھا۔ وہ مخدوم زادے کو ہر وقت ورغلاتے رہتے تھے۔

ایک خوشامدی مرید نے شیخ سلیمان کو مشورہ دیا: "پیر مرشد! بابا فرید تو اب ہم میں موجود نہیں، جن لوگوں نے ان کی خدمت کی ہے، اب انہیں آرام کرنا چاہیے کیونکہ وہ زمانہ کچھ اور تھا اور یہ زمانہ کچھ اور ہے۔"

مخدوم زادے شیخ سلیمان نے پوچھا: "تمھارا یہ اشارہ کس طرف ہے؟"

مرید نے مولانا کی طرف اشارہ کیا: "مثلاً یہ مولانا۔ ان کی عمر اور آپ کی عمر میں خاصا فرق ہے، یہ جب ہاتھ باندھ کر آپ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔"

شیخ سلیمان نے اس وقت تو سکوت اختیار کیا لیکن مرید کی بات دل میں بیٹھ گئی۔

اسی طرح ایک دُوسرے مرید نے شیخ سلیمان سے کہا: "پیر مرشد! مولانا سے فرما دیجئے کہ اب آرام فرمائیں، آپ کے مرید آپ کی خدمت کو کیا کم ہیں؟"

مخدوم زادے شیخ سلیمان نے جواب دیا: "میں کسی مناسب موقع پر مولانا کو منع کر دوں گا۔"

چنانچہ ایک دن شیخ سلیمان نے مولانا بدرالدین اسحاق سے کہا: "مولانا! میرا خیال ہے اب آپ پوری طرح رجوع الی اللہ ہو جائیں۔"

مولانا کا دِل دھک سے رہ گیا، پوچھا: "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی صحبت سے چلا جاؤں؟"

شیخ سلیمان نے جواب دیا: "ہاں، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اس مجلس سے دور ہوں لیکن میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کو آرام اور اپنے کاموں کا وقت نہیں ملتا۔"

مولانا بدرالدین اسحاق وہاں سے چلے آئے اور بابا فرید کے ایک نامی گرامی ذی علم مرید سیّد محمد کرمانی سے مشورہ پوچھا: "ان حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟"

سید محمد کرمانی نے جواب دیا: "بابا! جس مجلس میں انسان کی قدر نہ ہو اس سے تنہائی بہتر ہے۔"

مولانا نے سید کرمانی کا مشورہ قبول کر لیا اور اجودھن کی قدیم جامع مسجد چلے گئے۔

جب اس تلخی کی اطلاع حضرت محبوبِ الٰہی کو پہنچائی گئی تو آپ نے فرمایا: "حالانکہ میں نے مولانا کا اتنا احترام کیا ہے کہ میں اُن کی زندگی میں کسی کو اپنا مرید نہیں بنا سکتا۔"

مولانا کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ اُن کی نظم تصریفِ بدری بہت مشہور ہے، اس کے بعض اشعار بہت پُر اثر ہیں۔

الیٰ بسطت یدی الیک یا الٰہی ویسیل سیل الدمع من ماٰقی

(اے اللہ میں اپنے دونوں ہاتھ تیری طرف پھیلا رہا ہوں۔ اور میرے گوشۂ چشم سے آنسو رواں ہیں)

پوری نظم عربی میں ہے، اس کے چند اشعار کا ترجمہ :

"میرے دل کی مشغولیتوں کو دیکھ اور میری سختیوں کو دیکھ، اے وہ جو عالم کے عیب چھپانے والا ہے۔

جن مصیبتوں کی امید نہیں رکھتا تھا ان سے آزمایا گیا ہوں۔ خدایا مجھے ان مصیبتوں سے نجات دے کہ میرے پاس ان کا کوئی علاج نہیں

اس زمانے میں دین یا تو کم ہو چکا ہے یا بالکل ہی رخصت ہو۔گیا، کیونکہ میں اخلاق کی جگہ نفاق دیکھتا ہوں۔

آج کل ظاہری اور پوشیدہ دشمنی کا دور دورہ ہے اس سے اس زمانے کے دوست اور دشمن کا اندازہ کرو۔

عیش و آرام میں وہ ہے جو بے دینی اختیار کرے۔ یہ فسق اور مکاری کے دن ہیں۔

اس دور کے وہ حاکم جن کے ذمے عدل و انصاف ہے لوگوں کا گوشت کھا رہے ہیں اور درندوں کی طرح انسانوں کی تکا بوٹی کر رہے ہیں۔

مصیبتوں کے خوف اور جلانے والوں کے دور نے عقلمندوں کو کمیاب کر دیا ہے۔

❋

جب مولانا کا آخری وقت آیا تو آپ نے اللہ سے اور زیادہ لو لگائی۔ آپ کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ مریدوں نے مشورہ دیا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو طبیب کو بلوا لیا جائے۔"

مولانا نے فرمایا: "نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔"

پوری رات بے چینی میں گزارنے کے بعد فجر کی نماز آپ نے باجماعت ادا کی اور اپنے معمول کے اوراد اور وظائف پورے کیے پھر اشراق کا وقت آیا تو اشراق کی نماز پڑھی اور اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔

کچھ دیر بعد آپ نے پوچھا: "کیا چاشت کا وقت ہو گیا ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا: "ہو گیا۔"

آپ چاشت کی نماز پڑھنے لگے۔

لوگوں نے آپ کو سجدے میں جاتے تو دیکھا لیکن سجدے سے سر اٹھاتے نہیں دیکھا۔ لوگوں کو تشویش ہوئی اور انہوں نے آگے بڑھ کر آپ کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر انہیں سجدے کی حالت سے اٹھایا گیا تو پتہ چلا کہ آپ واصل بحق ہو چکے ہیں۔ آپ کے مرید اور ارادت مند رونے لگے۔

مولانا کی وفات پر حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا: "میں نے مولانا کے احترام میں آج تک کسی کو بیعت نہیں کیا تھا لیکن اب بیعت کروں گا۔" پھر آپ نے ان بزرگ کا قصہ دہرایا جن کے آخری ایام میں تین دن کی نمازیں قضا ہو گئی تھیں۔ حضرت محبوب الٰہی نے کہا: "جب میں نے یہ افسوسناک واقعہ بابا فرید کے سامنے بیان کیا تھا تو بابا فرید خاموش رہے تھے مگر مولانا نے فرمایا تھا: "یہ اچھا نہیں ہوا۔" مولانا کے آخری لمحات جس طرح خدا کی حضوری میں گزرے، ان سے اندازہ ہوا کہ یہ بات مولانا ہی کہہ سکتے تھے۔"

آپ کو اجودھن (پاک پٹن) کی جامع مسجد قدیم میں دفن کیا گیا۔ کیونکہ آپ نے اسی مسجد میں اپنی زندگی کا بڑا وقت گزارا تھا۔ اللہ کے عشق اور خشیت میں سب سے زیادہ رونے والا اللہ کے گھر میں رہا اور اللہ سے راز و نیاز کی حالت میں اپنی جان دے دی۔ آپ کی وفات پر سید محمد کرمانی کے پوتے سید محمد مبارک علوی کرمانی نے اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مردانِ خدائے تعالیٰ مرتے دم تک عبادتِ الٰہی میں اس سے توفیق استقامت حاصل کرتے ہیں اور اپنے پیرووں کی رہنمائی میں اس بلند مقام کو پہنچتے ہیں کہ ان کا شہرہ قیامت تک باقی رہتا ہے۔"

❋❋❋

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی

اخبار الاخیار	سیر الاولیا	سیر العارفین	فوائد الفواد	گلزار ابرار
عبدالحق محدث دہلوی	میر خورد	حامد بن فضل اللہ جمالی	خواجہ حسن سنجری	محمد غوثی شطاری

تاریخ کی دو اہم شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی تحریر

تاریخ بے شمار یادگار واقعات اور شخصیات کے رنگوں سے سجی ہوئی ہے... یہ اور بات کہ قلم کار کی نظر کس گوشے پر ٹھہرتی ہے۔ ان ہی بے شمار رنگوں میں سے تاریخ کا ایک دلکش رنگ حاضر ہے۔ جلال الدین رومیؒ اپنے پیر و مرشد شمس تبریزؒ اور اپنی تخلیق مثنوی کے حوالے سے شہرت دوام کے مالک ہیں... اس سے قبل وہ کن حالات کا شکار تھے اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مثلاً شمس تبریزؒ کون تھے اور مولانا رومیؒ سے کیسے متعارف ہوئے...

کشمکش، جدائی...

اور پھر شمس تبریزؒ کی دیوانہ وار جستجو کی تفصیلات پڑھ کر احساس ہوگا کہ اگر مولانا کی ملاقات شمس تبریزؒ سے نہ ہوتی تو دنیا ان کی لافانی تخلیق "مثنوی" سے شاید محروم رہتی... بقول مصنف "یہ مضمون جہاں معلومات افزا ہے وہیں بعض مقامات اختلافی بھی ہوسکتے ہیں مگر مجھے ہے حکم اذاں...



مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ

اور

شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی

چھ ربیع الاوّل 604 ہجری کو پیدا ہونے والا بہاؤالدین ولد کے بیٹے جلال الدین کی عمر اپنے باپ کے انتقال کے وقت ہجری ماہ و سال کے اعتبار سے چوبیس سال تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری بہاؤالدین ولد کے مرید خاص سید برہان الدین محقق ترمذی نے تقریباً چار پانچ سال تک انجام دی لیکن جب بہاؤالدین ولد نے بلخ کو چھوڑ دینے کا قصد کیا تو محقق ترمذی نے ان کے اس سفر میں ان کا ساتھ نہیں دیا اور اپنے وطن ترمذ واپس چلے گئے مگر جب

628ہجری میں بہاؤالدین ولد کا انتقال ہو گیا اور یہ خبر محقق ترمذی تک پہنچی تو انہوں نے ترمذ سے قونیہ کا سفر کیا اور ان کے پرانے شاگرد جلال الدین نے پھر سے ان کی مریدی اختیار کی اور جلال الدین جو اب مولانا رومی کہلاتے تھے محقق ترمذی سے فیض حاصل کرنے لگے لیکن مولانا جلال الدین رومی اب بذاتِ خود اتنا اعلیٰ مقام حاصل کر چکے تھے کہ ان سے بھی لوگ فیض پانے لگے تھے۔ محقق ترمذی کی شاگردی اور مریدی کے باوجود جلال الدین نے مزید تحصیلِ علوم کے لیے شام کا سفر اختیار کیا۔ حلب پہنچے تو یہاں صلاح الدین ایوبی کے بیٹے الملک الظاہر کے ذریعے بہاؤالدین ابن شداد سے ملاقات ہوئی۔ یہ وہاں کے جلیل القدر علما میں نمایاں مقام رکھتے تھے جن کے تعاون سے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے گئے تھے اور حلب دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا۔

یہاں کا مدرسہ حلاویہ بڑی شہرت رکھتا تھا۔ مولانا نے اسی مدرسے میں قیام کیا اور تحصیلِ علوم میں مشغول ہو گئے۔ یہاں کمال الدین ابن العدیم سے درس لیتے رہے۔

قاضی بہاؤالدین ابن شداد نے صلاح الدین ایوبی کی رفاقت میں ایک زمانہ گزارا تھا۔ انہیں صلاح الدین کے سیکریٹری کی حیثیت بھی حاصل رہی تھی اور صلاح الدین کے بارے میں بہت سی معلومات پہنچانے کا ذریعہ بھی یہی تھے۔ انہوں نے مولانا میں غیر معمولی صلاحیتیں محسوس کرلی تھیں۔ تب ہی انہوں نے حلب کے دوران قیام میں مولانا کی بڑی مدد کی لیکن مولانا رومی کی طبیعت میں قرار نہیں تھا۔ تب ہی حلب میں کچھ وقت گزار کے دمشق چلے گئے۔ وہ دمشق میں مدرسۂ مقدسیہ بڑی شہرت رکھتا تھا۔ مولانا نے بھی اسی مدرسے میں قیام کیا۔ ان دنوں دمشق میں علما کا ایک مجمع موجود تھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی اور انہی جیسے کئی دوسرے نامی گرامی عالم اور صوفی دمشق میں موجود تھے اور یہ سب مولانا رومی کے ہم صحبت رہے اور جب یہ سب یکجا ہو جاتے اور حقائق و معارف پر گفتگو چھڑتی تو گھنٹوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔ دمشق کے سارے علما اور صوفی مولانا رومی کی علمیت اور عقلیت کے قائل ہو چکے تھے۔ اگرچہ اس وقت بھی مولانا میں دنیاوی جاہ و جلال کا عنصر موجود تھا اور زندگی پُرتکلف گزر رہی تھی۔ نوکر چاکر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ مولانا رومی ان سے اسی طرح کام لیتے تھے جس طرح دنیادار علما اپنے نوکر چاکروں سے خدمت لیتے ہیں۔

صوفیوں کو مولانا کی اس روش سے اختلاف تھا کیونکہ یہ لوگ قناعت پسندی کے قائل تھے اور دنیاوی تکلفات سے پرہیز کرتے تھے۔

دمشق میں کئی سال گزارنے کے بعد مولانا رومی نے قونیہ واپسی اختیار کی اور یہاں مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

637ہجری میں محقق ترمذی کا بھی انتقال ہو گیا اور مولانا رومی کو یہ مفارقت بہت گراں گزری۔ مہینوں بہت اداس رہے لیکن یہ ابھی تک تصوف سے بہت دور تھے اور علمائے وقت کی طرح شان و شوکت سے زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ اپنے طلبا سے بھی تکلفانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے اور اپنے درمیان ایک فاصلہ رکھنے کے قائل تھے۔

مولانا رومی جب چلتے تھے تو ان کے پیچھے پیچھے نوکر چاکر بھی ہوتے تھے۔ تقریباً چار سو طالب علم ان کی شاگردی میں تھے۔ ان کے علاوہ حکومت وقت کی طرف سے جو فتوے ان سے لیے جاتے تھے اس کا معقول معاوضہ بھی انہیں مل جاتا تھا، اس لیے فکرِ معاش سے بھی انہیں نجات ملی ہوئی تھی۔

یکا یک قونیہ میں مشرق سے علما کا ایک ریلا آیا۔ معلوم ہوا کہ تاتاریوں نے جو تباہی مچا رکھی تھی یہ علما اسی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے قونیہ کو محفوظ جگہ سمجھتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے قونیہ علما کا مرکز بن گیا۔

اسی دوران محی الدین ابن عربی کا انتقال ہو گیا اور ان کے مرید اور ارادت مند بھی قونیہ پہنچ گئے۔

ان دنوں مولانا رومی سب سے بے نیاز اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ اپنے والد کی طرح لوگوں کے مجمعے کے سامنے وعظ کہتے تھے اور سننے والوں سے انہیں جو داد ملتی تھی اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ حکومت کی طرف سے فتوے بھی ان ہی سے لیے جاتے تھے اور ہر فتوے کا انہیں ایک دینار مل جاتا تھا۔

مولانا رومی اس میں اتنے مستعد اور کارگزار تھے کہ طبیعت کی خرابی یا دوسرا کوئی مسئلہ ان کے اس کام میں رخنہ نہیں ڈال سکتا تھا۔

مولانا کو دوسرے علما کے مقابل جب برتری حاصل ہوتی تھی تو یہ بہت خوشی اور فخر محسوس کرتے تھے۔ نوکر چاکر ان کے کام نہایت سلیقے اور ادب سے انجام دیتے تھے کسی میں بھی اتنی ہمت یا جرأت نہیں تھی کہ وہ آپ کے معمولات کو ادھر سے ادھر کر دیتا۔

جو طلبا ان سے درس لیتے، وہ بھی مولانا رومی سے بہت مرعوب رہتے تھے اور کوئی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔

مولانا رومی کو اپنے والد بہاؤالدین ولد کی وجہ سے بھی شہرت اور عزت حاصل تھی۔ ان کے والد سلطان العلما کے

لقب سے مشہور تھے۔ ایک بار انہوں نے خوارزم شاہ سے بھی ٹکر لی تھی اور اس کا بھی شہرہ تھا گویا مولانا رومی کو اس شہرت سے بھی عزت مل رہی تھی۔

لیکن وہ دور صوفیوں کا تھا اور عالموں سے زیادہ صوفیوں کے اردگرد لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوتا تھا۔

مولانا رومی صوفیوں سے ملتے جلتے رہے لیکن کسی صوفی نے مولانا رومی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا اور مولانا علم وفضل کو تصوف پر ترجیح دیتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حسن بن صباح نے ایران کے مغربی حصوں میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی اور اس کے جانشینوں نے نہایت ہوشیاری اور تشدد کی حکمت عملی سے مسلمان علما اور حکمرانوں کو لرزہ براندام کررکھا تھا۔ ان لوگوں نے ظاہری اور باطنی کا چکر چلا کر اسلامی عقائد پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ بڑے بڑے شک وشبہے میں پڑ گئے تھے۔

ان لوگوں نے اسلامی عقائد معمولات اور اصطلاحات میں باطنی کا دم چھلا لگا کے مسلمانوں کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ان کے مقرر اور خطیب اپنے سامعین کو بہت جلد مرعوب بلکہ مسحور کرلیتے تھے۔

حسن بن صباح کے جانشینوں میں کیا بزرگ کا نام بھی آتا ہے۔ کیا بزرگ کے کارندے نہایت ہوشیاری و چالاکی سے لوگوں میں تبلیغی فرائض انجام دیتے تھے اور متاثر ہوجانے والوں کو اپنے مسلک میں شامل کرلیتے تھے۔ ان کے فدائی دوسرا کام کرتے تھے جو اسلامی علمی شخصیات ان باغیوں کے خلاف سرگرم عمل ہوتی تھیں اور اپنے وعظ، تقریروں اور خطبوں میں ان باطنیوں کی مخالفت کرتے تھے۔ حسن بن صباح کے جانشین اپنے فدائیوں کے ذریعے ان مخالف علما کا کام تمام کردیتے تھے۔ ان کے ذریعے حکمرانوں کو بھی ٹھکانے لگایا گیا اور جو ان کی قتل وغارت گری سے محفوظ رہے انہیں مختلف طریقوں سے اتنا خوفزدہ کردیا گیا کہ ان میں ان باطنیوں کے خلاف کارروائی کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔

صلاح الدین ایوبی کو بھی ان لوگوں نے خوفزدہ کیا، ملک شاہ سلجوق کو بھی خوفزدہ کیا گیا، نظام الملک طوسی کو ایک فدائی نے قتل کردیا۔ ایسے ماحول میں بھی مولانا رومی درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اگرچہ مولانا کو ان باطنیوں کا علم تو تھا لیکن ان سے اب تک ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

حسن بن صباح کے انہی جانشینوں میں کیا بزرگ بھی تھے۔ ان کی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک شخص محمد بن علی بن ملک داد بھی تھا۔ اس شخص نے اپنے نام کے بجائے لقب ”شمس تبریز“ سے اتنی شہرت حاصل کی کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے۔

شمس تبریز کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لوگ ان کے نسب کو گمنام قرار دیتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ کہ وہ کیا بزرگ امید کی نسل سے ہیں لوگ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے بارے میں لوگوں کی معلومات ناقص تھیں اور سنی سنائی باتوں پر لوگ زیادہ توجہ دیتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ شمس تبریز کہاں سے آئے۔ کہاں سے تعلیم حاصل کی۔ ان کا استاد کون تھا۔ بس اگر کچھ جانتے تھے تو اتنا کہ ان کا تعلق باطنیوں سے ہے اور حسن بن صباح ان کے جداعلیٰ میں سے تھا۔

شمس تبریز کہیں کسی جگہ مستقل قیام کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بس کسی چھلاوے کے مانند مستقل حرکت میں رہتا تھا۔ یہ شخص گھومتا پھرتا قونیہ میں داخل ہوگیا۔

شمس تبریز کے بارے میں جو تحقیق ہوئی ہے، وہ بھی ناقابل یقین ہے۔ لکھنے والوں نے بھی ان معلومات پر بے اطمینانی ظاہر کی ہے لیکن اس سلسلے کی تمام روایات کو نقل ضرور کردیا گیا ہے۔ انہی روایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شمس تبریز بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبہ عشق ومحبت کے حامل تھے۔

شمس تبریز ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچے تھے کہ ان پر رسول مقبول ﷺ کے عشق نے غلبہ کیا۔ لوگوں نے انہیں پریشان خاطر دیکھا مگر انہیں اس کی کوئی وجہ بظاہر نظر نہیں آئی۔ لوگوں نے ان کی نگرانی کی اور ان کے معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ جو لوگ ان کی گھریلو زندگی کا علم رکھتے تھے اور انہیں قریب سے جانتے تھے انہوں نے شمس تبریز کو چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت بھی کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ وہ متعجب تھے کہ وہ زندہ کس طرح ہے۔

اس کیفیت کا علم جسے بھی ہوا اس نے یہ بات دوسروں تک پہنچادی اور اس طرح آس پاس کے لوگوں کو شمس تبریز کی ذات میں دلچسپی پیدا ہوئی اور جگہ جگہ یہی ذکر ہونے لگا کہ شمس تبریز کئی ہفتوں سے نہ تو کچھ کھا رہے ہیں اور نہ کچھ پیتے ہیں۔ سننے والے ایک دوسرے کا منہ حیرت سے تکتے اور پوچھتے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص ہفتوں کچھ کھائے پیے بغیر نہ صرف زندہ بلکہ توانا بھی رہے۔ جن لوگوں کو ان باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا انہوں نے شمس تبریز کے گھریلو قریبی لوگوں سے کہا کہ وہ شب وروز شمس تبریز کے ساتھ سائے کی طرح لگے

رہیں اور دیکھیں کہ کہیں وہ چھپ کر تو نہیں کھاتے پیتے ہیں۔

جو شخص ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا اس نے ایک ہفتے کی تگ و دو کے بعد دوسروں کو بتایا کہ واقعی شمس تبریز سے متعلق مشہور یہ روایت درست ہے کہ شمس تبریز ہفتوں سے نہ تو کچھ کھا رہے ہیں اور نہ کچھ پیتے ہیں۔

شمس تبریز کو بھی اس شخص کی ان سے متعلق جستجو کا علم تھا، چنانچہ چالیس دن کے بعد شمس تبریز نے اس شخص سے پوچھا۔ ''تو میرا پیچھا کیوں کرتا رہتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ کس وقت کھاتے پیتے ہیں بس میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔''

شمس تبریز نے کیفیت استغراق میں جواب دیا۔ ''میں آنحضرت ﷺ کے عشق میں سب کچھ بھلا چکا ہوں اور مجھے کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔''

اس جستجو کرنے والے نے کہا۔ ''حضرت! آپ کا جواب میرے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے ناقابل اعتبار اور غیر اطمینان بخش ہے۔ اگر آپ چالیس دن سے نہ تو کچھ کھا رہے ہیں اور نہ کچھ پی رہے ہیں، اس کے باوجود آپ کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ ہم یہ کس طرح مان لیں کہ انسان کچھ کھائے پیے بغیر چالیس دن تک زندہ اور صحت مند و توانا رہ سکتا ہے۔''

شمس تبریز نے جواب دیا۔ ''یہ عشق و محبت کی باتیں ہیں، دنیا داروں کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اپنے لیے دعا کرو کہ خدا تمہیں بھی عشق کی دولت سے سرفراز کرے، تمہیں میری جستجو نہیں کرنا پڑے گی۔''

جب یہ بات دوسروں تک پہنچی تو لوگوں نے شمس تبریز کی باتوں پر یقین کر لیا اور ان کے عشق حقیقی پر بھی ایمان لے آئے۔ یہ بات دور دور تک مشہور ہو گئی کہ شمس تبریز عشق محمدی ﷺ میں اتنے سرشار رہتے ہیں کہ تیس تیس، چالیس چالیس دن تک نہ تو کچھ کھاتے ہیں اور نہ کچھ پیتے ہیں۔ انہیں توانائی اور زندگی عشق محمدی ﷺ کے طفیل ملی ہوئی ہے۔ خوش عقیدہ لوگوں نے ان پر یقین کر لیا اور آج تک ان روایتوں پر یقین کیا جا رہا ہے۔

سوانح نگاروں کے مطابق شمس تبریز اپنے ذاتی کمالات کو راز میں رکھتے تھے اور کسی پر اپنی شخصیت کے اس رخ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔

بظاہر کوئی خاص ذریعہ آمدنی بھی نہیں تھا۔ بس اتنا بتایا گیا ہے کہ یہ ازار بند تیار کرتے تھے اور انہیں فروخت کر کے اپنی روزی روٹی کا انتظام کرتے تھے۔

انہیں سیر و سیاحت کا بھی بے حد شوق تھا جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کسی صاحب دل اور صاحب حال کی تلاش میں تھے جو انہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ اجنبی شہروں میں جاتے اور سرائے میں قیام کرتے۔

ضرورتاً باہر نکلتے تو اپنی کوٹھری کے باہر دروازے میں ایک مضبوط اور بھاری تالا لگا دیتے۔ لوگوں کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہی شبہ ہوتا کہ یہ کوئی بہت بڑا تاجر ہے اور اپنے قیمتی سامان کی حفاظت کے لیے تالا لگا کے بازار جاتا ہے۔

ان کی اس پُراسرار زندگی اور معمولات سے دوسرے شہروں میں بھی لوگوں کو یہ جاننے کی جستجو ہوئی کہ آخر یہ شخص کام کیا کرتا ہے اور اگر یہ کوئی بہت بڑا تاجر ہے تو اس کے دوسرے بڑے تاجروں سے اس طرح تعلقات کیوں نہیں ہیں اور یہ سب ہی سے الگ تھلگ کیوں رہتا ہے۔ نئے شہروں میں بھی ان کے پیچھے جستجو کرنے والے لوگ لگ گئے اور ان کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور سرائے سے نکل کر بازاروں میں جانے کی نگرانی شروع کر دی۔

انہیں بساطیوں کی دکانوں پر آتے جاتے دیکھا گیا، جس سے ان کے پیچھے لگ جانے والوں کو اتنا تو معلوم ہو گیا کہ بساطیوں کی دکان سے تعلق رکھنے والا بہت بڑا کاروباری نہیں ہو سکتا۔

شمس تبریز جب بساطی کی دکان سے اٹھ کر کہیں جاتے تو ان کی نگرانی کرنے والے لوگ بساطی سے پوچھ گچھ شروع کر دیتے۔ ''یہ شخص جو ابھی ابھی یہاں آیا تھا اور تجھ سے غالباً کاروباری باتیں کر رہا تھا یہ کون ہے؟''

بساطی جواب دیتا۔ ''یہ پردیسی کہیں سے آیا ہوا ہے۔ ازار بند تیار کرتا ہے وہ انہی کا سودا کرنے یہاں آیا تھا۔''

ایک اور ساتھی نے کہا۔ ''تو جھوٹا ہے بات کچھ اور ہے کیونکہ یہ پردیسی جس سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے وہاں اپنے پیچھے کوٹھری میں بہت بڑا تالا لگا کے نکلتا ہے اور لوگوں کا اس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا سوداگر ہے اور اس کی کوٹھری میں بہت قیمتی سامان موجود ہے۔''

بساطی نے جواب دیا۔ ''جناب! مجھے تو اس شخص کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات نہیں ہے کہ یہ ازار بند تیار کر کے ہم بساطیوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اب اگر یہ تم لوگوں کے بقول کوئی بہت بڑا سوداگر ہے اور اس کی کوٹھری میں بہت قیمتی سامان موجود ہے تو تم لوگ یہ جو کچھ مجھ سے پوچھ رہے ہو سرائے میں اس کے پاس جا کے خود ساری معلومات حاصل

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک مکاتب غلام تھا۔ کسی نے عرض کیا۔
"آپ کا یہ غلام کفن چور ہے۔ کفن چرا کر فروخت کرتا ہے اور اسی کی قیمت یا آپ کو دے رہا ہے۔"
حضرت کو اس بات کا بہت ملال ہوا۔ غلام کا قاعدہ تھا کہ رات بھر غائب رہتا اور صبح کے بعد گھر آجاتا تھا۔ حضرت نے تفتیشِ حال کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس روز شب کو جب وہ گھر سے چلا تو آپ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ غلام ایک قبرستان میں گیا اور ایک قبر کے سرہانے نماز پڑھنے لگا۔ تمام رات اسی طرح عبادت میں بسر کی۔ اس کے بعد حضرت نے دیکھا کہ غلام اپنا وہی ٹاٹ اوڑھے ہوئے اور اپنی پیشانی زمین پر رگڑ رہا ہے پھر جب صبح کا وقت آیا تو غلام قبرستان سے مسجد میں آیا۔ فریضہ فجر ادا کیا اور پھر دعا مانگی۔ "خداوند مجازی کے لیے کچھ عطا کر۔" اس دعا کے ساتھ ہی ایک ابر کا ٹکڑا آسمان سے زمین پر اترا اور غلام کے ہاتھ میں ایک درہم آگیا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عبداللہ بن مبارک سے ضبط نہ ہوسکا۔ فوراً آگے بڑھے اور غلام کا سر اپنی گود میں لے کر بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگے۔ "کاش میں غلام ہوتا اور تم مالک ہوتے۔"
غلام نے جب یہ حال دیکھا تو جناب باری میں عرض کیا۔ "میرے مولا کریم میرا راز اب فاش ہوگیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں دنیا میں کسی فتنہ و فساد کا باعث بن جاؤں۔ بس اے میرے خدا اب مجھے موت دیدے۔" غلام کی یہ دعا فوراً قبول ہوگئی اور غلام کا سر ابھی حضرت کی آغوش میں ہی تھا کہ وہ راہی ملک بقا ہوگیا۔
حنا عروج کا قلمی تعاون کراچی

کرلو۔"
بساطی کا جواب بالکل درست تھا۔ لیکن کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس گمنام شخص سے اس کی حقیقت معلوم کرے کیونکہ جو شخص اتنا پُراسرار ہو کہ کسی سے ملنا جلنا ہی پسند نہ کرتا ہو وہ اپنے بارے میں اتنی تفصیل کیوں کر بتائے گا۔"
ان کے بارے میں یہ حقیقت تو علم میں آہی گئی تھی کہ بساطیوں کی دکانوں سے پیشہ ورانہ تعلق رکھنے والا کوئی بہت بڑا تاجر نہیں ہوسکتا۔ بڑے تاجر ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں جبکہ شمس تبریز نامی یہ شخص سب سے الگ تھلگ پُراسرار زندگی اپنائے ہوئے ہے۔ اپنی طرزِ زندگی اور معمولات کے اعتبار سے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ شخص کسی کو تلاش کررہا ہو۔ اسی لیے اس کا کوئی مستقل ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کا رخ کرتا ہے اور سرائے میں قیام کرتا ہے۔ کسی بھی شہر میں اس کا نہ تو کوئی دوست ہوتا ہے اور نہ عزیز رشتے دار۔ اس کے ازار بند تیار کرنے اور بساطیوں کے ہاتھ بیچ دینے کی خبر مشہور ہوگئی تھی۔ شمس تبریز کو اپنے پیچھے لگ جانے والوں سے الجھن ہونے لگی تھی اور شاید اسی لیے وہ کسی شہر میں زیادہ دن قیام بھی نہیں کرتے تھے۔
ان کا حلیہ یہ تھا کہ ہمیشہ سیاہ نمدہ پہنتے تھے اور انہیں سیکڑوں آدمیوں کے درمیان دور ہی سے دیکھ کر پہچانا جاسکتا تھا۔
دمشق میں داخل ہوئے تو یہاں بھی سرائے میں قیام کیا۔
جن لوگوں نے انہیں بغداد، اردن یا کہیں اور دیکھا تھا ان کی مخصوص وضع قطع کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے۔ یہاں بھی یہ لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا سبب بن گئے۔ جس سرائے میں ٹھہرے لوگوں نے سرائے میں پہنچ کے ان سے ملاقات کی اور اس بار ان سے براہ راست سوالات بھی کیے گئے۔ مناقب العارفین میں ان کی ذات سے متعلق انہی کی زبانی منقول ہے لوگوں نے ان سے پوچھا۔ "حضرت! آپ کا وطن کون سا شہر ہے؟"
انہوں نے جواب دیا۔ "میرے نام کے ساتھ تبریز لگا ہوا ہے کیا اس کے بعد بھی میرے وطن کا نام جاننا چاہتے ہو؟"
ایک اور شخص نے کہا۔ "شمس تبریز تو آپ کا لقب یا تخلص ہوسکتا ہے مگر آپ کا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔"
شمس تبریز نے جواب دیا۔ "میرا نام محمد ہے باپ کا نام علی تھا اور دادا کا نام ملک داد۔"
ان سے سوالات تو بہت سے کیے گئے مگر لوگوں کی جستجو اور پرسش انہیں پسند نہیں آئی اور بہت سے سوالوں کے جواب گول کرگئے۔

یہاں سب ہی کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شمس تبریزؒ ازار بند بنتے ہیں اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔

ان کے بارے میں چونکہ یہ بات علم میں آچکی تھی کہ یہ نوعمری میں ہی عشق محمدی ﷺ سے سرشار ہونے کی وجہ سے تیس تیس، چالیس چالیس دن تک غذا اور پانی کے بغیر رہتے تھے اور بتاتے تھے کہ انہیں ان دونوں چیزوں کی خواہش نہیں ہوتی۔

اردن کے باشندے نے ان سے نوعمری کے اس واقعے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کوئی جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''میں آج کل جو کچھ کھا پی رہا ہوں تجھے یہی معلوم ہو جائے تو کافی ہے اور اس سے تو میری نوعمری سے متعلق کھانے پینے کا حال جان لے گا۔''

سرائے والوں سے جب ان کے بارے میں معلوم کیا گیا کہ آج کل یہ کیا کھا پی رہے ہیں تو کسی نے بتایا۔ ''ہفتے میں ایک پیالہ سری کا شوربا پی لیا کرتے ہیں اور اس میں روغن نہیں ہوتا۔''

یہ خبر بھی سننے والوں کے لیے بہت عجیب تھی۔ سری کے شوربے کا ایک پیالہ پی کر ایک ہفتے تک کچھ نہ کھانا اور نہ پینا ناقابل یقین تھا۔ جبکہ ان کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔

ان کے بارے میں لوگوں کو ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی اور ان کی سفری کیفیت کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے ان کا نام شمس پرندہ رکھ دیا۔

اسی سرائے میں ان کے بارے میں لوگوں کو اتنی معلومات مزید حاصل ہوگئیں کہ یہ علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد شیخ ابوبکر سبخ باف کے مرید ہوئے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ زین الدین سنجاسی کے بھی مرید تھے۔ سنجاس بھی زنجان کا ایک قصبہ تھا۔

دمشق میں ان کی صحبت میں رہنے کی کئی لوگوں نے کوشش کی مگر انہوں نے کسی کو بھی ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا متحمل نہیں پایا اور صحبت میں رہنے کے ہر خواہش مند کو رخصت کر دیا۔

کئی لوگوں نے انہیں دعا کرتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ ''خدایا تو مجھے کوئی ایسا رفیق عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔''

پھر آپ دمشق میں ایک سال گزار کے اردن چلے گئے اور اس کے بعد اردن سے تبریز کا قصد کیا مگر تبریز سے ابھی رخت سفر نہیں باندھا تھا کہ انہیں حکم دیا گیا۔ ''اے شمس روم جاؤ وہاں ایک دل سوختہ موجود ہے اسے روشن کر آؤ۔''

یہ چھبیس جمادی الثانی 642ہجری دوشنبے کے دن قونیہ میں داخل ہوئے اور یہاں کی سرائے میں قیام کرنے کے بجائے شکر فروشوں کے محلے میں قیام کیا۔ یہاں بھی ان کی پُراسرار شخصیت جلد ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی لیکن لوگوں نے انہیں کسی اور حیثیت سے نہیں جانا تھا سیاہ نمدہ اس وقت بھی ان کے جسم پر تھا۔

قونیہ میں سب سے زیادہ چرچا مولانا رومیؒ کا تھا اور جب بھی مولانا رومی کی سواری کہیں سے گزرتی تھی تو ان کے گرد و پیش موجود لوگ مولانا رومی سے علمی استفادہ کرتے تھے۔

شمس تبریز نے مولانا رومیؒ کا ذکر تو بہت سنا تھا مگر ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

ایک دن مولانا رومی کی سواری شان سے آرہی تھی کہ استفادہ علمی کرنے والے ان کے ساتھ ساتھ محو سفر تھے۔

شمس تبریزؒ نے دور سے انہیں آتے ہوئے دیکھا اور جب مولانا رومی کی سواری ان کے قریب سے گزرنے والی تھی کہ شمس تبریز نے سامنے کھڑے ہو کر انہیں روک لیا۔ مولانا رومی نے اس سیاہ نمدے میں کھڑے ہوئے اجنبی کو بغور دیکھا۔

شمس تبریز نے دوسرے سوال کرنے والوں کی طرح مولانا سے پوچھا۔ ''اے جلال الدین! ریاضیات اور علوم کی غرض و غایت کیا ہیں؟''

مولانا رومیؒ ایک عجیب الحلیہ اجنبی کو اچانک سوال کرتے ہوئے دیکھ کر کچھ دیر خاموش رہے۔ پتا نہیں شمس تبریزؒ کی شخصیت اور سوال کرنے کے انداز نے مولانا رومیؒ پر کیسا اثر کیا کہ وہ کچھ دیر دم بخود رہے۔ جو دوسرے شائقین علم تھے وہ بھی ان دونوں کی ملاقات پر حیران تھے۔ کیونکہ اس اجنبی سے پہلے لوگ مولانا سے دین اور شرع سے متعلق سوالات کرتے تھے مگر اس سیاہ نمدہ پوش اجنبی نے مولانا سے عجیب و غریب سا سوال کر دیا تھا یعنی ریاضیات و علوم کی غرض و غایت کیا ہیں۔

کچھ دیر بعد مولانا نے جواب دیا۔ ''آداب شریعت کا جاننا۔''

اس دن تک مولانا کو ایسا کوئی شخص نہیں ملا تھا جو مولانا سے سوال کرنے کے بعد جواب سن کے خاموش نہ ہوا ہو اور الٹا مولانا کے جواب کو رد کرتے ہوئے ان سے اختلاف کیا ہو اور اپنی طرف سے اس کا جواب بھی دے دیا ہو۔

آج شمس تبریزؒ نے مولانا سے جو سوال کیا تھا اور انہوں نے اس کا جو جواب دیا تھا شمس تبریزؒ نے اس سے اختلاف

کرتے ہوئے کہا تھا۔ "نہیں مولانا نہیں بلکہ ریاضیات وعلوم کی غرض وغایت ہونی چاہیے نامعلوم سے معلوم تک رسائی۔"

شمس تبریز کے اس مختصر جوابی فقرے نے مولانا رومی کی کیفیت ہی کو بدل کے رکھ دیا۔ ان کے چہرے سے تحیر وتحیر ظاہر ہونے لگا۔

مولانا رومی نے ہوش میں آنے کے بعد پوچھا۔ "حضرت! آپ کا قیام کہاں ہے۔"

شمس تبریز نے شکر فروشوں کے محلے کا ذکر کیا تو مولانا نے پوچھا۔ "وہاں آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے یا تنہا تشریف رکھتے ہیں؟"

شمس تبریز نے جواب دیا۔ "ہر وقت حالت سفر میں رہنے والا اپنے ساتھ کس کو رکھ سکتا ہے۔ میرے پاس تو ایک بوریے کے علاوہ دوسرا کوئی سامان بھی نہیں ہے۔"

مولانا نے کہا۔ "اگر بے سروسامانی کی یہ کیفیت ہے تو آپ میرے ساتھ چلیے ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔"

اور یوں شمس تبریز مولانا کے ساتھ ان کے گھر منتقل ہوگئے۔

مولانا رومی سے شمس تبریز کی ملاقات کا ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

شمس تبریز جب قونیہ کے شکر فروشوں کے محلے میں مقیم تھے تو ان سے جو لوگ ملنے آتے تھے شمس تبریز ان کو بھی نظر انداز کرتے تھے انہی آنے جانے والوں سے شمس تبریز نے مولانا رومی کا ذکر سنا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عالم بے بدل کا دور دور تک کوئی ثانی نہیں۔

شمس تبریز نے مولانا رومی کی سواری کو بھی گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لوگ ان سے سوالات کررہے ہوتے تھے اور مولانا ان کو فی البدیہہ جوابات دیتے گزر جاتے۔ ایسا لگتا تھا گویا شاہی سواری گزر رہی ہو۔ شمس تبریز یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر اچانک مولانا کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا رومی اپنے کتب خانے میں مطالعے میں مشغول تھے۔ محویت اور استغراق کا یہ حال تھا کہ مولانا کو شمس تبریز کی تشریف آوری کا احساس ہی نہ ہوا۔

اچانک کتب خانے میں کسی اور کی موجودگی کا شبہ ہوا تو مولانا نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں اور اپنے قریب شمس تبریز کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ سیاہ نمدہ پوش ان کے کتب خانے میں کیسے اور کب داخل ہوگیا۔ شمس تبریز نے نظر پھیر کر مولانا کو دیکھا تو مولانا کو یاد آیا کہ انہوں نے اس شخص کو روزمرہ کے سفر کے دوران میں سرراہ کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔

شمس تبریز نے کتب خانے کی کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مولانا یہ سب کیا ہے؟"

مولانا نے شمس تبریز کو ان پڑھ سمجھا تھا جواب دیا۔ "یہ وہ ہے جو تو نہیں جانتا۔"

شمس تبریز نے کتب خانے کو نظر بھر کے دیکھا تو اس میں آگ لگ گئی اور مولانا نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

شمس تبریز نے جواب دیا۔ "یہ وہ ہے جو تو نہیں جانتا۔"

کہتے ہیں کہ دونوں کے سوال جواب اور واقعے نے مولانا رومی کی حالت ہی بدل کر رکھ دی۔

مولانا نے شمس تبریز کو اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی اور ایک ہی حجرے میں ان دونوں نے اقامت اختیار کی اور ایک روایت کے مطابق یہ دونوں چالیس روز تک ایک ہی حجرے میں ایک ساتھ رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

اس روایت کے برعکس دوسری روایت یہ ہے کہ ایک دوسرے صوفی صلاح الدین زرکوب کے حجرے میں یہ دونوں عزلت نشین ہوگئے اور چھ ماہ تک شیخ صلاح الدین زرکوب کے علاوہ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے حجرے میں داخل ہوسکے۔

مولانا رومی کی زندگی میں یہ عجیب وغریب تغیر آیا تو کچھ دن ان کے طلبا اور مولانا کے علم سے مستفیض ہونے والے سمجھ ہی نہ سکے کہ مولانا نے اچانک کچھ بتائے بغیر ہی سب سے کنارہ کشی اور عزلت نشینی کیوں اختیار کرلی۔ مولانا کے در پر ہر روز جو لوگ حاضریاں دیتے تھے وہ اب بھی مسلسل حاضری دے رہے تھے اور انہیں یہی جواب مل رہا تھا کہ مولانا شمس تبریز کے ساتھ صلاح الدین زرکوب کے حجرے میں مقیم ہیں۔ مولانا کے پرستار پوچھتے۔ "ہماری ان سے ملاقات کب ہوگی اور ہم ان سے استفادہ کب حاصل کریں گے؟"

لوگوں نے مولانا کی طلب میں آنے والوں کو صلاح الدین زرکوب کے حجرے کا پتا دیا اور بتایا کہ مولانا اپنے مہمان شمس تبریز کے ساتھ زرکوب کے حجرے میں مقیم ہیں اور کچھ پتا نہیں کہ وہ کب تم لوگوں سے ملیں گے۔

یہ جواب بہت تکلیف دہ تھا اور اس سے لوگ مطمئن نہیں ہورہے تھے۔ یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آخر شمس تبریز میں ایسی کون سی خوبی ہے جو مولانا ان کے ساتھ حجرے میں مستقلاً مقیم ہوگئے ہیں۔ ابھی تک تو لوگ مولانا سے علم اور فیض حاصل کرتے تھے مگر اب زرکوب کی

باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ مولانا طالب اور متعلم ہیں اور شمس تبریز مطلوب اور معلم۔

لوگوں نے اس سیاہ نمدہ پوش کو شکر فروشوں کے محلے میں دیکھا تھا مگر انہیں اس اجنبی میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی جس کے مولانا گرویدہ ہو گئے۔

زرکوب کا جواب دیتے دیتے برا حال ہو گیا۔ صبح سے شام تک لوگ ان کے پاس پہنچتے اور اصرار کرتے کہ انہیں مولانا سے ملوا دیا جائے لیکن زرکوب مجبور تھے کیونکہ انہیں مولانا کی طرف سے سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی بھی شخص کو ان کے حجرے میں نہ آنے دیا جائے۔

کچھ دنوں تک تو یہ تلخی اور بدمزگی طالب علموں تک محدود رہی۔ قونیہ والوں نے مولانا کی اب تک بڑی خدمت کی تھی اور اب ایک اجنبی نے مولانا کو ان سے چھین لیا تھا۔ مولانا شمس تبریز کے آنے سے پہلے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور اپنے باپ کی طرح لوگوں کی رہنمائی بھی کرتے تھے اور وعظ بھی فرماتے تھے لیکن شمس تبریز سے ملنے کے بعد یہ سارے سلسلے موقوف ہوئے۔ اب نہ تو درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا نہ وعظ گوئی ہو رہی تھی مولانا کی زندگی سے متعلق جملہ مشاغل کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔

اب مولانا کے پاس جانے والے اپنی ناکامی کے بعد بہت بددماغی اور بدمزاجی کے مظاہرے کر رہے تھے۔ زرکوب کا اپنی جگہ برا حال تھا اور مولانا کی طلب میں آنے والے زرکوب کو دھمکی دیتے تھے کہ مولانا کو ان کے سامنے لایا جائے۔ اگر ان کی یہ فرمائش پوری نہ کی گئی تو وہ زرکوب کے حجرے پر حملہ کر کے اندر داخل ہو جائیں گے اور حجرے کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دیں گے۔ یہ باتیں اتنی زور و شور سے اعلان جنگ کی طرح ہوتیں تو حجرے میں دونوں صاحبان بھی فکرمند ہو جاتے اور صلاح الدین زرکوب کو حکم دیا جاتا کہ خبردار جو کسی کو ان کے حجرے تک آنے دیا گیا۔

باہر جمع ہو جانے والے لوگ زرکوب سے بحث کرتے۔ "واہ جناب ہم نے تو مولانا کی خدمت میں اپنی عمریں گزار دیں۔ تمام اطراف میں مولانا کی شہرت کا باعث ہوئے، یہ باتیں کون نہیں جانتا۔ آخر یہ بے نام اور گمنام نسب والا شخص کون ہے اور مولانا سے اس کا کیا رشتہ اور تعلق ہے؟"

زرکوب نے مختصر جواب دیا۔ "میرے پاس تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں، مجھے تو بس مولانا کی طرف سے یہ حکم ملا ہے کہ میں کسی کو بھی ان کے حجرے میں نہ جانے دوں۔"

کسی نے بہ آواز بلند اعلان کیا۔ "لوگو! شمس تبریز تو مجھے کوئی ساحر یا مکار شخص لگتا ہے ورنہ اس کی کیا ہستی کہ مولانا جیسے پہاڑ کو تنکے کی طرح بہا لے جائے۔"

چھ ماہ کے بعد مولانا نے زرکوب کے حجرے کو چھوڑ دیا اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ شمس تبریز بدستور ان کے ساتھ تھے۔

لوگوں نے چھ ماہ کے بعد جو ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تو ان کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے اور مولانا سے زیادہ شمس تبریز کی مذمت کی اور ان میں مولانا رومی کے صاحبزادے علاؤالدین ولد پیش پیش تھے۔ جس سے مولانا رومی کو جو تکلیف پہنچی وہ ناقابل بیان تھی۔ نہ صرف انہیں بلکہ شمس تبریز کو بھی مولانا رومی کے اس بیٹے سے اذیت محسوس ہوتی رہی۔

لوگوں نے مولانا کو مجبور کیا کہ وہ اپنی سابقہ زندگی اختیار کریں اور شمس تبریز نامی جادوگر سے پیچھا چھڑائیں۔

مولانا نے ان سب کو تحمل اور بردباری سے جواب دیا۔ "تم لوگ شمس تبریز کی عظمت اور مقام سے واقف نہیں ہو، ان کے آنے سے پہلے میں ناقص، ناتمام اور سوز و ساز سے خالی تھا مگر ان کے آنے کے بعد مجھ میں تم سب جو تغیر عظیم دیکھ رہے ہو یہ شمس تبریز کا فیضان ہے۔ اب مجھے درس و تدریس اور وعظ گوئی میں مزہ نہیں آتا، اس لیے میں نے ان دونوں سلسلوں کو بند کر دیا ہے۔ بس حکومت کی طرف سے جو فتوے طلب کیے جاتے ہیں انہیں کر کے روانہ کر دیتا ہوں۔"

لوگوں کا اب یہ اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ شمس تبریز کو مولانا کے پاس نہیں برداشت کریں گے۔ لہٰذا شمس تبریز کو مولانا اپنے گھر سے نکال دیں۔

یہ دباؤ اتنا بڑھا کہ شمس تبریز بھی مولانا کا گھر چھوڑنے پر کچھ کچھ آمادہ ہو گئے لیکن مولانا اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور کہا۔ "اے شمس تبریز میں تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔ اب ان مفسدانِ زمانہ کے دباؤ پر میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔"

مولانا کے دوسرے صاحبزادے سلطان الدین ولد بھی شعر و شاعری کا شغف رکھتے تھے اور بہت اچھی شاعری کرتے تھے۔ انہیں شمس تبریز سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے بھی شمس تبریز کو مجبور کیا کہ وہ مولانا کے ساتھ ہی رہیں اور قونیہ سے کہیں اور نہ جائیں۔

شمس تبریز نے سلطان الدین ولد کو بتایا۔ "تیرا بھائی علاؤالدین ولد شورش اور فتنہ کھڑا کرنے والوں کے ساتھ پیش

پیش نظر آرہا ہے اس لیے اب تم لوگ مجھے یہاں سے جانے دو۔"

لیکن مولانا نے اپنے گھر سے چلے جانے کی اجازت نہیں دی۔ لوگوں نے شمس تبریز کا باہر نکلنا مشکل کردیا تھا۔ اگر لوگ شمس تبریز کو کہیں باہر دیکھتے تو ان کی شان میں ناشائستہ زبان استعمال کرتے۔ شمس تبریز یہ طنز وطعن اور ناشائستگی کا بوجھ اپنے دل و دماغ پر لیے ہوئے مولانا کے گھر میں واپس آجاتے۔

وہ بدھ کا دن اور رمضان کی آخری تاریخ تھی۔ یہ 643 ہجری کا واقعہ ہے اس دن شمس تبریز بہت اداس تھے، کسی سے کوئی بات بھی نہیں کرتے تھے۔

سلطان ولد بھی شمس تبریز کے اس مزاجی تغیر کو محسوس کرتے رہے اور اس کا ذکر اپنے والد محترم مولانا رومی سے کر دیا اور کہا۔ "آپ شمس تبریز سے معلوم کریں کہ وہ اتنے آزردہ خاطر کیوں ہیں؟"

مولانا نے بیٹے کو جواب دیا۔ "ہم سب جانتے ہیں کہ شمس آزردہ خاطر کیوں رہتے ہیں۔ زمانے کے ساتھ تیرے بھائی علاؤالدین ولد نے بھی انہیں بہت ستایا ہے۔ میں اپنی جگہ شرمندگی محسوس کرتا ہوں اسی لیے میں شمس سے ان کی آزردگی خاطر کا سبب بھی نہیں پوچھتا۔"

لیکن اسی شام مولانا نے شمس تبریز سے ان کی غیر معمولی اداسی کا سبب معلوم کیا۔

شمس تبریز نے اپنی آزردگی کی وجہ تو نہیں بتائی بس مولانا سے ایک سوال کر دیا۔ "تم مجھے بتا سکتے ہو کہ مجھے تمہارے ساتھ رہتے ہوئے کتنی مدت گزر گئی؟"

مولانا نے دل ہی دل میں حساب لگا لیا بتایا۔ "حضرت! ایک سال تین ماہ کی مدت گزر گئی ہے۔"

شمس تبریز نے آہستہ سے کہا۔ "گویا مجھے تمہارے ساتھ رہتے ہوئے..... تمہاری ہم نشینی میں سوا سال کی مدت پلک جھپکتے میں گزر گئی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ گویا میں کل ہی اس گھر میں آیا تھا۔"

مولانا نے شمس تبریز کو سمجھایا۔ "آپ لوگوں کی پروانہ کریں اور جس طرح ساتھ رہتے ہیں، رہتے رہیں۔"

شمس تبریز نے آہستہ سے جواب دیا۔ "انسان ہوں سینے میں دل بھی گوشت پوست کا ہے پتھر کا ہوتا تو جھیل جاتا، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، بتاؤ میں کیا کروں۔ مجھے تو نیہ والوں کی پروا نہیں لیکن جب میں ان کے آگے آگے علاؤالدین ولد کو دیکھتا ہوں تو مجھے بہت تکلیف پہنچتی ہے۔"

دیر تک دونوں میں باتیں ہوتی رہیں اور سلطان ولد نے بھی ان دونوں کو رات کے پچھلے پہر تک باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور ان کی آوازیں بھی سنتے رہے۔

صبح فجر کے وقت مولانا نے شمس تبریز کو ان کے بستر پر نہیں دیکھا تو وہ بے قرار ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں کہرام بپا ہو گیا۔ سلطان ولد بھی باپ کے ساتھ شمس تبریز کو تلاش کرتے

جواہر

حضرت شیخ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ کشتی میں سوار ہوا، اس کشتی میں ایک خوبصورت نورانی چہرے والا نوجوان بھی تھا۔ جب ہم وسط میں پہنچے تو کشتی کے مالک کی تھیلی جس میں مال تھا گم ہو گئی۔ کشتی پر سوار تمام لوگوں کی جامہ تلاشی لی گئی۔ جب اس خوبصورت نوجوان کی تلاشی دینے کی باری آئی تو وہ ایک جست مار کر دریا میں کود پڑا اور دریا کی لہروں پر بیٹھ گیا۔ دریا کے پانی کی لہریں اس کے لیے ایک مثل تخت کے قائم ہو گئیں۔ ہم لوگ کشتی سے یہ حال دیکھ رہے تھے پھر اس نوجوان نے کہا۔ "اے میرے مولا! لوگوں نے مجھ پر چوری کی تہمت لگائی ہے۔ اے میرے دل کے دوست میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ جس قدر جانور اس جگہ پر ہیں تو ان کو حکم کر کہ وہ اپنا منہ پانی سے نکالیں اور ان میں سے ہر ایک کے منہ میں جواہر ہوں۔"

شیخ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔ "اس کی یہ بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ہم لوگوں نے دیکھا دریائی جانور اس کشتی کے سامنے جمع ہو گئے اور ہر ایک منہ میں جواہر لیے ہوئے تھا۔ ان موتیوں کی آب و تاب سے دریا روشن ہو گیا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ نوجوان پانی پر چلتا ہوا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔"

ضیا تسنیم بلگرامی کی کتاب

"حکایاتِ اولیا" سے انتخاب



رہے۔ ان دونوں کو علاؤالدین ولد پر شبہ ہوا اور انہیں بھی دونوں نے تلاش کیا اور یہ بھی کتنی عجیب بات تھی کہ گھر میں علاؤ الدین ولد بھی موجود نہیں تھا۔ اس دن شہریوں نے بھی مولانا کے گھر پر حاضری نہیں دی۔

مولانا اور سلطان ولد ایک ایک سے شمس تبریز کے بارے میں پوچھتے رہے مگر کسی سے کوئی معقول جواب نہیں ملا البتہ علاؤ الدین ولد سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ شمس تبریز اپنی رسوائی اور بدنامی سے عاجز آ کر قونیہ چھوڑ گئے۔ وہ کہاں چلے گئے یہ کسی کو بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

اس خبر نے مولانا کو بالکل بے جان کر ڈالا تھا۔ انہوں نے بہت سوچا کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں مگر انہیں اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا اور ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اتنا معلوم ہو گیا کہ شمس تبریز کسی قافلے کے ساتھ قونیہ سے چلے گئے۔

مولانا کو سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ وہ شمس تبریز کے حسب نسب، خاندان، وطن اور ٹھکانے سے بھی واقف نہیں تھے۔ وہ اگر انہیں تلاش کرنا چاہتے تو کہاں تلاش کرتے۔ اب انہیں بس ایک ہی تاریخ ایک ہی دن اور ایک ہی سن ہجری یاد رہ گیا تھا۔

یہ دن جمعے کا دن تھا۔ شوال کی پہلی تاریخ اور 643 ہجری، ہر کوئی عید کی خوشیاں منا رہا تھا۔ شہر میں بڑی چہل پہل تھی، عید کی نماز کے بعد لوگ گلے مل رہے تھے لیکن مولانا کے لیے یہ دن حزن اور سال عام الحزن تھا یعنی غم کا سال۔

مولانا کے مریدوں اور طالب علموں کو آج دہری خوشی حاصل ہوئی تھی۔ ایک خوشی تو عید کی تھی اور دوسری خوشی شمس تبریز کے چلے جانے کی۔ جبکہ مولانا کو ان پُرمسرت چہروں کو دیکھ دیکھ کے نفرت ہو رہی تھی اور وہ انہیں دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر رہے تھے۔ مولانا نے ان سب خوش و خرم لوگوں کو منع کر دیا کہ آئندہ وہ مولانا کے قریب بھی نہ آئیں۔ ان سب کے لیے مولانا کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے۔ مولانا کے گھر والے بھی پریشان تھے کہ ان کے خوشحال گھر اور ماحول کو کس کی نظر لگ گئی۔

کافی دنوں بعد شمس تبریز کا ایک خط مولانا کو اچانک موصول ہوا۔ جس شخص نے مولانا کو یہ خط دیا تھا اس نے بتایا کہ شمس تبریز ان دنوں دمشق میں مقیم ہیں اور وہ بھی مولانا کو بہت یاد کرتے ہیں۔

شمس تبریز کے اس خط نے ایک طرف تو انہیں یہ سکون پہنچایا کہ مولانا کو ان کا پتا معلوم ہو گیا مگر دوسری طرف اس خط نے ان کی آتش عشق اور بھڑکا دی تھی۔

اچانک مولانا نے سماع میں دلچسپی لینا شروع کر دی کیونکہ سماع سے شوق عشق میں لذت میسر آتی ہے۔

اب مولانا نے ان لوگوں سے تعلقات دوبارہ قائم کر لیے جنہوں نے شمس تبریز کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ مولانا نے شمس تبریز کو چار منظوم خط لکھے اور ان خطوط میں اپنی کیفیت، بے تابی اور شوق ملاقات کا ذکر کیا گیا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے رہے قونیہ والوں کو بھی قرار آتا چلا گیا۔ اب شمس تبریز قونیہ میں نہیں تھے تو لوگوں کو بھی ان کا خیال نہیں آتا تھا۔ مولانا بھی قونیہ والوں کے احساسات اور جذبات پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے خوب اچھی طرح یہ محسوس کر لیا کہ قونیہ میں شمس تبریز کے حوالے سے کوئی شورش نہیں ہے اور لوگوں کے جذبات معمول پر آ گئے ہیں تو مولانا نے اپنے بیٹے سلطان ولد کو بلایا اور تخلیے میں فرمایا۔ ''تم دمشق چلے جاؤ وہاں شمس تبریز موجود ہیں تم میری طرف سے اس شاہ مقبول سے ملو اور میرا یہ عریضہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کر دو۔ میری طرف سے ان کو یقین دلاؤ کہ جن مریدوں نے گستاخی کی تھی وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ ان سے جو خطا ہوئی اسے درگزر فرمائیں اور قونیہ تشریف لے آئیں۔

قونیہ سے دمشق تک کا سفر معمولی نہیں تھا یہ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر تھا۔ مولانا کے فرماں بردار اور سعادت مند بیٹے سلطان ولد نے اپنے باپ کے لیے یہ خدمت انجام دی اور تکلیف دہ سفر کرتے ہوئے دمشق پہنچے۔ یہاں شمس تبریز جس سرائے میں مقیم تھے ان کا وہی پرانا مشغلہ جاری تھا۔ ازار بند تیار کر کے فروخت کر دینا۔

مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد جب سرائے میں داخل ہوئے اور یہاں شمس تبریز کا پتا پوچھا تو سرائے کے ایک ملازم نے انہیں شمس تبریز کی کوٹھری کے سامنے پہنچا دیا۔ کوٹھری کے دروازے پر بھاری بھرکم مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔

پوچھنے پر سلطان ولد کو بتایا گیا کہ وہ کسی بساطی کی دکان پر ملیں گے۔

سلطان ولد دمشق میں شمس تبریز کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے اور انہیں اطمینان تھا کہ شمس تبریز کہیں بھی گئے ہوں آخر کار اپنی کوٹھری تک آئیں گے ضرور۔ وہ کوٹھری کے باہر شمس تبریز کے انتظار میں بیٹھ گئے اور جب وہ آئے اور ان کی نظر سلطان ولد پر پڑی تو شمس تبریز بھی بہت خوش ہوئے، اپنے

باپ کا نامہ شوق شمس تبریز کے حوالے کیا۔
شمس تبریز نے اسے بغور پڑھا اور بڑی لذت محسوس کی۔ کچھ دیر ماحول پرسکون رہا۔ بالآخر سلطان ولد سے پوچھا۔ ”کیا واقعی ہم پر اعتراض کرنے والے اب شرمندہ ہیں اور انہوں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ ہم دونوں کی مخالفت نہیں کریں گے۔“
سلطان ولد نے جواب دیا۔ ”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ والد محترم نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہوگا کیونکہ ان کی بہت سی باتوں کا مجھے علم نہیں ہوتا۔“
شمس تبریز کو قونیہ واپس جانے میں تامل تھا اور سلطان ولد کو سرد مہری سے جواب دیا۔ ”میں قونیہ تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں مگر چلنے کا فوری فیصلہ نہیں کرسکتا۔ مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔“
سلطان ولد نے کہا۔ ”اب وہاں کے حالات معمول پر آگئے ہیں اور کوئی آپ کا نام بھی نہیں لیتا۔ اسی سے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور اب وہ ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ قونیہ چلنا چاہیے۔“
شمس تبریز نے ماضی کا ذکر کیا انہیں وہاں جو روحانی اذیتیں پہنچی تھیں ان کا خیال کرکے وہ پریشان ہوگئے تھے اور کہا۔ ”میں قونیہ تیرے ساتھ جاؤں گا مگر ڈرتا ہوں کہ وہاں میرے پہنچتے ہی پہلے کی طرح ہنگامے نہ اٹھ کھڑے ہوں۔“
سلطان ولد نے دلاسہ دیا۔ ”آپ بالکل نہ گھبرائیں اول تو کسی ہنگامے کا کوئی امکان نہیں اور اگر شومیٔ قسمت کوئی ہنگامہ برپا ہوا بھی تو ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے بہت سے ارادت مند اس ہنگامے پر قابو پالیں گے۔“
شمس تبریز نے فیصلہ تو کرلیا تھا کہ وہ سلطان ولد کے ساتھ قونیہ جائیں گے۔ اب تک انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ چنانچہ سفر سے پہلے ہی انہوں نے سلطان ولد سے کہا۔ ”اب میں شادی کرلوں گا مگر میں شادی کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔“
آخر کار شمس تبریز سلطان ولد کے ساتھ قونیہ روانہ ہوگئے۔ قونیہ میں یہ لوگ شام کے وقت داخل ہوئے تو ان کے لباس، چہرے اور ہاتھ پاؤں گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔
شمس تبریز اس وقت بھی سیاہ نمدے میں تھے اور اس کی سیاہی پر گرد و غبار کی تہ جمی ہوئی تھی۔ مولانا نے ان کے لیے دوسرے لباس کا بندوبست کر رکھا تھا۔ پہلے تو ان سے غسل کرنے کی درخواست کی گئی۔ شمس تبریز کی آمد پر مولانا کی خوشی انتہائی کمال کو پہنچ گئی تھی۔
مولانا کے اعتبار دلانے کے باوجود لوگوں نے شمس تبریز کو جب پڑاؤ کے لیے مولانا کے گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ پھر مشتعل ہوگئے۔ رات بھر میں قونیہ والوں کو معلوم ہوگیا کہ شمس تبریز سلطان ولد کے ساتھ واپس آگئے ہیں۔
شمس تبریز نے سلطان ولد سے کہا تھا کہ اب وہ تبریز پہنچ کر شادی کرلیں گے۔ چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد شمس تبریز نے شادی کا سوچا مگر بیوی کے ساتھ رہنے کے لیے شمس تبریز کو ٹھکانا درکار تھا لہٰذا اس سلسلے میں سلطان ولد، مولانا اور شمس تبریز کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔
شمس تبریز نے کہا۔ ”میں تنہا تو کہیں بھی رہ سکتا ہوں مگر شادی کے بعد بیوی کو ایک مستقل ٹھکانا چاہیے۔ جب تک اس کا انتظام نہ ہوجائے میں شادی بھی نہیں کرسکتا۔“
مولانا نے کہا۔ ”یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ شادی کرلیں، دونوں کے رہنے کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔“
شمس تبریز نے پوچھا۔ ”کہاں ہوجائے گا یہ تو معلوم ہو۔“
مولانا نے اپنے ہی گھر کے ایک حصے کا ذکر کیا۔ ”بہادر الان صفہ ایک طرف آپ دونوں کے لیے رہنے کا انتظام ہوجائے گا، شادی کرکے آپ دونوں میرے گھر میں رہیں۔“
جب یہ معاملہ بھی طے پا گیا تو شمس تبریز کی شادی کروا دی گئی اور یہ دونوں مولانا کے گھر میں رہنے لگے۔
مولانا کے منجھلے صاحبزادے علاؤالدین ولد کو یہ بات ناگوار گزری۔ وہ تو پہلے ہی شمس تبریز کے خلاف تھے کہ یہ شخص مولانا پر قبضہ کرکے بیٹھ گیا ہے۔ اب انہیں یہ شکایت بھی ہوئی کہ شمس تبریز نے شادی کرلی اور اپنی بیوی کو بھی مولانا کے گھر میں لے آیا، گویا اب شمس تبریز کا مولانا کے گھر پر مستقل قبضہ ہوگیا تھا۔
شمس تبریز قونیہ کی فضا میں اپنے خلاف دبی دبی چنگاریاں محسوس کر رہے تھے۔ سلطان ولد نے شمس تبریز کو دمشق میں یقین دلایا تھا کہ اب قونیہ کے لوگ شمس تبریز کی مخالفت نہیں کریں گے اور مولانا نے بھی اپنے خط میں یہی لکھا تھا کہ شمس تبریز کی مخالفت کرنے والے اب شرمندہ ہیں۔
شمس تبریز نے خطرے کی بُو محسوس کی تو مولانا کو تخلیے

میں اپنے پاس بٹھا کے پوچھا۔ ''تم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ قونیہ کے ہمارے مخالف اپنے سابقہ رویوں پر پشیمان ہیں اور وہ مجھ سے معافیاں مانگنے کے لیے آمادہ ہیں۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے یہ لکھا تھا کیونکہ آپ کی عدم موجودگی میں جب میں بہت زیادہ پریشان اور غمزدہ ہو گیا اور میں نے قونیہ والوں سے تعلقات منقطع کر لیے تو یہاں کے لوگوں نے مجھ سے بے حد معافیاں مانگیں اور میں نے انہیں اس شرط پر معاف کر دیا کہ انہیں آپ کی دوبارہ تشریف آوری پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس پر تیار بھی ہو گئے۔ تب میں نے ان سب کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ جب آپ قونیہ دوبارہ تشریف لائیں گے تو وہ سب آپ سے معافیاں مانگیں گے۔''

شمس تبریز نے کہا۔ ''لیکن ہم سے معافیاں مانگنے کے لیے کوئی شخص بھی یہاں تک نہیں آیا۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''آپ بالکل پریشان نہ ہوں میں ان سب کو فرداً فرداً آپ کے پاس معافی مانگنے کے لیے بھیجوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق آپ سے معافی مانگ لیں گے۔''

شمس تبریز نے کہا۔ ''تو یہ کام جلد ہونا چاہیے۔''

کئی دن کی کوششوں کے بعد شمس تبریز کی خدمت میں کچھ لوگ فرداً فرداً پیش کر دیے گئے۔ جنہوں نے شمس تبریز سے اپنے گزشتہ مخالفت آمیز رویوں کی معافی مانگی۔

اب شمس تبریز کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر آپ کے چہرے، رویے اور باتوں سے مولانا نے یہی محسوس کیا کہ وہ ابھی تک مطمئن نہیں ہیں اور جب مولانا نے اس سلسلے میں شمس تبریز کے قلبی جذبوں کا باتوں سے اندازہ لگانا چاہا تو شمس تبریز نے کہا۔ ''میں نے قونیہ کو ان چند لوگوں کے دباؤ پر نہیں چھوڑا تھا۔ میرے خلاف تو بڑے بڑے ہنگامے ہوئے تھے اور ان ہنگاموں نے شورش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مجھ سے معافیاں مانگنے والے تو گنتی کے چند افراد تھے۔ اکثریت ابھی تک مجھ سے معافی مانگنے نہیں آئی۔ لہٰذا اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ میری واپسی سے قونیہ کی اکثریت خوش نہیں ہے اور وہ لوگ میرے خلاف پھر ہنگامے کر سکتے ہیں، اس لیے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں دوبارہ قونیہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔''

مولانا کو شمس تبریز کے اس فیصلے سے بڑی تکلیف پہنچی اور خوشامدانہ درخواست کی کہ وہ اب قونیہ سے کہیں نہیں جائیں گے۔ ان کی ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان کے سامنے سے علاؤ الدین ولد دونوں کو دیکھتے ہوئے اندر چلے گئے۔ علاؤ الدین ولد کے اندر جانے کا راستہ شمس تبریز کی بیوی کے رہائشی کمرے کے سامنے سے تھا۔ شمس تبریز بھی علاؤ الدین کو جاتے ہوئے تکلیف دہ جذبے سے دیکھتے رہے۔ انہیں علاؤ الدین سے پہلے ہی بہت شکایات رہی تھیں اور اب جو وہ ان کی بیوی کے سامنے سے گزر کر اندر گئے تو شمس تبریز نے مولانا سے کہا۔ ''تم اپنے اس بیٹے کو سمجھاؤ کہ وہ آئندہ اندر جانے کے لیے یہ راستہ نہ اختیار کرے۔''

مولانا نے سکوت اختیار کیا اور کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔ ''میں اسے سمجھاؤں گا کہ وہ آئندہ ادھر سے نہ گزرے۔''

مولانا نے اپنے بیٹے علاؤ الدین ولد کو تنہائی میں سمجھایا۔ ''بیٹے علاؤ الدین تم اندر دوسرے کئی راستوں سے بھی جا سکتے ہو مگر تم نے اندر جانے کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے شمس تبریز کو تکلیف پہنچی ہے کیونکہ یہاں ان کی بیوی رہتی ہے اور تمہارے ادھر سے آنے جانے سے بے پردگی ہو سکتی ہے۔''

علاؤ الدین ولد نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ ''بہت خوب موصوف کا ہم سے کوئی رشتہ بھی نہیں مگر انہوں نے پہلے تو آپ کی ذات پر قبضہ کر لیا اور اب وہ شادی کر کے میرے گھر پر بھی قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے میں جس راستے سے بھی اندر جانا چاہوں گا جاؤں گا۔ شمس تبریز کو اس قسم کے اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔''

مولانا نے نرمی سے سمجھایا۔ ''بیٹے ضد نہ کر اور میری بات مان لے۔ تجھے نہیں معلوم کہ شمس تبریز کا دل دکھانے سے میرا دل دکھتا ہے۔ تجھے شمس تبریز سے معافی مانگ کر اندر جانے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔''

علاؤ الدین کوئی جواب دیے بغیر ہی اٹھ کر چلے گئے۔

شمس تبریز کو باپ بیٹے کی ان باتوں کا علم ہو گیا تو وہ قونیہ سے اور زیادہ مایوس ہوئے اور آہستہ سے کہا۔ ''مجھے قونیہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑے گا کیونکہ قونیہ والوں کی تو بات ہی الگ ٹھہری مگر مولانا کا بیٹا بھی ان کے اختیار میں نہیں ہے۔''

علاؤ الدین نے اندر آنے جانے کا قصداً وہی راستہ اختیار کیا اور شمس تبریز اسے نہایت ناگواری سے برداشت کرتے رہے۔ آخر تنگ آ کر ایک دن علاؤ الدین ولد کے راستے میں کھڑے ہو گئے اور کہا۔ ''صاحبزادے! تم آئندہ اس راستے سے اندر نہیں جاؤ گے۔''

علاؤ الدین نے تیوریاں چڑھائیں، پوچھا۔ ''کیوں آپ کو میرے ادھر سے گزرنے پر کیوں اختلاف ہے؟''

شمس تبریزؒ نے جواب دیا۔ "ادھر سے گزرنے میں میری بیوی کی بے پردگی ہوتی ہے، تمہیں تمہارے باپ نے بھی ادھر سے گزرنے سے روکا تھا۔"

علاؤ الدین نے شمس تبریزؒ کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہا۔ "یہ میرے باپ کا گھر ہے یعنی یہ میرا گھر ہے اور کوئی غیر مجھ پر اندرون خانہ اس قسم کی پابندی نہیں لگا سکتا۔"

شمس تبریزؒ نے سختی سے کہا۔ "صاحبزادے! ابھی تو میں تمہیں نرمی سے سمجھا رہا ہوں لیکن اگر میری نرمی کام نہ آئی تو میں سختی بھی کروں گا۔"

علاؤ الدین نے جواب دیا۔ "حضرت! آپ نہیں جانتے کہ پورا قونیہ آپ کا دشمن ہو رہا ہے میں اپنے گھر میں جدھر سے بھی جانا چاہوں گا جاؤں گا اور مجھے اس آنے جانے سے کوئی بھی منع نہیں کر سکتا۔"

اس جھڑپ کی خبر مولانا کو ہوئی تو انہوں نے بھی اپنے بیٹے علاؤ الدین کو بہت سمجھایا اور سختی بھی کرنا چاہی مگر علاؤ الدین پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شمس تبریزؒ کی جھڑپ کا باہر بھی چرچا شروع ہو گیا۔ کیونکہ علاؤ الدین ولد کو شمس تبریزؒ کی پرسش اور روک تھام بہت ناگوار گزری تھی۔ اس معاملے میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتے تھے اور انہیں امید تھی کہ ان کے والد مولانا رومی بھی ان کی طرف داری کریں گے مگر جب مولانا نے شمس تبریزؒ کی حمایت میں زبان کھولی اور علاؤ الدین ولد کو ڈانٹا کہ وہ آئندہ شمس تبریزؒ کی شان میں گستاخی نہیں کریں گے تو علاؤ الدین ولد نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ واقعہ دوستوں میں بیان کر دیا اور کہا۔ "یارو! تم سب انصاف کرو کہ ان معاملات میں زیادتی کس کی طرف سے ہو رہی ہے۔"

یہ لوگ تو شمس تبریزؒ سے پہلے ہی ناراض تھے اب جو علاؤ الدین کی زبانی اندر کی یہ باتیں معلوم ہوئیں تو کسی دوست نے طنزیہ کہا۔ "یہ عجیب بونگا شخص ہے دوسرے کے گھر پر قبضہ کر لیا اور گھر والوں کو آنکھیں دکھاتا ہے۔"

ان لوگوں نے علاؤ الدین کو سمجھانے کے بجائے خوب خوب بھڑکایا اور یہی مشورہ دیا کہ وہ شمس تبریز کو اتنا عاجز کر دے کہ شمس تبریزؒ تنگ آ کر کہیں اور چلے جائیں۔

لیکن علاؤ الدین شمس تبریزؒ سے ناراض ہونے کے باوجود باپ کے خیال سے ان کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ اب تو لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جہاں کہیں علاؤ الدین نظر آتے لوگ انہیں گھیر کر مختلف تکلیف دہ سوالات کرنا شروع کر دیتے اور علاؤ الدین ان کے جوابات دینے سے کتراتے۔

مہینوں ایسا ہوتا رہا اور آخر کار علاؤ الدین ولد نے باہر نکلنا چھوڑ دیا اور ان سے جو لوگ بے تکلف تھے وہ ان کے باہر نکلنے کی تاک میں رہتے اور جیسے ہی ملاقات ہوتی وہ ان سے شکایتاً کہتے۔ "جناب یہ عجیب معاملہ ہے کہ وہ جو شخص تمہارے گھر اور تمہارے باپ پر قبضہ کر کے تمہارے ہی گھر میں بیٹھ گیا ہے اور وہ تمہیں بولنے بھی نہیں دیتا۔ کبھی تم نے اس کے انجام پر بھی غور کیا۔"

علاؤ الدین ولد بڑی شرمندگی محسوس کرتے تھے وہ لوگوں کے اس قسم کے طنزیہ فقروں کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے تھے۔ انہی لوگوں میں سے کسی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانے نے آ کر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے اور مولانا کے فرزند کو گھر میں نہیں آنے دیتا۔"

شمس تبریزؒ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے خلاف قونیہ والوں میں اشتعال پھیلتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں شمس تبریزؒ نے مولانا سے تو کوئی بات نہیں کی کیونکہ انہیں راضی کر کے سلطان ولد دمشق سے قونیہ واپس لائے تھے۔ اس لیے شمس تبریزؒ نے سلطان ولد سے کہا۔

"تمہارے یقین دلانے سے اور تمہارے اصرار پر میں قونیہ دوبارہ آ گیا تھا لیکن آنے کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کے لوگ میری آمد سے خوش نہیں ہیں۔ قونیہ والوں کے علاوہ اے سلطان ولد تمہارے چھوٹے بھائی علاؤ الدین ولد بھی مجھ سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں اور وہ جب بھی یہاں آتے ہیں میری رہائش کے سامنے سے گزر کر اندر جاتے ہیں تمہارے والد نے بھی انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں خود بھی علاؤ الدین کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ادھر سے گزرنے سے منع کیا مگر علاؤ الدین کسی کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بتاؤ کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سلطان ولد نے انہیں سمجھایا۔ "حضرت! اس گھر میں آپ کے رہنے پر مجھے اور والد محترم کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کسی اور کی پروا نہ کریں۔ قونیہ والوں کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

شمس تبریزؒ نے مایوسی سے کہا۔ "سلطان ولد یہ درست ہے کہ قونیہ والوں کو تمہارے داخلی معاملات میں بولنے کا حق حاصل نہیں مگر تمہارے بھائی علاؤ الدین ولد کو یہ حق حاصل ہے اور جب وہ اپنے اس حق کے حوالے سے اپنے دوستوں سے باتیں کرتا ہے تو اس کے دوست بھی ہمارے معاملات میں آزادی سے دخل دینے لگتے ہیں۔ یہ روش عام ہوتی چلی جاتی ہے اور قونیہ والوں کی اکثریت ہمارے خلاف رائے زنی کرتی

ہے۔ ان کی تکلیف دہ باتیں میرے کانوں میں پڑتی ہیں تو میرا دل زخمی ہو جاتا ہے۔ ہم قونیہ والوں کو نازیبا اور ناشائستہ باتیں کرنے سے نہیں روک سکتے۔"

سلطان ولد نے بھی یہ اقرار کیا۔ "واقعی ایسا ممکن نہیں ہے مگر ہم بھی مجبور ہیں اور آپ ہی بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

شمس تبریز نے جواب دیا۔ "ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ہم ہمیشہ کے لیے قونیہ کو چھوڑ دیں اور کسی کو اپنی صورت نہ دکھائیں۔"

سلطان ولد کو شمس تبریز کے اس فیصلے سے دھچکا لگا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شمس تبریز کے اس فیصلے کا ان کے باپ پر کیا اثر ہوگا۔ سلطان ولد دیر تک شمس تبریز کی منت وسماجت کرتے رہے کہ وہ قونیہ سے چلے جانے کا فیصلہ نہ کریں۔

شمس تبریز نے کہا۔ "اے سلطان ولد! تو معاملے کی نزاکت سمجھنے سے قاصر ہے۔ اب اگر میں یہاں سے جاؤں گا تو لوگ مجھے تلاش ہی کرتے رہیں گے اور کبھی مجھے نہیں پائیں گے۔"

جب سلطان ولد نے اس گفتگو سے اپنے باپ کو آگاہ کیا تو مولانا بہت بے چین ہو گئے۔ انہوں نے شمس تبریز سے اپنے اشعار میں التجا کی کہ وہ قونیہ کو نہ چھوڑیں۔

مولانا کا خیال تھا کہ شمس تبریز نے اگر قونیہ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے تو اس پر وہ اتنی جلدی عمل نہیں کریں گے اور قونیہ چھوڑنے سے پہلے مولانا سے باتیں ضرور ہوں گی۔ لیکن ایک صبح مولانا حسبِ معمول شمس تبریز کے کمرے کی طرف گئے تو وہ خالی تھا۔ وہاں نہ تو شمس تبریز تھے اور نہ ان کی بیوی تھی۔

مولانا پر وحشت کا غلبہ طاری ہوا۔ آوازیں دے کر اپنے بیٹے سلطان ولد کو بلا کر پوچھا۔ "یہ کمرا خالی کیوں ہے۔ دونوں کہاں چلے گئے؟"

سلطان ولد بھی خالی کمرے کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ یہ ناممکنات میں سے تھا کہ دونوں ایک ساتھ کہیں جاتے اور سلطان ولد کو اس کی خبر نہ ہوتی۔

دونوں بے اختیار پریشانی کے عالم میں شمس تبریز کو ڈھونڈتے رہے مگر گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد بھی ان کا پتا نہیں چل سکا۔ وہ ایک ایک سے پوچھ رہے تھے کہ کسی نے شمس تبریز کو کہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے مگر ہر کسی سے جواب نفی میں ملتا رہا کہ شمس تبریز کو کسی نے رات سے نہیں دیکھا۔

مولانا کی بے قراری ناقابلِ بیان تھی۔

کئی لوگ قونیہ کی سرائے میں بھیجے گئے۔ کچھ نے کہیں اور جا کر معلومات کیں مگر ہر جگہ سے نفی میں جواب ملتا رہا۔ ہر کوئی لاعلم تھا کہ شمس تبریز کی کسی نے کہیں جھلک بھی نہیں دیکھی۔ شمس تبریز کا سیاہ نمدے کا لباس ایسا تھا جو ہزاروں میں ان کی شناخت کر دیتا تھا اور ہر کوئی یہی جواب دے رہا تھا کہ اگر شمس تبریز نے اپنا مخصوص حلیہ بدل کر سفر اختیار کیا ہے تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کدھر گم ہو گئے مگر ان کا مخصوص لباس اور حلیہ تو ایسا تھا کہ انہیں دوری سے پہچانا جا سکتا تھا۔ کسی نے بھی شمس تبریز کا پتا نہیں بتایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالمِ اسلام انتشار اور بدامنی کا شکار تھا۔ تاتاریوں نے ہر طرف تباہی مچا رکھی تھی اور مولانا اس تباہی کے ہولناک ماحول سے بھی خوفزدہ تھے اور جانتے تھے کہ اگر شمس تبریز تاتاریوں کے ہتھے چڑھ گئے تو ان کا کسی کو نام ونشان تک نہیں ملے گا۔

اور شبانہ روز کی جدوجہد کے بعد بھی شمس تبریز کا پتا نہیں چلا لیکن قونیہ والوں کو شمس تبریز کی گمشدگی سے خوشی ضرور ہوئی۔

علاؤ الدین ولد بھی بہت مطمئن تھے کہ اب انہیں بہت بڑی الجھن اور پریشانی سے نجات مل گئی تھی۔

شمس تبریز کی تلاش جاری تھی۔ اسی دوران قونیہ میں یہ افواہ بھی شہرت پا رہی تھی کہ شمس تبریز کو قتل کر دیا گیا ہے اور یہ قتل مولانا کے منجھلے صاحبزادے علاؤ الدین ولد کی ایما اور کوشش سے ہوا۔

لیکن شمس تبریز کی لاش کہیں سے برآمد نہیں ہوئی جو اس افواہ پر یقین کر لینے کا سبب بنتی لیکن مولانا نے ایسے تمام لوگوں سے تعلقات منقطع کر لیے اور انہیں اپنی صحبت میں آنے سے روک دیا جو شمس تبریز کی مخالفت کیا کرتے تھے اور ان نفرت کرنے والوں کی فہرست میں ان کے منجھلے صاحبزادے علاؤ الدین ولد کا نام سرِفہرست تھا۔

شمس تبریز کی جستجو جاری رہی کیونکہ مولانا ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ اس عالمِ بے قراری میں مولانا نے جو غزلیں کہیں ان میں بلا کا سوز وگداز پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا نے سماع میں بہت زیادہ دلچسپی لی اور اس کے بغیر ان کو سکون نہیں ملتا تھا۔ مایوسی اور ناکامی نے انہیں دمشق کی طرف متوجہ کر دیا کیونکہ مولانا کو اس سے پہلے شمس تبریز کی دمشق میں موجودگی کا پتا چل گیا تھا اور وہیں سے ان کے بیٹے سلطان ولد قونیہ واپس لائے تھے۔ اس بار مولانا نے اپنے بیٹے کو زحمت دینے کے بجائے خود دمشق جانے کا منصوبہ بنایا۔

دمشق مولانا کی آخری اُمید گاہ تھی۔

مولانا نے شام کا سفر اختیار کیا۔ راستے میں کسی نے مولانا کو بتایا کہ اس نے شام میں ایک جگہ شمس تبریز کو دیکھا ہے۔ مولانا اس خبر سے اتنے خوش ہوئے کہ اپنا لباس تک اتار کے اس

کی نذر کر دیا کہ دیر تک اس کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ اس سفر میں ان کے کئی دوستوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دمشق پہنچنے کے بعد ان کے دوستوں نے شمس تبریز کی تلاش تیز کر دی۔ یہ لوگ دمشق کے بازاروں میں بساطیوں کی دکانوں پر شمس تبریز کے بارے میں پوچھتے پھرتے رہے۔ سرائے میں بھی انہیں تلاش کیا گیا مگر کہیں سے بھی شمس تبریز کا سراغ نہ ملا۔

دمشق میں مولانا کی شاعری اور شخصیت کا چرچا عام تھا اور لوگ ان کی تشریف آوری سے بہت خوش ہوئے۔ ان کے عقیدت مندوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ جب ان عقیدت مندوں کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا شمس تبریز کی تلاش میں نکلے ہیں اور ان کے فراق میں مولانا کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے تو انہیں ان باتوں سے تکلیف پہنچی اور بڑی مایوسی ہوئی کہ ایک عالم بے بدل، بے مثل شاعر شمس تبریز نامی غیر معروف شخص کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ شمس تبریز آخر ہے کیا چیز۔

دمشق نے بھی مولانا کو مایوس کیا۔ کچھ لوگوں نے مولانا سے شمس تبریز کے حوالے سے باتیں کیں اور شمس تبریز کے بارے میں جاننا چاہا تو مولانا نے جواب دیا۔ ”دوستو! میں اور شمس دو نہیں ہیں۔ وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں۔ ذرے کی ہستی آفتاب ہی سے ہے اور قطرے کی تری دریا ہی سے ہے۔ بس ان دونوں میں فرق کیا ہوا۔“

شام سے مایوس ہونے کے بعد مولانا نے قونیہ کی واپسی اختیار فرمائی۔

مولانا واپس آنے کے بعد کئی برس قونیہ میں رہے مگر عشق نے پھر جوش کیا اور دوبارہ دمشق روانہ ہوگئے۔ غالباً وہ دوبارہ اس لیے دمشق گئے تھے کہ انہیں پہلے بھی دمشق ہی سے شمس تبریز کا پتا چلا تھا اور پچھلے سفر میں بھی کسی نے راستے میں ان کو یہ خبر دی تھی کہ اس نے شمس تبریز کو وہاں دیکھا ہے اور مولانا نے اس خوشخبری کے عوض اپنا لباس اس کی نذر کر دیا تھا۔

یہ سفر بھی بے کار رہا اور شمس تبریز انہیں نہ ملے۔ اس بار مایوسی کے عالم میں انہیں یہ کہتے سنا گیا کہ میں خود عین شمس ہوں۔ شمس کی جستجو کیا تھی، میں درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا اور شمس میں جو کچھ تھا وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

یہ فقرے بتاتے ہیں کہ مولانا شمس تبریز کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور اس کے بعد واقعی انہوں نے شمس تبریز کو نہیں تلاش کیا۔ اب پُرسکون حالت میں کچھ وقت رہنے کے بعد مولانا نے صلاح الدین زرکوب کو اپنا ہم راز اور خلیفہ بنالیا۔ یہ وہی صلاح الدین زرکوب ہیں جن کے حجرے میں مولانا اور شمس تبریز چھ ماہ تخلیے میں رہے تھے اور ان کے حجرے میں صلاح الدین زرکوب کے علاوہ کوئی اور نہیں جا سکتا تھا۔

صلاح الدین زرکوب قونیہ کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ غریب والدین کے بیٹے تھے۔ ان کے والد ماہی گیری کرتے تھے لیکن شیخ صلاح الدین نے زرکوبی کا پیشہ اختیار کیا اور تصوف میں داخل ہونے کے بعد محقق ترمذی کے مرید ہوگئے اور یہیں پر ان کی ملاقات مولانا رومی سے ہوئی۔ محقق ترمذی کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی اور مولانا کا قرب حاصل کیا۔

لوگوں میں ایک بار پھر مولانا کی اس تعلق داری سے اشتعال پیدا ہوگیا۔ صلاح الدین زرکوب سے قونیہ کے لوگ بہت اچھی طرح واقف تھے اور قونیہ والے ان کے خاندان سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ یہ ایک عام آدمی تھے عمر بھر ورق کوٹتے رہے اب وہ مولانا کے رفیق بن گئے تھے۔ خود مولانا انتہائی بلند مرتبہ اور پایہ رکھنے کے باوجود اس معمولی شخص کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کر رہے تھے۔

صلاح الدین زرکوب کو جب لوگوں کی اس رائے کا علم ہوا تو انہوں نے جواباً کہا۔ ”لوگوں کو اس کا ملال ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا ہے مگر وہ اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے آپ پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔“

صلاح الدین زرکوب دس سال مولانا کی خدمت اور صحبت میں رہے پھر اچانک بیمار ہوئے اور یکم محرم 657 ہجری میں انتقال کر گئے۔

اس بار مولانا نے حسام الدین ابن اخی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ حسام الدین کے نام کے ساتھ چلپی لگایا جاتا تھا۔ ترکی زبان میں چلپی سیدی کا ہم معنی ہے۔

چلپی حسام الدین روم کے ذی اثر خاندان اخی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بہت سے ملازم اور غلام تھے۔ چلپی حسام الدین نے اپنے تمام ملازم اور غلاموں کو حکم دے دیا تھا کہ وہ اپنے طور پر کام کرتے رہیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اپنا کل اثاثہ مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا۔ آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا۔

مولانا ان سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مولانا چلپی حسام الدین کے مرید تھے۔

مولانا کو ان کے بغیر انبساط و شگفتگی نہیں ہوتی تھی۔ جس مجلس میں چلپی حسام الدین نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش اور گرمی پیدا نہ ہوتی اور وہ اسرار و معارفت کی باتیں نہ کرتے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ مجلس میں اس بات کا خاص اہتمام کرتے کہ

مولانا کے ساتھ چلپی حسام الدین بھی موجود ہوں تا کہ دریائے فیض جاری ہو۔

چلپی حسام الدین کو مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ وہ مولانا کے وضو خانے میں بھی وضو نہ کرتے۔ سخت سردی کے موسم میں بھی جبکہ برف پڑ رہی ہوتی۔ جب بھی ضرورت ہوتی حسام الدین اپنے گھر جا کر ہی وضو کرتے اور واپس آتے۔

مولانا ابوالحسن ندوی کے بقول۔ ''مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی۔ شمس تبریز کے بعد صلاح الدین زرکوب اور ان کے بعد چلپی حسام الدین آپ کے ہم راز اور دم ساز رہے۔ بلکہ سلسلہ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید بہاؤالدین محقق ترمذی بھی اسی زمرے میں داخل تھے۔ وہ اگرچہ دوسری حیثیت سے تھے۔ محقق ترمذی کے انتقال اور شمس تبریز کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں کمالات مخفی تھے مگر جن کے اظہار کے لیے انہیں کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی۔

مولانا نے مثنوی کا آغاز چلپی حسام الدین کی فرمائش وطلب سے کیا تھا۔ اس مثنوی سے پہلے دوسرے صوفی شاعروں کی تصنیفات لوگوں کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

چلپی حسام الدین نے ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر عرض کیا کہ کوئی کتاب شیخ عطار، صنعائی وغیرہ کی طرز پر لکھی جائے۔

مولانا نے اپنے عمامے میں سے ایک کاغذ نکالا اس میں اٹھارہ شعر لکھے ہوئے تھے۔ انہی اشعار کو مثنوی کا آغاز اور مطلع بننا نصیب ہوا۔ اس کے بعد مولانا برجستہ اشعار ادا کرتے اور مولانا چلپی حسام الدین لکھتے جاتے۔ لکھ لینے کے بعد حسام الدین اس کو بلند خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے۔ کئی مرتبہ اسی مشغلے میں پوری پوری راتیں گزر جاتیں اور مثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی۔

مثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ چلپی حسام الدین کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا حسام الدین کی طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ وہ مضمحل ہو گئے اور ان کے مضمحل ہونے سے مولانا کی طبیعت میں بھی حزن وملال شامل ہو گیا اور دو سال تک مثنوی کا سلسلہ بند رہا پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضے سے یہ سلسلہ شروع ہوا جو مولانا کی وفات تک جاری رہا۔ اس کی کل مدت پندرہ سال ہے۔

مولانا نے اپنے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لیے منتخب کیا ان کے انتخاب کی وجہ کشف وکرامت نہیں تھی۔ آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبق جنسیت ہوا کرتی ہے۔

مولانا کا سلطان ولد کے ایک سوال پر یہ جواب تھا۔ ''میں مناسبت جنسی کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے اس کا نتیجہ پشیمانہ نہیں ہوتا۔ حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی۔''

مولانا کی وفات سے قبل قونیہ میں چالیس روز تک زلزلہ آتا رہا اور مولانا ان دنوں علیل تھے۔ سات روز برابر زلزلے کے آنے سے لوگ عاجز آ گئے تھے۔ لوگوں نے مولانا سے اس سلسلے میں مدد چاہی تو مولانا نے جواب دیا۔ ''زمین بھوکی ہو گئی ہے لقمہ چرب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہو جائے گی اور تم لوگوں کو اس زحمت سے نجات مل جائے گی۔''

علالت کے دوران میں ایک دوسرے صوفی شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عیادت کو آئے۔ مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور دعا کی۔ ''خدا آپ کو شفائے عاجل عطا فرمائے، اُمید ہے کہ صحت کلی حاصل ہو جائے گی۔''

مولانا نے جواب میں فرمایا۔ ''اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق ومعشوق میں بال کا پیراہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں شامل ہو جائے۔''

پانچ جمادی الثانی 672 ہجری بہ وقت غروب آفتاب مولانا نے انتقال فرمایا۔ انتقال کے وقت مولانا کی عمر ہجری کے مطابق 68 برس تین ماہ کی تھی۔ ان کا تابوت صبح سویرے مدرسے سے روانہ ہوا اور شام کے قریب قبرستان پہنچا۔ آخر بہ وقت شب یہ آفتاب فقر وتصوف دیدہ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

مضمون کے ماخذ

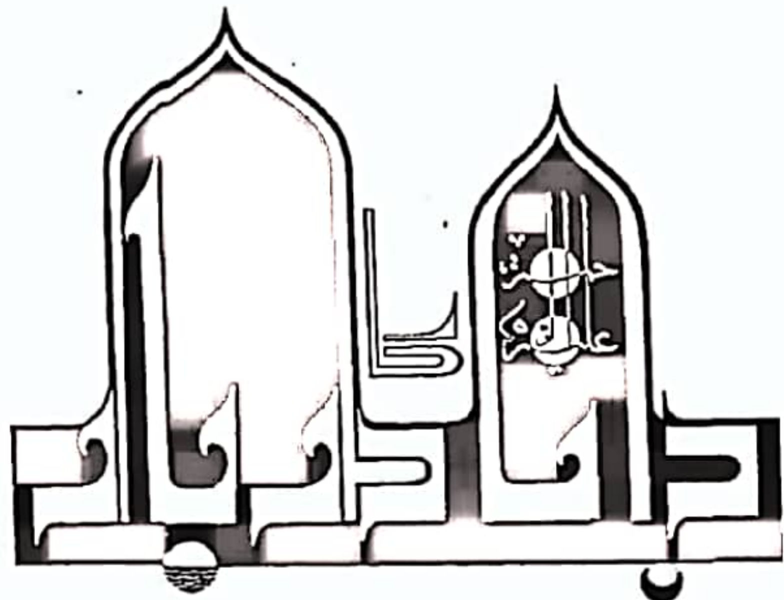
نغمات ولانس — عبدالرحمٰن جامی، مولانا مدنی۔ مولانا

تاریخ اصفیا — شبلی نعمانی، شعبہ تاریخ تصنیف۔ غلام علی اینڈ سنز

تاریخ دعوت وعزیمت — مولانا ابوالحسن علی ندوی

پاسبانِ عزّتِ اُمّ الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاکِ پنجاب از دمِ اُو زندہ گشت
صبح ما از مہرِ اُو تابندہ گشت

علاّمہ اقبال



ضیا تسنیم بلگرامی

شام کا وہ کوہستانی سلسلہ جو ایشیائے کوچک اور شام کے درمیان حدِ فاصل بن گیا ہے اور پھر جنوب میں لبنان سے گزرتا ہوا جزیرہ نمائے سینا کی چوٹیوں میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے لبنانی حصّے میں کوہِ لکام بڑی مشہور جگہ ہے یہیں گیارھویں صدی عیسوی میں محمد ابو الفضل محمد بن حسین ختلی نامی بزرگ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ عزلت نشینی میں گزار دیا۔ ہم عصر صوفیوں کی ظاہرداری اور مروّجہ رسوم سے بیزار اپنے چند ہونہار مریدوں پر اپنی توجہ صرف کرتے رہتے۔ انھی مریدوں میں غزنی کے قریے ہجویر کے ایک نوجوان سیّد علی بن عثمان بھی تھے۔ طبیعت میں جستجو اور دل میں اجتہاد کا یہ عالم تھا کہ فکر کہیں ٹھیرتی ہی نہ تھی۔ مُرشد کے جسم پر جو کپڑے تھے، ان میں اتنے پیوند لگ چکے تھے کہ اصل کپڑے کا پتہ تک نہ چلتا تھا۔ جب کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لیے مُرشد نے دونوں ہاتھ نوجوان سیّد علی کی طرف بڑھائے اور مُرید نے پانی کی دھار ہاتھوں پر ماری تو یکایک نوجوان مرید کے دل میں خیال آیا کہ ”جب اس کائنات میں ہر جگہ تقدیر ہی کار فرما ہے تو کیا ضروری ہے کہ آزاد لوگ خود کو مرشدوں کا غلام بنا لیں۔“

خرقہ پوش مُرشد نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لیے اور متردد مُرید کو مخاطب کیا۔ ”علی! تم کیا سوچ رہے ہو؟ بے شک پوری کائنات میں تقدیرِ الٰہی کار فرما ہے لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ خدا کا ہر حکم کسی سبب کا پابند ہے، جب وہ کسی پر نوازش کرتا ہے تو اس کے ویسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ تمہیں خدا نے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تمہیں خدا کی منشا اور حکم سے وہ دوں گا جس کے تم طلبگار ہو۔“

نوجوان مُرید شرمندہ ہو گیا اور دل کی اُلجھن دور ہو گئی۔

تحصیلِ علوم اور ریاضتوں کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ مُرشد ابو الفضلؒ ختلی کوہِ لکام سے نکل کر دمشق پہنچے۔ نوجوان مُرید ساتھ تھا بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ کچے راستے کیچڑ سے بھر گئے۔ نوجوان مُرید نے کیچڑ اور نجاست سے بچنے کے لیے زیریں لباس کو ذرا اوپر کر لیا۔ لیکن مرشد نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کئی بار نوجوان مُرید کے جی میں آئی کہ وہ مرشد سے کیچڑ اور نجاست سے بچنے کی استدعا کرے۔ اُس نے مرشد کے جوتوں اور لباسِ زیریں کی حالت کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ بالکل خشک تھے، پانی یا کیچڑ کی ایک چھینٹ تک موجود نہ تھی۔

نوجوان مُرید، اپنے مُرشد کی اس کرامت سے حیران رہ گیا، پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا ہے، آپ کے جوتے اور کپڑے نجاست اور کیچڑ سے کس طرح محفوظ ہیں؟“

مُرشد نے جواب دیا۔ ”جب سے میں نے توکّل اختیار کیا اور توہمات سے پیچھا چھڑایا، دل کو حرص و طمع کی وحشت سے محفوظ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت سے میرے قدموں کو ان آلائشوں سے پاک اور بے نیاز کر دیا ہے۔“

یہاں سے سیراب ہو چکنے کے بعد سیّد علی ہجویریؒ نے مزید تحصیلِ علوم اور مشائخِ کرام کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کی غرض سے مختلف شہروں اور ملکوں کی سیاحت کی۔ طبیعت میں مروّت اور سخاوت اتنی تھی کہ سائل کو نفی میں جواب دینا جانتے ہی نہ تھے، اگر پاس کچھ نہ ہوتا تو کسی سے قرض لے کر سوال پورا کر دیتے۔ اس طرح اتنے مقروض ہو گئے کہ دل پریشان رہنے لگا۔ کسی ہمدرد بزرگ نے انہیں لکھا۔ ”اے فرزند! اپنے دل کو خدا کی طرف سے ہٹا کر ان کی طرف مت مشغول کرو جو ہوائے نفس میں سب رنگ

اللہ خود ہی اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ ہاں اگر ایسا کوئی شخص ملے جس کا دل تم سے برتر ہو تو تم اس کی تشفیِ خاطر کردو۔ ورنہ سب کے لیے اپنے دل کو مت حیران اور پریشان کرو۔"

اس نصیحت کے بعد دل کو قرار آگیا۔ آپ دُنیادار اور حریص سالکوں سے بچنے لگے لیکن اُس وقت تک لوگ آپ کو گنج بخش کہنے لگے تھے۔

سید علی ہجویریؒ کو اندر سے یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ وہ جملہ ائمہ میں کس کی اقتدا کریں۔ یہ فکر لاحق تھی کہ آپ ملکِ شام پہنچے۔ وہاں حضرت بلالؓ مؤذن رسولِ مقبولؐ کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھ کر مزار کے سرھانے ہی سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ وہ مکہ معظمہ میں حاضر ہیں، سامنے باب بنی شیبہ ہے، ان کی نظریں بابِ شیبہ پر لگی تھیں کہ اس میں سے رسولِ مُقبول صلی اللہ علیہ وسلم اندر داخل ہوئے۔ آپؐ گود میں ایک معمر شخص کو دالیے ہوئے تھے۔ سید علی ہجویریؒ ادب سے آگے بڑھے اور رسول اللہؐ کے پائے اقدس کو بُوسہ دیا۔ دل میں سوچنے لگے، رسول اللہؐ نے یہ کس شخص کو گود میں اُٹھا رکھا ہے؟ حضورؐ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "یہ تیری قوم کا امام ہے یعنی ابو حنیفہؒ۔"

اِس کے بعد آنکھ کھُل گئی اور دل کا تردّد دُور ہو گیا۔ پھر زندگی بھر امامِ اعظم اُبو حنیفہؒ کے معتقد اور پیروکار رہے اور انہیں امامِ اماماں کہتے رہے۔

بہت کچھ جاننے کا نشہ دل و دماغ پر اب بھی طاری تھا۔ دُنیا حقیر اور اہلِ دُنیا کیڑے مکوڑوں کی طرح نظر آتے تھے۔ تصوّف کے لباس میں ملبُوس اور اپنی انا کی بڑائی میں گُم جوان نے سوچا کہ جو وہ جانتا ہے، دوسرے نہیں جانتے پھر کیا ضروری ہے کہ وہ جاہل اور بے علم انسانوں کو منہ لگائے؛ اس احساس اور اس اندازِ فکر نے اُسے بڑائی کا فخر تو دے دیا لیکن اندر کا سکون چھین لیا۔ دل کسی اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ طمانیت قلب جاتی رہی۔ اِس اُلجھن کے علاج اور طمانیتِ قلب کی بازیابی کے لیے اُسے کسی روحانی مُعالج کی تلاش ہوئی۔ اس تلاش میں شہروں اور ملکوں کے دورے کو نکل کھڑے ہوئے۔

شام قریب تھی، سامنے خراسان کی پتھریلی عمارتیں نظر آرہی تھیں موٹے اور کھُردرے ٹاٹ کا لباس بدن پر تھا۔ ایک عصا اور ایک لوٹا ہاتھ میں تھا۔ راہ گیر اس عجیب و غریب اور اپنے افکار میں گُم جوان کو دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ جب آبادی بالکل قریب آگئی تو جوان نے ایک خچر سوار کو ہاتھ سے روک کر دریافت کیا "مہربان دوست! خدا تجھ پر رحمتیں نازل فرمائے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ یہاں سے سرائے کتنی دُور ہے؟"

خچر سوار نے جوان کو سر سے پیر تک دیکھا اور پیچھے مڑ کر دُور ایک مٹیالی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "اور تجھ پر بھی خدا اپنی رحمتیں نازل کرے، وہ رہی سرائے!" پھر پوچھا "کیا تم صوفی ہو؟"

جوان نے جواب دیا "صوفی تو بڑی چیز ہوتا ہے۔ ابھی تو میں صوفیت کی راہ کا ایک مسافر ہوں!"

خچر سوار ہنسنے لگا "میں سرائے ہی سے آرہا ہوں، جب تم سرائے پہنچو گے تو وہاں تمھیں اور بہت سے صُوفی ملیں گے، لیکن وہ شاید تم سے بڑے صوفی ہیں۔ اچھے اچھے لباسوں میں ملبُوس اور اچھی اچھی غذائیں اور پھل کھانے والے۔"

خچر سوار یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور یہ جوان کچھ دیر بعد جب سرائے میں داخل ہوا تو اس کی پہلی نظر بالاخانے پر پڑی۔ وہاں لمبی لمبی داڑھیوں والے کئی چہرے اس جوان کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ایک نے گردن ذرا آگے بڑھا کر پوچھا "تم کون ہو؟"

جوان نے جواب دیا "ایک مسافر شب بسری کے لیے اس سرائے میں ٹھیرنا چاہتا ہوں۔"

اوپر سے قہقہوں کی آواز سُنائی دی۔ کسی نے کہا "معلوم تو یہ بھی صوفی ہی ہوتا ہے۔ لیکن ہم میں سے ہرگز نہیں ہے!"

جوان نے خوش ہو کر جواب دیا "تم نے بالکل صحیح کہا بے شک میں تم میں سے نہیں ہوں۔"

چند صوفی نیچے آگئے اور جوان کو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ٹھیرا دیا۔

رات ہو چکی تھی۔ اوپری منزل سے لذیذ کھانوں کی خوشبوئیں ناک سے داخل ہو کر معدے میں حرص و طلب سے قراقر پیدا کر رہی تھیں۔ اتنے میں ایک صوفی نے سوکھی روٹیوں کے چند ٹکڑے لا کر سامنے رکھ دیے اور پانی کا برتن رکھتا ہوا بولا "لو، اسے کھالو اور اللہ کا شکر ادا کر کے آرام کرو۔"

اوپری منزل سے ہنسی مذاق کی آوازیں آرہی تھیں۔ صوفی مرغن غذائیں مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور یہ مسافر جوان سوکھی روٹیوں کو پانی میں بھگو بھگو کر حلق سے نیچے اتار رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تمام صُوفی نیچے آگئے، ان کے پاس خربوزوں کے ڈھیر تھے، وہ ہنس ہنس کر جوان کا مذاق اڑانے لگے،

خربوزے کھاتے جاتے اور اس کے چھلکے جوان کی طرف اچھال دیتے۔ کئی
چھلکے سر پہ گرے اور کرتے اور رخساروں کو چپچپا کر دیا۔ جوان حرفِ شکایت سے
بے نیاز ضبط و تحمل سے کام لیتا رہا۔ اسے تسلیم و رضا کی منزل پر پہنچنا تھا
اور وہاں تک پہنچنے کے لیے راہ کی ان ملامتوں اور صعوبتوں کو بڑے صبر و
تحمل سے برداشت کرنا بہت ضروری تھا۔ اس امتحان کا یہی نصاب تھا اور
قلب و دماغ میں سمائی ہوئی انا اور بہت کچھ جاننے کے جذبۂ فخر جیسے مہلک
نفسانی مرض کا یہی کامیاب علاج تھا۔ اس کو یہ ملامت کرنے والے طنز و
استہزا کے پیکر صوفی اس معالج کی شکل میں نظر آنے لگے جس کی تلاش
میں اس نوجوان نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔ اس کے دل میں کوئی بیٹھا کہہ
رہا تھا۔

"اے علی ہجویر کے رہنے والے! تیری وہ مشکل جس کے لیے تو نے
سخت مجاہدے کیے اور دور دراز شہروں کے سفر کیے، اللہ تعالیٰ کی عنایت
سے وہ دور ہو چکی ہے۔ اللہ کے بڑے بڑے اور نیک بندوں کے لیے
ان نادان اور جاہلوں کی صحبت بہت ضروری ہے تاکہ ہوائے نفس کا
مرض سرایت نہ کر سکے۔"

سیر و سیاحت کے بعد آپ پھر اپنے مرشد کے پاس واپس گئے
وہاں سے انھیں لاہور جانے کا حکم ملا۔ آپ کو معلوم تھا کہ لاہور میں ان
کے پیر بھائی شیخ حسین زنجانی پہلے ہی سے موجود ہیں۔ آپ نے اپنے
مرشد سے کہا، "لاہور میں تو شیخ حسین موجود ہی ہیں، کہیں اور جانے کا
حکم صادر فرمائیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں؟"

مرشد نے جواب دیا، "تمھیں لاہور ہی جانا ہے، حکم کی تعمیل میں
چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے!"

آپ فوراً لاہور کے لیے روانہ ہو گئے اور یہ سفر اتنی عجلت میں کیا
کہ اپنی کتابیں تک ساتھ نہ لے جا سکے۔ ان کے ساتھ لاہور آنے والوں
میں ایک صاحب ابوسعید ہجویری بھی تھے۔ جب حضرت سید علی ہجویری
لاہور میں داخل ہو رہے تھے، سامنے سے ایک جنازہ آتے دیکھا۔ آپ نے
کسی سے دریافت کیا، "یہ کس کی میت ہے؟"

کسی نے جواب دیا، "شیخ حسین زنجانی کی۔"

آپ دنگ رہ گئے اور مرشد کے حکم کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

ایک بڑھیا آپ کے سامنے سے گزری۔ دودھ کا برتن اس کے
سر پہ تھا۔ آپ نے اسے اشارے سے روکا اور کہا، "ہمیں دودھ درکار
ہے۔ تم ہم سے اس کی قیمت لے کر دے دو۔"

بڑھیا نے دہائی کھینچی، کہنے لگی، "میں جس شخص کے پاس یہ
دودھ لیے جا رہی ہوں، اگر اسے اس بات کا علم ہو گیا کہ تم نے مجھ سے
لے لیا ہے تو وہ اپنے سفلی علم کے زور سے ہمارے دودھ دینے والے
جانوروں کو بے کار کر دے گا۔ جس سے وہ دودھ کی جگہ خون دینے لگیں گے۔"

آپ نے مسکرا کر فرمایا، "تم اس کی فکر نہ کرو، دودھ ہمیں دے دو،
خدا بڑی برکت دے گا۔"

بڑھیا نے متاثر ہو کر دودھ دے دیا۔ آپ نے اس میں سے کچھ
پیا، بقیہ دریا میں پھنکوا دیا۔ بڑھیا نے رات کو جب جانوروں کو دوہا تو
انھوں نے اتنا زیادہ دودھ دیا کہ گھر کے سارے ہی برتن بھر گئے۔ جب
سفلی عمل کے ماہر کو اس بات کی خبر ہوئی تو کئی سخت ترین آزمائشوں
اور مقابلوں کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا اور حضرت سید علیؒ
نے اسے شیخ ہندی کا نام دیا۔

آپ نے لاہور میں پوری توجہ اور تن دہی سے تبلیغ اور اشاعتِ
اسلام کے لیے کام کیا اور بہت سوں کو مسلمان کر لیا۔

یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جب مسجد بن کر تیار ہو گئی
تو چند ثقہ حضرات نے قبلے کی سمت پر اعتراض کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے
جنوب میں اس کی سمت میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ بعضوں نے کہا اس
کی محراب میں دوسری مسجدوں کے مقابلے میں جنوب میں کچھ کجی آ گئی
ہے۔ آپ نے چند دنوں تک خاموشی اختیار کی۔ پھر ایک دن آپ نے ان
سب کو جمع کیا اور خود نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ نے
معترضین سے پوچھا، "ہاں اب بتاؤ کہ کعبہ کدھر ہے؟"

معترضین کی نظریں محراب کی طرف اٹھ گئیں، ان کی نظروں
سے حجابات دور ہو گئے، محراب کے اس پار، بالکل سامنے بیت اللہ صاف
نظر آ رہا تھا۔ معترضین نے شرمندہ ہو کر گردنیں جھکا لیں۔

آپ کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف سبھی نے کیا ہے۔ یہاں
تک کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جب برصغیر میں تشریف لائے
تو پہلی حاضری حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزارِ اقدس پر دی اور یہیں
چلّہ کشی کی۔ اسی موقع پر حضرت خواجہ صاحبؒ نے حضرت سید
علی ہجویری کی شان میں یہ کہا تھا:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا   ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

"خزانے بخشنے والے، دُنیا کو فیض پہنچانے والے خدا کے نور کے مظہر ہیں۔ وہ ناقصوں کے لیے پیر کامل اور کاملوں کے رہنما ہیں"

گنج بخش آپ اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"اے علی، خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال تو اپنے دل میں نہ لا کہ لوگ تجھے گنج بخش کہتے ہیں یہ محض دعوا اور غرور ہوگا۔ گنج بخش تو وہ ذاتِ پاک ہے اس کے ساتھ شرک نہ کرنا ورنہ تیری زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

آپ نے ہزاروں کو مسلمان کیا۔ آپ نے تلقین اور تبلیغ کا کام قلم سے بھی لیا اور دس کتابیں تصنیف کیں لیکن ان میں "کشف المحجوب" کے سوا کوئی کتاب نہیں ملتی۔ "کشف المحجوب" کا سببِ تصنیف یہ ہے کہ ابو سعید ہجویری نے ایک موقع پر حضرت داتا گنج بخشؒ سے دریافت کیا "مجھے طریقِ تصوف کی حقیقت اور مقاماتِ صوفیہ کی کیفیت ان کے عقائد و مقالات کی تشریح وغیرہ سے باخبر فرمائیں۔"

اُن کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ "کشف المحجوب" ہے۔

آپ نے اہلِ تصوف کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) صوفی (۲) متصوف (۳) مستصوف۔

۱۔۔۔ **صوفی**: صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو اور مادیت سے گزر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو۔

۲۔۔۔ **مُتصوف** وہ ہے جو مجاہدات سے یہ راہ طے کر رہا ہو اور منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو۔

۳۔۔۔ **مُستصوف** وہ ہے جو محض جاہ و مال کے لیے دُنیا طلبی کی خاطر خود کو صوفیہ اور متصوفیہ کے مشابہ بنائے اور حقیقتاً ان دونوں میں سے نہ ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف صوفی کی نظر میں تو مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے لیکن دوسروں کے حق میں بھیڑیے کی مانند جس کی غذا ہی گوشت اور خون ہے۔

آپ نے فرمایا "علم بغیر عمل کے مکمل نہیں ہو سکتا۔"

جو لوگ دن رات عبادتوں میں لگے رہتے ہیں اور برائیوں سے پاک نہیں ہوتے اُن کی بابت فرمایا "عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ اس سے ہمارے اندر نیکی پیدا ہو۔ جس عبادت سے نیکی نہ پیدا ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

مزید فرمایا "تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ اول غافل علما سے۔ دوم خوشامدی درویش سے۔ سوم جاہل صوفی سے۔

آپ سوفسطائیوں (ہر بات میں شک کرنے والوں) سے بہت نفرت کرتے تھے۔ سوفسطائی کہتے ہیں کہ انسان کو کسی شے کا صحیح طور پر علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کا بھی صحیح علم میسر نہیں آ سکتا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ سوفسطائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تمھاری یہ بات کہ انسان کو کسی شے کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، صحیح ہے یا غلط؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ صحیح ہے تو بس علم کو تم نے خود ہی ثابت کر دیا ہے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ غلط ہے تو کسی غلط بات کو حق کے خلاف کس طرح پیش کر سکتے ہو۔"

آپ کو حضرت عمرؓ کا یہ قول بہت پسند تھا کہ "بُری صحبت کے مقابلے میں گوشہ نشینی (تنہائی) راحت کا باعث ہے۔"

آپ نے واقعات اور حکایات کی صورت میں انسانی اور دینی رموز اور اشارے بیان فرمائے ہیں۔ جود و سخا کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"ایک شخص حضرت حسنؓ بن علیؓ کے درِ دولت پر آ کر کہنے لگا "اے رسول اللہؐ کے بیٹے! مجھ پر چار سو درہم قرض ہیں۔" حضرت حسنؓ نے اسے چار سو درہم عطا فرمائے اور پھر چشم پُرنم گھر کے اندر چلے گئے۔ کسی نے پوچھا "اے رسول اللہؐ کے بیٹے! آپ اشک بار کیوں ہیں؟" آپ نے جواب دیا "مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس شخص کا حال معلوم کرنے کی غفلت کا مرتکب کیوں ہوا، جس کی وجہ سے اسے سوال کی رسوائی برداشت کرنی پڑی۔"

اسی سلسلے میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "حضرت ابو سہل صدقہ کبھی کسی درویش کے ہاتھ میں نہیں دیتے تھے بلکہ زمین پر رکھ کر ہٹ جاتے تھے تاکہ مستحق حضرات خود اُٹھا لیں۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو حضرت سہلؒ نے فرمایا کہ دینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں براہِ راست چیز دے دی جائے جس سے دینے والے ہاتھ کو برتری اور لینے والے ہاتھ کو رسوائی اور پستی کا سامنا کرنا پڑے۔"

آپ علم کی بابت فرمایا کرتے تھے کہ "طبعِ انسانی کے لیے آگ پر چلنا، راہِ علم پر چلنے سے آسان تر ہے۔"

اس سلسلے میں مزید فرمایا "ایک جاہل کے لیے پُل صراط پر سے ہزار بار گزرنا اس بات سے کہیں آسان ہے کہ علم کا کوئی ایک مسئلہ حل کیا جائے۔"

یہ آپ ہی کا قول ہے:

"دس چیزیں دس چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔ نیکی بدی کو۔ تکبر علم کو۔ توبہ گناہ کو۔ جھوٹ رزق کو، عدل ظلم کو، غم عمر کو۔ صدقہ بلا کو۔ پشیمانی سخاوت کو اور غیبت نیک اعمال کو۔"

شادی کے سلسلے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ دو شادیاں کی تھیں لیکن کچھ کہتے ہیں کہ شادی سرے سے کی ہی نہیں تھی۔

تاریخ ولادت کا بھی نہیں پتہ چلتا۔ بڑے آدمیوں کی بابت عموماً یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اُن کی پیدائش کے وقت لوگ چونکہ ان کے شاندار مستقبل اور شخصی بلندی سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے اُن کی پیدائش پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور اس طرح ولادت کی تاریخ کا صحیح علم نہیں ہو پاتا۔ آپ کی وفات ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء کے لگ بھگ ہوئی۔ ولادت کا شرف ہجویر (غزنی) کو حاصل تھا تو وفات اور جسدِ خاکی کی مستقل اقامت کا شرف لاہور کو حاصل ہوا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" پر دو محققین نے بڑی محنت کی۔ ڈاکٹر نکلسن اور پروفیسر ژوکوسکی۔ اسے ڈاکٹر نکلسن نے انگریزی میں اور پروفیسر ژوکوسکی نے روسی زبان میں ترتیب دیا۔ پروفیسر ژوکوسکی جون ۱۹۱۸ء میں انتقال فرما گئے۔ ان کے بعد حکومتِ روس نے اسے ۱۹۲۶ء میں لینن گراڈ سے شائع کیا اور اس کی اشاعت فارسی اور روسی دونوں ہی زبانوں میں عمل میں لائی گئی۔

حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف "کشف المحجوب" کی عظمت کا اعتراف حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

"جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو کشف المحجوب کے مطالعے کی برکت سے مِل جائے گا۔"

جب آپ لاہور کے بھاٹی دروازے سے باہر غربی جانب کی مسجد کی طرف چلیں گے تو اس مسجد کے قریب ہی آپ کو اس عظیم الشان انسان کے مقبرے کی عمارت ملے گی۔ یہ آخری آرام گاہ آپ کا وہ حجرہ ہے، جہاں آپ تبلیغ و تدریس کے بعد استراحت فرمایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر یہاں چالیس روز متواتر حاضری دی جائے یا چالیس جمعے کی راتوں کو مزار کا طواف کیا جائے تو ہر مشکل آسان اور حاجت پوری ہو جاتی ہے۔

جب آپ مقبرے کے قدیمی صدر دروازے سے اندر داخل ہوں تو آپ کو بائیں طرف مسجد ملے گی۔ پھر آگے چل کر دو مزاروں کے بعد داہنی جانب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا حجرۂ اعتکاف ملے گا۔ اس حجرۂ اعتکاف سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں طرف سنگ مرمر کا وہ چبوترا ملے گا جہاں حضرت داتا گنج بخشؒ استراحت فرما رہے ہیں اور پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔

اس آستانے پر بڑے بڑے سلاطین اور فرماں روا غلاموں کی طرح حاضریاں دیتے رہے ہیں۔ غزنوی سلاطین کے علاوہ قطب الدین ایبک، التمش، غیاث الدین بلبن، جلال الدین اکبر، نور الدین جہانگیر اور دارا شکوہ نے یہاں کی حاضری میں فخر محسوس کیا ہے۔ یہاں تک کہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے حاکم لاہور میر مومن نے وفات کے وقت خواہش کی کہ اسے ٹھیک اس جگہ دفن کیا جائے جہاں دربارِ داتا میں حاضری دینے والے زائرین اپنی جوتیاں اُتارتے ہیں۔ اس طرح میر مومن خاں حضرت داتا کے عقیدت مندوں کی کفش برداری کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کی خواہش پوری کی گئی اور جب آپ وہاں پہنچیں گے تو اس حاکم اعلا لاہور میر مومن خاں کی قبر مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ملے گی۔ اس قبر میں کوئی خاص بات نہ ملے گی۔ یہاں تک کہ اس پر قبر کا تعویذ بھی نہیں ہے۔ ــــ اس کے باوجود اس حاکم کو اس کی خواہش پوری کر کے جو شرف بخشا گیا ہے، یہ شرف اسے اپنی زندگی میں شاہانِ عصر سے بڑے بڑے مناصب اور عہدے حاصل کرنے کے بعد بھی نہ مِل سکا تھا۔

آج حضرت داتا گنج بخشؒ کو رحلت فرمائے ہوئے تو نو سو سال سے زائد کا زمانہ گزر چکا ہے لیکن ہر سال سن ہجری کی ۱۹، ۲۰ صفر کو وہ عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے جس کو دیکھ کر ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے فیوضِ روحانی جاری و ساری ہیں اور شہر لاہور کی بقا، رونق اور آبادی آپؒ کے سایۂ عاطفت میں ہے۔ جب تک داتا گنج بخش موجود ہیں، لاہور اور اس کی رونقیں موجود ہیں۔

***

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

امیر خسرو

تسلیم ورضا کا پیکر

شیخ احمد النامقی

شیخ حسام الدین

شیخ ناگوری

علی بن محمد

فخر دین ودنیا

خندقوں والے

دلی کا قطب

روشن ضمیر

شیخ الہند

خواجہ باقی باللہ

عارف حق

بدر الدین اسحاق

مولانا رومی

داتا کا دربار